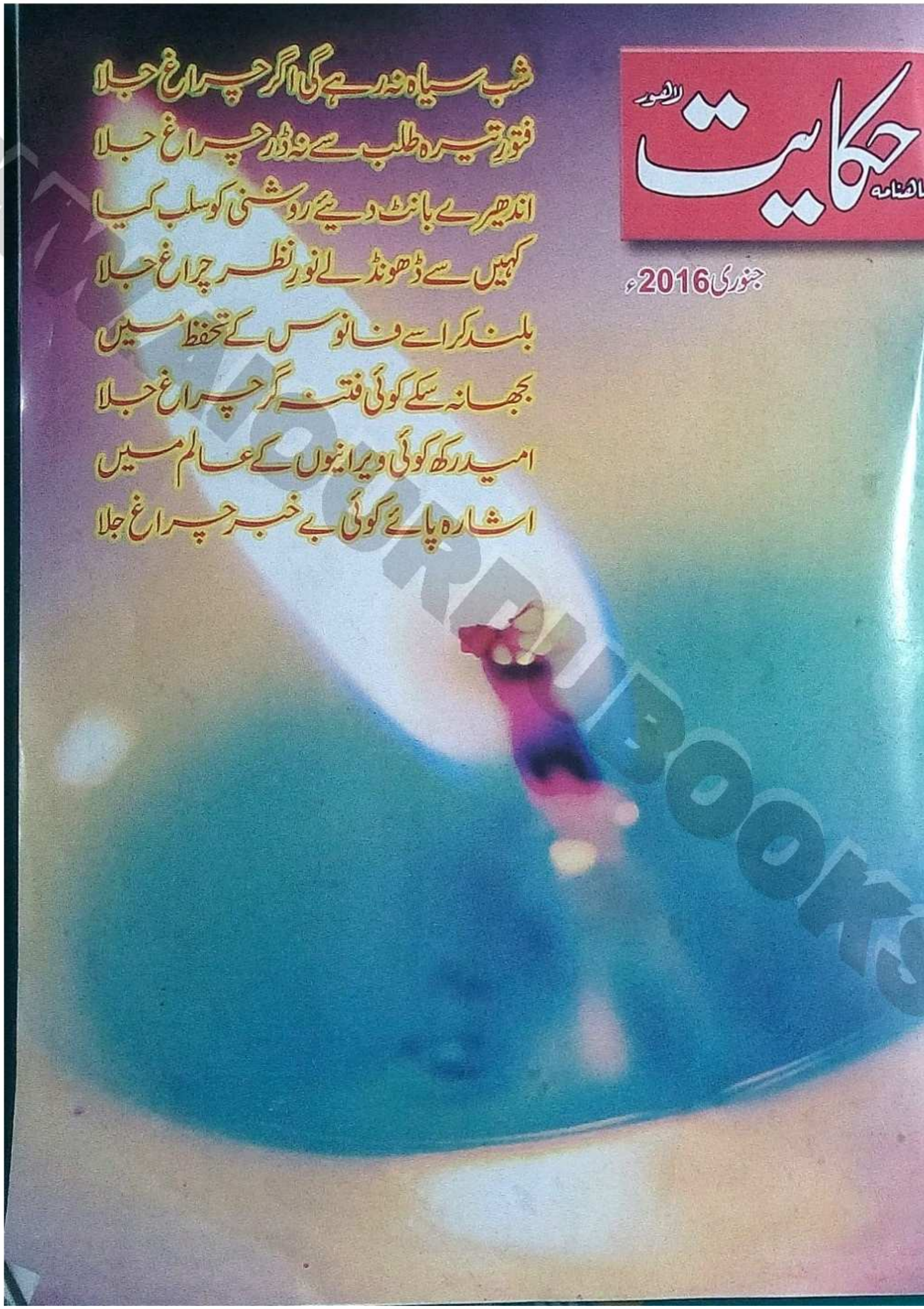
ماہنامہ
حکایت
لاہور
جنوری 2016ء
شب سیاہ نہ رہے گی اگر چراغ جلا
فتورِ تیرہ طلب سے نہ ڈر چراغ جلا
اندھیرے بانٹ دیئے روشنی کو سلب کیا
کہیں سے ڈھونڈ لے نورِ نظر چراغ جلا
بلند کر اسے فانوس کے تحفظ میں
بجھا نہ سکے کوئی فتنہ گر چراغ جلا
امید رکھ کوئی ویرانیوں کے عالم میں
اشارہ پائے کوئی بے خبر چراغ جلا

نورِ مبین

اے اہل ایمان (گفتگو کے وقت اللہ کے رسول اسے) راعنانہ کہا کرو۔ اُنظرنا
کہا کرو اور خوب سُن رکھو اور کافروں کے لئے دُکھ دینے والا عذاب
ہے(۱۰۴) جو لوگ کافر ہیں اہلِ کتاب یا مشرک وہ اس بات کو پسند نہیں
کرتے کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے خیر (و برکت) نازل ہو اور اللہ تو
جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل کا
مالک ہے(۱۰۵) ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اُسے فراموش کرا
دیتے ہیں تو اُس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں کیا تم نہیں جانتے
کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے(۱۰۶) تمہیں معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی
بادشاہت اللہ ہی کی ہے اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں (۱۰۷)

سورۃ البقرہ

ماہنامہ حکایت لاہور

جلد: 46 | جنوری 2016ء | شمارہ: 05

بانی
عنایت اللہ رح
شاہد بن عنایت اللہ

مدیر اعلیٰ: صالحہ شاہد
مدیر: عارف محمود
اعزازی مدیر: دستگیر شہزاد
منتظم: سعد شاہد

سرکولیشن مینجر
فضل رزاق
محمد نثار رانجھا

شعبہ اشتہارات
خرم اقبال
محمد اشفاق مومن

کمپوزنگ
مجید زبیر
پرائم کمپیوٹرز - لاہور

قانونی مشیر
وقاص شاہد ایڈووکیٹ

شعبہ تعلقات عامہ
میاں محمد ابراہیم طاہر

مجلس مشاورت
ابدال بیلا عظمت فاروق
میم الف ڈاکٹر شبیر حسین
ڈاکٹر نغمہ علی ڈاکٹر نصیر اے شیخ
ڈاکٹر رانا محمد اقبال

مدیر: عارف محمود 0323-4329344
وقاص شاہد 0321-4616461
سرکولیشن مینجر: فضل رزاق 0343-4300564

قیمت -/90 روپے

ہیڈ آفس 26- پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور 042-37356541

مضامین اور تحریریں ای میل کیجیے: monthlyhikayat44@gmail.com
primecomputer.biz@gmail.com

ماہنامہ حکایت لاہور

سالانہ چندہ

رجسٹرڈ ائرمیل

1 — 7000 روپے — پاکستان 800 روپے

سعودی عرب، کویت، اُردن، ایران، سری لنکا، ابوظہبی، بحرین، دوبئی، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت، سوڈان، یوگنڈا، کینیا، نائیجیریا اور دیگر افریقی ممالک، مشرقی اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے، سویڈن، فرانس، ملائشیا، سوئٹزرلنڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برونائی

2 — 7000 روپے

آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، وینزویلا، یونان، امریکہ، نورو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا، ارجنٹائن، جمیکا، میکسیکو، گریناڈا

- غیر ممالک سے رقوم بھجوانے کے لئے ''وقاص شاہد'' کے نام کا ڈرافٹ بنوائیں۔
- پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک وی پی نہیں جاتی، رقم پہلے بھجوانی ضروری ہے۔
- کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار حضرات کے ذمہ ہوگا۔
- خط و کتابت اور بدلِ اشتراک روانہ کرتے وقت خریداری حوالہ نمبر لکھنا ضروری ہے۔

نوٹ: تبدیلیٔ پتہ کی اطلاع مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے دیجئے۔

26-پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، لاہور۔ فون 042-37356541

نام بھی لاثانی معیار بھی لاثانی

www.lasaniindustries.com

ٹانسلز کے آپریشن سے پہلے ایک بار ضرور آزمائیں

صرف توت سیاہ نہیں۔۔ بلکہ

لاثانی توت سیاہ + ملٹھی

- درد میں افاقہ کرتا ہے۔
- گلے کی سوزش دور کرتا ہے۔
- آواز بیٹھ جانے میں مفید ہے۔
- گلے کی خرابی کی وجہ سے ہونے والی حرارت کو ٹھیک کرتا ہے۔

T.M # 277568 C.R # 24432

صرف بیرونی استعمال کیلئے

نام بھی لاثانی

معیار بھی لاثانی

T.M # 165025
C.R # 10955

Ph:
042-37188844-
042-37188855
Fax:
042-37188866

کلپین TM

پٹھوں کے درد، جوڑوں کے درد، موچ، کمر درد اور اعصابی درد کے لئے مؤثر ہے

درد مٹائے آرام پہنچائے فوری جذب ہو کر اثر دکھائے

لاثانی فارما پرائیویٹ لمیٹڈ

lasanipharma@yahoo.com

اس شمارے میں

خصوصی فیچر		
مافیاز میں جکڑا پاکستان	افضال مظہر انجم	17
حب الوطنی		
بچہ اور پرچم	محمد رضوان قیوم	27
اسلامی تاریخ		
وہ اور تھے......	حبیب اشرف صبوحی	30
معاشرت اور قانون		
خوابوں کے اسیر	عارف محمود	33
جگ بیتی		
پھلاں دے رنگ کالے	ڈاکٹر مبشر حسن ملک	49
ناقابل فراموش		
جب بات کھلی	حمید اختر چوہدری	83
المیہ مشرقی پاکستان		
جنرل نیازی کا خط	ملک ساجد گل اعوان	93
انتخاب		
صدیوں پار	ممتاز مفتی	97
تاریخ کے جھروکوں سے		
پچاس سال کا باپ	حکیم مختار احمد ناز	108
علم و تحقیق		
جادو، جنات اور عامل	محمد افضل رحمانی	113
اصلاحی کہانی		
اشکِ ندامت قسط:4	رمیز احمد	129
مکافاتِ عمل		
نافرمان	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق	142

اس شمارے میں

سلسلہ وار کہانی		
ایک دل ہزار داستان	ایس ایم صفی	145
خصوصی کہانی		
جنتِ سوزاں	اختر حسین شیخ	161
مجاہدیے		
برصغیر میں تعلیمی صورتِ حال	کے ایچ مجاہد	183
بات ہے رسوائی کی		
من کی پیاس	دستگیر شہزاد	193
نقطۂ نظر		
ہمارے افسانہ ساز مؤرخین	اوریا مقبول جان	198
ایک تاثر ایک کہانی		
موذی کون؟	فرزانہ نگہت	201
ڈکیت	پیرشہزادہ علیم معصومی	209
ایک حقیقت ایک افسانہ		
شاطر	صداقت حسین ساجد	213
پُراسرار		
باؤلی کے جنات	نسیم لون	225
عرب اسرائیل جنگیں		
چھ روزہ جنگ	میاں ابراہیم طاہر	233
متفرق		
غزل	دستگیر شہزاد	26
آپ کے خطوط	قارئین	14

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

قاتل پروٹوکول

اس دفعہ سیاست سے ہٹ کر کسی ہلکے پھلکے موضوع پر ''کہنے کی بات'' لکھنے کا ارادہ تھا لیکن حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یوم ولادت باسعادت کے روز اخبارات کے صفحات پر ایک دس ماہ کی معصوم بچی بسمہ کی اپنے باپ فیصل کے ہاتھوں میں تصویر دیکھ کر کلیجہ پھٹ کر رہ گیا جو سول ہسپتال کراچی کے بند گیٹوں پر، باپ کی منت سماجت کے باوجود، ایمرجنسی وارڈ میں اس لئے نہ پہنچ سکی کہ ہسپتال میں پاکستان کے مستقبل کے وارث ''تخت وتاج'' شہزادہ بلاول زرداری اپنے خادم اعلیٰ قائم علی شاہ کے ہمراہ اپنی مرحومہ والدہ کے نام پر سرکاری خرچ پر تعمیر شدہ ''ٹراما سینٹر'' کا افتتاح کرنے اور اپنے نام کی تختی لگوانے تشریف لائے ہوئے تھے اور ان کے شہنشاہی پروٹوکول کی وجہ سے ہسپتال کے سب گیٹ مقفل تھے۔

ہسپتال کے مسیحاؤں کے مطابق اگر معصوم بسمہ صرف دس منٹ پہلے ہنگامی (ایمرجنسی) وارڈ تک پہنچ جاتی تو اس کی جان بچائی جا سکتی تھی۔

جب میڈیا اور ٹی وی چینلز پر یہ خبر بریک ہوئی تو ردِعمل میں حکومت سندھ کے وزراء کے جو ارشادات عالیہ سامنے آئے وہ وہاں کی مخصوص جاگیردارانہ وڈیرہ شاہی ذہنیت کی شرمناک غمازی تھی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

پیپلز پارٹی کے سینئر رہنما اور سندھ کے وزیر تعلیم نثار کھوڑو نے فرمایا۔

''بلاول زرداری ہمارے لئے سب سے زیادہ اہم ہیں اور ان کی سکیورٹی ملک کے لئے سب سے اہم ہے''۔

صوبائی وزیر صحت جام مہتاب حسین دہر نے پارٹی چیئرمین بلاول زرداری اور وزیراعلیٰ سندھ قائم علی شاہ کے وی آئی پی پروٹوکول کے سبب کراچی کے سول ہسپتال کے باہر معصوم بچی بسمہ کے انتقال کو ''معمولی واقعہ'' قرار دیا۔ انہوں نے کہا۔

''بچی کے انتقال کا واقعہ کوئی نئی بات نہیں، ایسا ہوتا رہتا ہے''۔

پھر سب سے بڑا جھوٹ پیپلز پارٹی کی ایک خاتون رہنما اور سندھ اسمبلی کی ڈپٹی سپیکر شہلا رضا نے بولا کہ ''بسمہ کی ہلاکت پروٹوکول کے باعث نہیں ہوئی''۔

لیاری کا علاقہ پیپلز پارٹی کا گڑھ ہے۔ جب وہاں بسمہ کی ہلاکت کے خلاف احتجاج شروع ہو گیا اور یہ خبر عالمی میڈیا پر بھی آنی شروع ہو گئی تو وزیراعلیٰ کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوا اور بھاگم بھاگ آئی جی سندھ کو ساتھ لے کر لیاری میں پارٹی رہنما نادیہ گبول کے گھر پہنچے اور وہاں معصوم بسمہ کے والد فیصل بلوچ کو بلا کر بچی کی موت پر ''اظہار افسوس'' کیا اور اسے سرکاری نوکری کی پیشکش کی، نیز بلاول زرداری سے فون پر بات بھی کرائی۔

گویا ایک معصوم بچی کی موت کی قیمت ایک سرکاری نوکری لگائی گئی۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ سندھ کے حکمرانوں نے مندرجہ بالا واقعہ سے کوئی سبق حاصل کرنے کی بجائے اگلے ہی روز کراچی کے پوش علاقے ''ڈیفنس'' کی سب سڑکیں، شاہراہیں اور گلیاں بند کر دیں کیونکہ وہاں ایک سندھی وڈیرے اور قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف خورشید شاہ کے بیٹے کی شادی کی تقریب ایک ہوٹل میں منعقد ہو رہی تھی جس میں بلاول زرداری کے علاوہ سندھ کے وزیراعلیٰ قائم علی شاہ، ان کی کابینہ کے وزراء، بڑے بڑے بیوروکریٹ اور سندھی وڈیرے اور جاگیردار شریک تھے۔ علاقے کے مکین اپنے گھروں کے اندر محصور ہو کر رہ گئے اور جو علاقے سے باہر گئے ہوئے تھے، انہیں تقریب کے اختتام سے پہلے اپنے گھروں تک آنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ حتیٰ کہ ایمبولنسوں کو بھی بمشکل گزرنے دیا گیا۔

وزیراعلیٰ سندھ کے ارشادِ عالیہ ملاحظہ فرمائیں:

''سندھ حکومت نے 50 لاکھ'' لاگت سے ایسا ''ٹراما سینٹر'' بنایا ہے جیسا پورے پاکستان میں نہیں۔ 10 ماہ کی بچی کی موت کو ایسو نہ بنایا جائے''۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

قائداعظمؒ کا قول: ''ان جاگیرداروں، زمینداروں اور سرمایہ داروں نے دراصل اپنے ہی غریب بھائیوں کا خون چوسا ہے، یہ انہی سے سرسبز ہوئے ہیں''۔

میاں محمد ابراہیم طاہر

قلم و قرطاس

سب آنکھ کا دھوکا ہے روانی تو نہیں ہے

بال ٹھاکرے پاکستان کے بارے میں کرودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ ہندو انتہا پسند تنظیم شیوسینا کے بانی سربراہ تھے۔ جس کی بنیاد 1966ء میں رکھی گئی تھی۔ بال ٹھاکرے 86 برس کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوئے جسے نفرتوں نے نرگ بنا رکھا ہے۔ اتم درشن یعنی آخری دیدار کے بعد انہیں اگنی ماتا کی گود تک کا یہ سفر کیسا تھا؟ اس پر تبصرہ مناسب نہیں کیونکہ ہم صوفیانہ کلام کے پہلو میں پرورش پانے والے وہ لوگ ہیں جو اس پر یقین رکھتے ہیں کہ

"دشمن مرے تے خوشی نہ کریئے
سجناں دی مر جانا"

یعنی دشمن کی موت پر جشن نہیں منانا چاہئے کیونکہ دوستوں نے بھی مر جانا ہوتا ہے۔ بال ٹھاکرے بنیادی طور پر کارٹونسٹ تھے اور میں یہ معمہ کبھی نہ سلجھا سکا کہ ایک فنکار اتنا بڑا سیاست کار کیسے بن گیا؟ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہمارا کارٹونسٹ جاوید اقبال "لکیر چو" کے طور پر ریٹائر ہو کر لیڈر بن جائے اور وہ بھی ایک انتہا پسند تنظیم کا۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ انسانوں نے انسانوں کی طرح زندگی کم ہی گزاری ہے۔ حالانکہ تقریباً ہر کلچر میں پڑوسی کو بے حد اہمیت دی گئی ہے پڑوسی کا اک خاص مقام اور ممتاز حیثیت ہے۔ بال ٹھاکرے مہاراشٹر کے بے تاج بادشاہ تھے اور ممبئی ان کا گڑھ تھا۔ جب کہ کراچی اور ممبئی کے گہرے تاریخی و ثقافتی اور انتظامی رشتے ہیں۔ بات ہو رہی تھی پڑوسی کی اہمیت کی تو ہو سکے تو بال ٹھاکرے کے جانشین اودھے ٹھاکرے غور فرمائیں کہ یہ انگریزی کا محاورہ کیا کہتا ہے:

Every man's neighbor is his looking glass.

یعنی انسان کا پڑوسی اس کا وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ اس محاورے کو میکرو لیول پر

سمجھیں تو اس کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں ایک دوسرے کے لئے آئینہ ہیں اور ایک دوسرے میں اپنا اپنا حقیقی چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔

اگر گائے ان کی ماتا جی ہیں تو بیل ان کے پتا جی ہوئے۔ ایسے میں جن ماتا جی اور پتا جی نے انہیں جنم دیا، پالا پوسا پروان چڑھایا اور جو گھر میں بندھے ہوئے ہیں ان کا سٹیٹس کیا ہے؟ حیرت ہوتی ہے آج کے دور میں بھی پسماندہ ذہن کہاں کہاں پھنسے ہوئے ہیں۔ تقریباً پانچ سال پہلے میں نے K. M. Sen یعنی Kshiti Mohan Sen کی انتہائی خوبصورت کتاب "Hinduism" پڑھی تھی۔ وہ روایتی سنسکرت سکول آف بنارس کے تعلیم یافتہ ہی نہیں دیگر بھارتی قدیم و جدید زبانوں کے بھی ماہر تھے، یہ کتاب میں نے ہندوؤں کے مقدس شہر متھرا سے خریدی تھی جس میں انہوں نے صاف صاف بتایا کہ گائے کے گوشت کا اصل مقام اور اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ اس کتاب سے جو میں نے سمجھا سیکھا، ان میں سے ایک یہ تھا کہ ہندو مت میں ہزاروں سال پہلے گائے کا گوشت اس لئے ممنوع قرار دیا گیا کہ گائے ان لوگوں کی زندگی کا محور و مرکز تھی۔ کیونکہ گھاس پھونس یعنی مختلف قسم کے ساگ اور چند اناجوں کے علاوہ ان کا تمام تر انحصار گائے کے دودھ اور اس دودھ کے بائی پراڈکٹس یعنی مکھن، چھاچھ، گھی اور دہی وغیرہ پر تھا۔ دودھ مکھن، گھی سے متعلق بے شمار محاوروں کی جڑوں میں بھی دراصل یہی کلچر ہے۔ ورنہ غیر ملکی مسلمان فاتحین جو سینٹرل ایشیا سے آئے خالصتاً گوشت خور تھے اور گوشت کو اس کی چربی میں ہی تیار کرتے تھے۔ اجتہاد کا ظاہر ہے ان میں تصور ہی نہیں سو یہ ایک منجمد اور ٹھٹھری ہوئی قوم ہے۔ تو دوسری طرف شیوسینا ٹائپ مائنڈ سیٹ کے لئے یہ انتہا پسندی، ان کی روٹی روزی اور اقتدار کا بہانہ بھی ہے کہ مذہب کی آڑ میں اقتدار کا حصول نسخہ کیمیا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن دولے شاہ کے چوہے نہیں جانتے کہ اس ڈیجیٹل زمانے اور سیٹلائٹ عہد میں ان کا مستقبل تاریکی کے سوا کچھ نہیں کہ جو قومیں اپنے عصر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوں گی وہ ڈائنا سارز کی طرح مٹ جائیں گی۔ سائنس اینڈ ٹیکنالوجی سے چھلکتے ہوئے اس گلوبل ولیج میں ان کے ناپاک وجود کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں۔ انہیں چیچک کی طرح مٹنا ہوگا۔

ہمارے لئے ضروری ہے کہ شیوسینا ٹائپ شیطانی ایکشن پر نظر رکھتے ہوئے اس ری ایکشن پر بھی نگاہ ڈالیں جو خود بھارت کے اندر سے ان جنونیوں کے خلاف ابھرتا دکھائی دیا ہے۔ گائے ماتا کے ان آوارہ بچھڑوں نے گائے ماتا کے نام پر کلکرنی کا منہ کالا کر کے دراصل اپنی دھرتی ماتا کا منہ کالا کیا ہے۔ آج نہیں تو کل ہندو انتہا پسندی کو گائے ماتا اور دھرتی ماتا میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔

ہندوستان اگر ایک قدم آگے بڑھے تو ہمیں دو قدم آگے بڑھنا چاہئے لیکن اگر وہ ایک قدم پیچھے ہٹے تو

ہمیں دو قدم پیچھے ہٹ جانا چاہئے۔ آج اگر چائے فروش مودی ہے تو گزرے کل میں ایک شاعر اٹل بہاری واجپائی بھی تھا جس نے اپنے شعری مجموعہ کا نام رکھا ''جنگ نہ ہونے دیں گے'' کل پھر کوئی واجپائی آ سکتا ہے، بیچ کوئی ذات نہیں، رویہ ہوتا ہے۔

ایسے لوگوں کو نہ موت یاد ہے نہ تاریخ کا بھیانک سبق کہ بڑے بڑے مقتدر ترین خاندان کا بھی بالآخر نام و نشان مٹ جایا کرتا ہے اور ڈھونڈنے پر بھی ان کی مدھم ترین نشانیاں تک نہیں ملتیں۔ ہنی بال، اٹیلا اور سکندر تو بہت پیچھے رہ گئے، مغلیہ خاندان تو ابھی کل کی بات ہے۔ کہاں گئے؟ اس طرح ایران کا صفوی خاندان اور سلطنتِ عثمانیہ کے چشم و چراغ کن اندھیروں کی بھینٹ چڑھ گئے؟ رہے نام اللہ کا کہ یہاں دوام کسی کو بھی نصیب نہیں اور پھیرنے والا انسانوں میں دنوں کو پھیرتا رہتا ہے۔ کچھ اور نہیں تو پاکستان بننے سے پہلے کے معززین اور بااثر ناموں کی فہرست پر ہی ایک نظر ڈال لیں کہ آج ان کے وارثوں کا نام تک کوئی نہیں جانتا اور یہ جو اس وقت محنت مزدوری کر کے زندگی کی گاڑی کو بمشکل کھینچ رہے تھے آج راجے مہاراجے بنے بیٹھے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ سب کچھ سدا اسی طرح رہے گا۔ اس سے بڑی جہالت اور حماقت کوئی نہیں لیکن کیا کریں۔ طاقت، شہرت، دولت اندھا کر دینے والی چیزیں ہیں اور یہ اندھے ہیں جو نوشتہ دیوار پڑھنے کے قابل بھی نہیں، سننے کے لائق بھی نہیں۔

یہ سب ہے کیا؟ خواب تھا جو کچھ بھی دیکھا جو سنا وہ افسانہ تھا۔ خواب کے بعد آنکھ کھلنے پر ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب تھا۔ زندگی کے خواب ہونے کا علم اس وقت ہوتا ہے جب آنکھیں بند ہوتی ہیں لیکن ان نامرادوں اور بدبختوں کو شاید نہ پہلے کچھ خبر ہوئی ہے نہ بعد میں۔ میرا بس چلے تو حکمرانوں کو زبردستی گن پوائنٹ پر بڑے لوگوں کے آخری لمحات پڑھاؤں یا سناؤں لیکن شاید ان چکنے گھڑوں پر پھر بھی کوئی اثر نہ ہو کہ اثرات قبول کرنے کے لئے دل اور دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ ان کے دلوں کی جگہ تجوریاں اور دماغوں کی جگہ کیلکولیٹرز نصب ہیں۔

اپنے باپ کو قتل کر کے خلافت حاصل کرنے والا خلیفہ المنتصر بن متوکل عباسی بستر مرگ پر تھا۔ ماں نے پوچھا۔ تیری کیفیت کیا ہے؟ تو بولا۔ مجھ سے دنیا اور آخرت دونوں چھن رہی ہیں۔ سلطان محمد بن محمود بن محمد بن ملک شاہ سلجوقی مرض الموت میں مبتلا ہوا تو حکم دیا کہ تمام خزانہ، لونڈیاں، غلام خدمت میں پیش کئے جائیں۔ حکم کی تعمیل ہو چکی تو بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ یہ خزانہ، یہ جواہرات، یہ نوادرات ملک الموت بطور فدیہ قبول کر لے تو میں بخوشی پیش کرنے کو تیار ہوں۔ یہ حسین ترین چہیتی کنیزیں اور وفادار غلام بھی قبول کر لے تو سب حاضر ہیں لیکن افسوس میرا مال، میری حکمرانی شکست کھا گئی اور یہ دولت، طاقت، عزت، شہرت مل

کر بھی میری زندگی میں ایک لمحہ کا اضافہ نہیں کر سکتے۔ اور جب سلطان تغلق کو اپنی موت کا یقین ہو چلا تو کہا۔ کہاں گئی وہ شان و شوکت، کدھر گیا وہ اختیار سطوت، کوئی ایسا ہے جو کسی بھی قیمت کے عوض مجھے شکنجۂ مرگ سے چھڑا سکے۔ فرمانروائے مصر حضرت عبدالعزیز بن مروان بن الحکم نے اپنے آخری لمحات میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ انہیں ان کا کفن دکھایا جائے۔ کفن لایا گیا تو کچھ دیر اسے خاموشی سے تکتے رہنے کے بعد کہا۔ تُو چھوٹا ہونے کے باوجود بہت لمبا ہے اور کم ہونے کے باوجود بہت زیادہ ہے۔ توقف کے بعد پھر کہا۔ کاش! میں دولت کے شر سے محفوظ رہتا اور بجائے حکمران ہونے کے نجد کے اونٹوں کا چرواہا ہوتا۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان نے عالم سکر میں کیسی عجیب بات کہی۔

اے دنیا! تُو کیسی خوشبودار ہے، تیرا طویل کتنا مختصر اور تیرا کثیر کتنا حقیر ہے۔ خلیفہ معتصم باللہ عباسی انتہائی شجاع اور طاقتور آدمی اتنا جسیم اور طاقتور کہ گلے مل کر زور سے دباتا تو دوسرے آدمی کی پسلیاں ٹوٹ جاتیں۔ لوگ اس کی ہیبت سے تھر تھراتے تھے لیکن جب آخری وقت آیا تو یہ آیت پڑھی۔

ترجمہ: ''اور جو کچھ انہیں دیا گیا تھا وہ جب اس پر اترانے لگے تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا اور وہ مایوس ہو گئے''۔

نہ زندگی کے ہنر سے آشنا نہ موت سے خبردار، ان لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی پکڑ نہ ہو گی اور ان کے فریب یونہی چلتے رہیں گے۔ لیکن کب تک؟

سب آنکھ کا دھوکا ہے روانی تو نہیں ہے
دریا میں فقط ریت ہے پانی تو نہیں ہے

دستگیر شہزاد

نوٹ: ''جنونِ عشق'' کی تیسری اس ماہ شائع نہیں کی جا رہی۔ محترم ریاض عاقب کوہلر کچھ ذاتی مصروفیات اور مشکلات کی وجہ سے لکھ نہیں پائے۔ ان شاء اللہ تیسری قسط سالنامہ فروری میں پیش کی جائے گی۔
(ادارہ)

خطوط و خیال

آپ کے خطوط

یہ کالم قارئین کے خطوط اور آراء سے ترتیب دیا جاتا ہے۔

حقوق یاد فرائض بھول گئے

محترم مدیر صاحب السلام علیکم!

''پاکستان کا کیا بنے گا'' کے عنوان سے مختلف اہلِ دل نے اظہار خیال کیا کچھ بہت پُر امید ہیں، کچھ نے ساری ذمہ داری حکومت پر ڈال دی اور خود بری ذمہ ہو بیٹھے۔ میں سمجھتا ہوں جناب سیف الحق خیالی نے مرض کی درست تشخیص کی ہے۔ قوموں کے زوال کے اسباب میں میرٹ ڈسپلن اور اتحاد کے نہ ہونا ہے۔ جو قومیں اس مرض میں مبتلا ہو جاتی ہیں ان کی دنیا میں کہیں جگہ نہیں ہوتی اور یہ مہلک امراض ہمارے ہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ہمیں صرف اپنے حقوق یاد ہیں لیکن ہم یہ بھول ہی گئے ہیں کہ فرائض بھی کوئی چیز ہیں۔ حقوق فرائض کی کوکھ سے ہی جنم لیتے ہیں۔ ہمارا مقصد دولت کمانا ہے، کیسے اور کن ذرائع سے حاصل ہو اس سے کوئی غرض نہیں۔ کس کا حق مارا جارہا ہے، اس کی کوئی پروانہیں۔

غور کریں کہ ٹریفک کے سگنل لگانے کا مقصد کیا ہے؟ ذرا ایک چوراہے پر کھڑے ہو جائیں، آپ کو قوم کے مزاج کا پتہ چل جائے گا۔ ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی میں ہم فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس خلاف ورزی کے نتیجہ میں حادثہ ہو جائے تو پھر اس کی ذمہ دار حکومت ہے۔ ذرا سی دیر میں ٹریفک اس بُری طرح پھنس جاتی ہے کہ نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ سڑک پر جاتی ایمبولینس کا حال دیکھیں سائرن بجاتی راستہ کی تلاش میں ہوتی ہے اور کوئی راستہ دینے کو تیار نہیں۔

تعلیم جو ڈسپلن قائم رکھنے کا ایک اہم شعبہ ہے، کا حال اس سے بہتر نہیں۔ وہ سکول/ کالج جہاں کا طالب علم ہونا کبھی فخر کی بات ہوتی تھی، آج ان کی جگہ اکیڈمیوں نے لے لی ہے جہاں پر صرف زیادہ نمبر حاصل کرنے کے گر سکھائے جاتے ہیں، تربیت غائب ہوگئی ہے۔

کاروباری حالات کو دیکھ لیں تمام دنیا میں دکانیں شام چھ بجے بند ہو جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں ظہر کے بعد دکانیں کھلتی ہیں اور تمام رات کاروبار جاری رہتا ہے۔ ان کی غیر حاضری میں کون ان کے بچوں کی تربیت کا اہتمام کرتا ہے ان کو اس سے غرض نہیں۔ پھر جب تربیت کا عنصر ہی غائب ہو گا تو روشن پاکستان کیسے بن سکتا ہے۔

ہماری سیاست کا پہیہ نفرت، ہڑتالوں، گالی گلوچ کے گرد گھومتا ہے۔ الزام تراشی کی سیاست ہے کبھی کسی لیڈر نے عملی طور پر صحیح لیڈر بن کر دکھایا؟ خواب دکھانا کہ بغیر عمل کے بغیر محنت کے ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہو جائے گی۔

علماء کا کام قوم میں اتحاد پیدا کرنا ہوتا ہے، کیا علماء نے اپنا یہ فریضہ سرانجام دیا؟ اس سلسلے میں مسٹر جسٹس پیر کرم شاہ کا ایک اقتباس کچھ یوں ہے۔

''آج بھی دین اسلام کو اپنی برتری اور افادیت ثابت کرنے کے لئے ایسے گواہوں کی ضرورت ہے جو اپنے عمل، اپنے اخلاق، اپنی روحانی بلندی اور وسعت علم سے اس کے برحق ہونے کی ایسی شہادت دینے کی اہلیت رکھتے ہوں کہ کوئی انہیں جھٹلا نہ سکے ورنہ جو تبلیغ آج ہم کر رہے ہیں وہ بیگانوں کو تو کیا اپنوں کو بھی اسلام سے متنفر کر رہی ہے۔ چاک گریباں کو رفو کرنا تو کجا ہمارے مبلغین ان چاکوں کو اور زیادہ وسیع کر رہے ہیں۔ محبت و پیار کا درس دے کر ملت کے پراگندہ شیرازہ کو یکجا کرنا تو بڑی بات ہے جہاں ان کے سبز قدم پہنچے وہاں فتنہ و فساد کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ آج ہاتھوں میں سوئی نہیں قینچی ہے''۔

میں نہیں سمجھ پا رہا کہ ان حالات میں جہاں ہم کھڑے ہیں اور جہاں ہمیں یہ بھی احساس نہیں کہ غلط راستے کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس سڑک کے خاتمے پر ہریالی ہی ہریالی ہے۔ اگر مستقبل روشن دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر قوم کو جہالت سے نکالنا ہو گا۔ بتانا ہو گا کہ ترقی ہڑتالوں میں نہیں ہے، علم میں ہے، محنت میں ہے، دیانتداری میں ہے۔ ہمیں احساس ہی نہیں کہ ہڑتالوں میں جن چیزوں کو تباہ کر رہے ہیں وہ ہماری اپنی ہی ہیں۔ ہمیں حقوق ہی نہیں فرائض بھی یاد دلانے ہوں گے۔ ورنہ یہ سب کچھ بس ایک خواب ہے جس میں ہمیں سلا دیا گیا ہے بلکہ ہم خود ہی آنکھیں کھولنا نہیں چاہتے اور یہ احساس ہمیشہ بنیاد سے ہی شروع ہوتا ہے۔

منصور انعام- علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

کچھ تجاویز

محترم مدیر صاحب السلام علیکم! بعد آداب کے عرض یہ ہے کہ میں نے کچھ عرصہ پہلے آپ کو ایک خط لکھا تھا جس میں تجویز پیش کی تھی کہ ایک صفحہ قارئین کی آراء کے لئے مختص کر دیں۔ شاید آپ کو میری تجویز پسند نہیں آئی۔ حالانکہ اس تجویز سے آپ کا ماہنامہ مزید ترقی کرتا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم عنایت اللہ کی بخشش فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ وہ فوراً میرے خطوط کا جواب دیتے تھے اس مقصد کے لئے ان کے پاس پوسٹ کارڈ تھے۔

اگست 2015ء کے شمارے میں بہت خراب چھپائی ہے۔ اکثر جگہ الفاظ مٹے ہوئے ہیں اور روشنائی صاف نہیں ہے۔ نیز کتابت کی غلطیاں تقریباً ہر کہانی میں ہیں۔ براہ کرم یہ خامیاں اگلے ماہنامہ میں دور کرنے کی کوشش کریں تاکہ کہانیاں پڑھنے میں اصل لطف برقرار رہے۔ تمام کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں اور دلچسپی مزید بڑھ جاتی ہے۔ قارئین کے ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔ اگست کے پرچے کی بہترین خصوصی تحریر

''بھٹکے ہوئے راہی'' ہے۔ ڈاکٹر مظفر حسین ملک صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ابھی ابھی ''حکایت'' ماہ ستمبر 2015ء ملا ہے۔ کہانی ''وہ سراپا فتنہ تھی'' کا صفحہ 231 بالکل سادہ ہے۔ اگر ہو سکے تو یہ صفحہ بھیج دیں۔ شکریہ!

سیّد شاہد علی-ملیر، کراچی

☆......محترم شاہد علی صاحب! ''وہ سراپا فتنہ تھی'' کہانی مکمل ہے۔ جہاں صفحہ سادہ رہ گیا ہے وہاں ایک کمپنی کا اشتہار لگنا تھا جو غلطی سے لگ نہ سکا۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ (مدیر)

کھوج اور پرکھ کے راستے

محترم مدیر ماہنامہ ''حکایت'' السلام علیکم!

''حکایت'' کئی سالوں سے زیر مطالعہ ہے اور پورے گھر میں شوق و ذوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ شکار، جرم و سزا، آپ بیتی اور معاشرتی کمزوریاں اجاگر کرتی کہانیاں شروع سے میری پسند رہی ہیں لیکن اکتوبر کے شمارے میں ''توبہ'' کہانی نے رُلا کر رکھ دیا ہے۔ میں خود الحاج ہوں، کئی بار عمرہ کی سعادت حاصل کی۔ حج اور عمرہ کی ادائیگی کے دوران کئی رقت آمیز اور حیرت انگیز مناظر دیکھے۔ غسل کعبہ اور غلاف کعبہ کے تبدیل ہونے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور عمرہ ادائیگی کی نصف سنچری مکمل کر چکا ہوں۔ طواف اور حجر اسود کے بوسہ دینے کا شمار نہیں لیکن جیسی ریاضت اور دل لگی اختری کی عبادت میں دیکھی تو اپنے اعمال پر شرم ساری ہو رہی ہے۔ اس نے خانہ کعبہ کو گواہ کر کے توبہ و استغفار کا ایسا رویہ اپنایا جیسے تخت یا تختہ والی بات ہو۔ یہاں ہمارے کھوکھلے رویوں، کردار کی پختگی اور سیدھے راستے پر آنے کی دعوت اور تبلیغ کی قلعی کھل گئی ہے۔ جو قارئین حج یا عمرہ کی ادائیگی کر چکے ہیں اس کہانی کی گہرائی تک وہ بہتر انداز میں اتر سکتے ہیں۔ اگر ہم اس کہانی کے تناظر میں خود میں تبدیلی لاتے ہیں جو نیکی کی راہ پر چلنا چاہتا ہے اس کے ماضی کو نظرانداز کر کے اس کا ہاتھ پکڑ کر مدد فراہم کرتے ہیں تو مانئے کہ ہم ضرور نیکی کے کام میں حصہ دار ہیں۔

ایک کمی جو میں شروع سے ''حکایت'' میں دیکھ رہا ہوں یہاں قاری اور مدیر کے درمیان رابطہ نہ ہونا ہے۔ اس سے جہاں محبت بڑھتی ہے وہاں کہانی پر رائے اور پڑھنے والے ایک دوسرے کے ساتھ معلومات کا تبادلہ بھی کرتے ہیں۔ یوں کھوج اور پرکھ کے راستے کھلتے ہیں، یہ انتہائی ضروری کام ہے۔ پہلی فرصت میں ایسا کالم ترتیب دیا جائے جہاں قارئین باقاعدگی سے کہانیوں، مضامین و دیگر سلسلوں کے بارے میں آپ کو آگاہ کر سکیں۔

اعجاز حسین سحار-نور پور تھل ضلع خوشاب

☆......محترم سید شاہد علی صاحب اور اعجاز حسین صاحب! ماضی میں ''اظہارِ خیال'' کے عنوان سے قارئین کے خطوط شائع ہوتے تھے لیکن جب سے موبائل عام ہوا ہے، لوگوں نے خط لکھنا تقریباً چھوڑ دیا ہے۔ SMS دو سطر کا کرتے ہیں یا مختصری کال۔ ایسے حالات میں ہم دوسروں کی طرح جعلی خطوط شائع نہیں کر سکتے۔ قارئین کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس کالم میں اپنی آراء و تجاویز کا کھل کر اظہار کریں۔ ہم ان شاء اللہ آپ کی رائے کا احترام کریں گے۔ یہ پرچہ قارئین کا ہے اور اسے قارئین کی آراء کی روشنی میں ترتیب دیا جاتا ہے۔ ہمیں آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔ (مدیر)

✱◆✱

پاکستان اپنی آزادی کے 69ویں سال میں داخل ہو چکا ہے۔ اس عرصہ میں دوسری اقوام ستاروں پہ کمندیں ڈال چکی ہیں اور پاکستانی قوم ابھی اڑان بھی نہ بھر پائی تھی کہ مافیاز کے چنگل میں پھنس گئی۔

مافیاز کے شکنجے میں جکڑا پاکستان

☆ افضال مظہر انجم
afzaalmazhar@gmail.com

ہزار سال تو برصغیر غیر ملکی اقوام یا حاکموں کے زیر اثر رہا۔ کبھی غزنوی، مغل اپنی طاقت کے بل بوتے پر اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں، راجوڑوں کے آپس میں لڑنے جھگڑنے کی وجہ سے کابل سے لے کر ڈھاکہ تک کے علاقوں پر قابض رہے جو آج چار ممالک انڈیا، بنگلہ دیش، پاکستان اور افغانستان پر مشتمل خطہ ہے۔ اس کے بعد انگریز برصغیر میں تاجروں کے روپ میں داخل ہوئے اور آپس میں لڑتے، ایک دوسرے کو نیچا دکھاتے، مسلمان، ہندو راجاؤں کی مدد سے بالآخر پورے برصغیر پر قبضہ کر بیٹھے جو 150 سے 200 سال تک جاری رہا۔

انگریز کے جانے کا وقت قریب آیا یعنی ان کی گرفت مقبوضہ علاقوں پر ڈھیلی پڑی تو انگریز کو یہاں سے جانا پڑا۔ اس وقت کے مسلمان زعماء نے سوچا کہ تمیں چالیس کروڑ ہندوؤں کے مقابلہ میں صرف آٹھ کروڑ مسلمان ہمیشہ ہی ہر لحاظ سے ہم پر بالادست رہیں گے۔ یہ بالادستی زمینوں کے مالکان کی شکل میں اور کاروباری میدان کے علاوہ سرکاری محکموں میں ان کی زیادہ تعداد ہونے کی وجہ سے ہوتی۔ یعنی نئے ملک پاکستان کے بنانے کے پس پردہ ہر طرح کی مذہبی، رسم و رواج کی آزادی کے علاوہ ہندو جاگیرداروں کے ظلم و تشدد سے نجات اور سود خور ہندو مہاجنوں سے چھٹکارا حاصل کرنا

بھی تھا یعنی معاشی آزادی کا حصول بھی مقصد اوّلین تھا کیونکہ زیادہ کاروبار ہندوؤں کے قبضہ میں تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انصاف کی فراہمی کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لئے ہی نئے ملک کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔

ملک بننے کے چند سالوں تک ملک بنانے والی شخصیات نے ہی اسے سنبھالے رکھا کیونکہ ان لوگوں نے اس ملک کو بنانے کے لئے ساری عمر جدوجہد کی تھی اور قربانیاں بھی دی تھیں۔ ملک بننے کے بعد بھی ان وفا کے پتلوں نے نئے ملک سے نہ تو زمینیں اور پلاٹ حاصل کئے۔ نہ امپورٹ ایکسپورٹ کے لائسنس حاصل کئے اور نہ ہی اپنی اولادوں کو ناجائز طریقے سے نوازا۔ سرکاری عہدوں پر رہ کر بھی لگژری گاڑیوں، محلات نما وزیراعظم ہاؤس و سیکرٹریٹ اور بھاری تنخواہوں اور مراعات سے اجتناب کیا۔ محمد علی جناح، لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب نشتر، محمد علی بوگرہ، حسین شہید سہروردی، چوہدری محمد علی بھی گورنر جنرل، وزارت عظمیٰ کے بلند و بالا عہدوں پر فائز رہے لیکن ایک روپے کی بھی کرپشن نہیں کی۔ اس دور میں اقتدار کی کھینچا تانی، ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی سیاست ضرور جاری رہی۔ روز روز کی بنتی ٹوٹتی اسمبلیوں کی وجہ سے اور سیاست دانوں کے میجر جنرل سکندر مرزا اور غلام محمد جیسے بیوروکریٹوں کو مسند اقتدار پر لا بٹھانے کی وجہ سے ملک کا ترقیاتی کام شدید متاثر ہو رہا تھا۔ اس دوران جنرل ایوب خان نے ملک میں پہلا مارشل لاء لگا کر اس 'سیاسی افراتفری' کو ختم کیا لیکن اس مارشل لاء یا فوجی ڈکٹیٹرشپ کے دوران ملکی تعمیر و ترقی خواہ تعلیم، صحت، انڈسٹری، دفاع، سائنس، زراعت کے میدان میں ہو کو فوکس کیا گیا۔ گو صنعتی ترقی انتہا پر پہنچنے کی وجہ سے ملک میں 22 بڑے صنعتی خاندانوں کو خوب عروج ملا لیکن عام آدمی کے لئے بھی ہر طرح کی ترقی کے دروازے کھلے رہے۔

سیاست میں جاگیردار، سردار مافیا کا راج

ملک بننے کے بعد مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) کے چاروں صوبوں، پنجاب، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) میں جاگیردار اور سردار ہی سیاست میں وارد تھے۔ مشرقی بازو میں جاگیرداریت نہ ہونے کی وجہ سے درمیانہ طبقہ کے لوگ سیاست میں مصروف عمل تھے۔ 1971ء تک یعنی ملک کا ایک حصہ علیحدہ ہونے تک یہ صورت حال برقرار رہی۔ 1972ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ایک تو بڑی صنعتوں، بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومیانے سے بڑے صنعتی خاندانوں کو شدید دھچکا برداشت کرنا پڑا۔ گو اس عمل سے ملک کی معیشت کو بھی ناقابل تلافی جھٹکا برداشت کرنا پڑا جو عرصہ دراز تک سنبھل نہ سکی۔ اس دور میں درمیانہ طبقہ کو بڑی تعداد میں آگے آنے کے مواقع ضرور حاصل ہوئے۔ سیاست میں بھی عام لوگوں کو گورنر اور وزارت اعلیٰ کے عہدوں پر فائز ہونے کے مواقع حاصل ہوئے لیکن سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد میں جاگیرداروں اور سرداروں کا مافیا کمزور ہونے کی بجائے مضبوط ہوتا چلا گیا۔ کوئی بھی حکومت یا حکمران خواہ وہ جمہوری حکومت ہوتی یا فوجی ان کی آشیرباد کے بغیر اس کا چلنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ گویا یہ سردار اور جاگیردار یا جاگیرداروں کی شکل میں پیر حضرات لوگوں کے اَن داتا بنے ہوئے تھے اور لوگ بھی ان کے چنگل سے نکلنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ تھے۔ گویا عوام نے معاشی طور پر انتہائی کمزور اور افرادی قوت کے لحاظ سے انتہائی مجبور ہو کر ان کی ذہنی غلامی قبول کی ہوئی تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو کے دور کے بعد جنرل ضیاء الحق کا دور آیا تو فوجی حکومت نے بھی شور شرابے سے بچنے اور اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے انہی جاگیرداروں اور

سرداروں کا ہی سہارا لیا۔ خواہ وہ سندھ یا بلوچستان کے بڑے جاگیردار ہوں یا پنجاب کے چھوٹے زمیندار تھے۔ صوبہ خیبر پختونخوا میں اس دوران مذہبی جماعتیں اپنا اثر و رسوخ بڑھا چکی تھیں۔ ضیاء دور میں بھٹو دور میں دیوار سے لگائے صنعت کاروں کو صنعتیں واپس کی جارہی تھیں اور صنعتی عمل کو بڑھانے کے لئے مراعات بھی دی جارہی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب بھٹو دور میں شروع کی جانے والی کرپشن اور لوٹ مار مزید آگے بڑھ چکی تھی اور ضیاء دور میں اس میں جرنیل ٹولہ بھی کھل کر شامل ہو چکا تھا۔ بھٹو دور میں اراکین اسمبلی کو پہلی مرتبہ قیمتی پلاٹوں کی الاٹمنٹ کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ساتھ ہی فوجی افسروں کو بھی ملکی تاریخ میں پہلی بار پلاٹ دینے کا سلسلہ شروع کیا گیا جس سے لینڈ مافیا کا نیا طبقہ وجود میں آنا شروع ہوا۔ قرضوں میں جکڑے غریب ملک کے سرکاری افسروں، ججوں، صحافیوں تک کو اربوں روپے کے قیمتی پلاٹوں کی بخشیش شروع کردی گئی۔

صنعت کار، قبضہ اور لینڈ مافیا سیاست میں

1988ء سے لے کر 1999ء تک کا گیارہ سالہ دور نواز شریف اور بے نظیر کی چار جمہوری حکومتوں کا دور تھا۔ اس دور میں ہی دونوں وزیراعظموں نے دو دو مرتبہ وزارت عظمیٰ سنبھال کر کرپشن اور لوٹ مار کو اس انتہا تک پہنچا دیا۔ اس سے پہلے کرپشن یہاں تک نہیں پہنچی تھی۔ قومی بینک اربوں روپے کے قرضے لے کر ہڑپ کر لئے گئے۔ تمام قومی ادارے لوٹ مار کر کے اور سفارشی اور ناجائز بھرتیاں کر کے تباہ کر دیئے گئے۔ دونوں پارٹیوں مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے اراکین اسمبلی اور ساتھی صنعت کاروں پر بینکوں کے قرضے لٹائے گئے۔ اسی عرصہ کے دوران صنعت کار میدان سیاست میں وارد ہوئے اور جاگیرداروں نے بھی شوگر اور ٹیکسٹائل ملیں لگا کر صنعت کے میدان میں قدم رکھا۔ گویا شوگر، فلور ملیں، ٹیکسٹائل ملیں لگانے والا مافیا سیاست میں اپنے مضبوط پنجے گاڑ چکا تھا۔ اس دور میں ہی ٹٹ پونجیے، پھانک، سیاست میں پناہ لے کر زمینوں پر ناجائز قبضے کر کے بھی طاقتور قبضہ مافیا کی صورت میں سامنے آ چکا تھا۔ جنرل یحییٰ خان کے دور کے بعد 1972ء میں شروع ہونے والی لوٹ مار اپنے پر پرزے پوری طرح نکال چکی تھی اور جنرل ضیاء دور تک اس میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ اسی دور میں نواز شریف کے پنجاب کا وزیراعلیٰ بننے کے بعد ایسے مافیاز کو کھل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ محمد خان جونیجو دور میں ارکان اسمبلی کو سرکاری فنڈز لوٹنے کی کھلی چھٹی دینے سے اس مافیا کو لوٹ مار کرنے کی ایسی لت پڑی جو آج تک جاری ہے۔

عوام بے روزگار، ملکی انڈسٹری تباہ

بھٹو دور میں ارکان اسمبلی اور فوجی افسران کو عوام کے خون پسینے کی کمائی سے اربوں روپے کے پلاٹ دینے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ نواز شریف اور بے نظیر کے دور میں ایک بڑے مافیا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس مافیا نے سرکاری زمینوں پر قبضوں کے علاوہ ارکان اسمبلی اور جاگیرداروں نے غریبوں کی زمینوں پر بھی ناجائز قبضے شروع کر دیئے تھے کیونکہ پراپرٹی کے نرخوں میں ہوش ربا اضافہ سے دنوں میں کروڑوں کمانے کا یہ آسان نسخہ تھا۔ اس ملک کا کوئی ایم این اے، ایم پی اے، وزیراعظم، وزیراعلیٰ، جرنیل، جج ایسا نہیں جو پراپرٹی پلاٹوں کی وجہ سے کروڑ پتی نہ بنا ہو۔ فوجی افسران نے اپنی ہاؤسنگ سوسائٹیاں بنا کر اپنے آپ کو ہی نوازنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی دوران شہروں میں زمینوں کے نرخ مہنگے ہونے کی وجہ سے ہاؤسنگ سکیمیں بنا کر اربوں روپے کمانے والا مافیا بھی میدان میں آ چکا تھا۔ جس طرح سٹاک ایکسچینج

میں شیئرز پر سٹہ یا جوا کھیلا جاتا ہے، پراپرٹی کے فیلڈ میں بھی سٹہ کھیلا جانے لگا۔ قوم کو بے وقوف اس طرح بنا کے رکھا گیا کہ لوگوں کا کھربوں روپیہ اینٹ پتھروں میں لگا دیا گیا یعنی غیر پیداواری کام کی طرف، اگر اربوں روپے کی اس رقم سے ملک میں انڈسٹری لگائی جاتی۔ کارخانوں کے قیام سے لاکھوں لوگوں کو روزگار مل سکتا تھا۔ یہ سارا پیسہ بلیک منی یا ناجائز کمائی کا تھا۔ ایک شخص ہی ایک کروڑ روپے سے لے کر 10 کروڑ روپے تک کا پلاٹ یا بنگلہ لے رہا ہے۔ وہی شخص دوسرا اور تیسرا سودا کر کے اپنی ناجائز کمائی ٹھکانے لگا رہا ہے۔

آپ کبھی غور کریں کہ جب کسی چیز کی قلت ہو جائے تو اس کے نرخ بڑھ جاتے ہیں۔ اکثر اوقات ٹماٹر یا پیاز کی نئی فصل نہ آنے یا کمیابی ہونے سے 20 روپے کلو والی یہ شے 100 روپے کلو سے بھی اوپر چلی جاتی ہے لیکن دوبارہ اسی قیمت پر واپس آ جاتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں سینکڑوں ہاؤسنگ سکیموں میں پلاٹ دن بدن بڑھنے سے ان کی قیمت کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ 15 سال پہلے 15 لاکھ کا مکان 20، 30، 40 کے بعد بعض جگہوں پر 60، 70 لاکھ کا ہو چکا ہے۔ یہ ساری گیم ملکی انڈسٹری تباہ کرنے کے لئے بھی سٹہ مافیا کروا رہا ہے۔ ایک تو ٹیکس چور، ناجائز کمائی سے دولت حاصل کرنے والے اس کاروبار کو بڑھا رہے ہیں۔ دوسرے یہی مافیا ملک کی انڈسٹری کی تباہی میں منفی کردار ادا کر رہا ہے۔ ملک میں کا نیج انڈسٹری تو تباہ و برباد کر دی گئی ہے۔ اس ملک کا سرمایہ کار ہی نہ تو بجلی کی وجہ سے اور نہ ہی اس کے نرخوں میں اضافہ کی وجہ سے نئے کارخانے لگا رہا ہے۔ ان سارے مافیا کی وجہ سے ہم غیر ملکیوں کی 18 کروڑ پر مشتمل عوام کی مارکیٹ بن کر رہ گئے ہیں۔ چائے، پانی، جوتے، کپڑے، جیولری تک بیرونی ممالک سے آ رہی ہے۔

لینڈ مافیا کے کاروبار کو فروغ دینے کے لئے پہلے نواز شریف نے بینکوں، سیونگ سینٹرز کے منافع میں کٹوتی کرنا شروع کی جس پر اس ملک کے تین چار کروڑ ریٹائرڈ لوگ پل رہے تھے۔ پھر مشرف دور میں شوکت عزیز نے بھی اس مافیا کو فائدہ پہنچانے کے لئے منافع کے ریٹ میں مزید کمی کر کے غریب اور درمیانہ طبقہ کے بیڑہ غرق پروگرام میں اضافہ کیا۔ تازہ رپورٹ کے مطابق پراپرٹی مافیا نے حالیہ برسوں میں جائیداد کی ٹرانسفر کے سلسلہ میں 2000 ارب روپے کی ٹیکس چوری کی ہے اور یہ چوری صوبائی اور وفاقی حکومتیں کراتی ہیں۔ کیا ہمارے ملک میں کبھی صدر، وزیراعظم، وزیراعلیٰ، گورنر، جرنیل اور جج کو ٹیکس نوٹس بھیج کر جائز ٹیکس وصول کیا گیا؟ اسمبلیوں میں خود لینڈ مافیا کے بیٹھنے، اقتدار میں ہونے، جرنیلوں اور ججوں کے بچوں، بھائیوں، بھتیجوں کے اس 'مایا' کی وجہ سے خوشحال ہونے کی وجہ سے کوئی کسی کو غلط کام سے روکنے کی ہمت نہیں کر رہا جو ملک کی انڈسٹری کی تباہی، معیشت پر منفی اثر اور عوام کی بے روزگاری کے علاوہ افراط زر کا باعث بن رہی ہے۔

ملک لوٹنے کا مقابلہ

نواز شریف اور بے نظیر ادوار میں ملک کو نت نئے طریقے سے لوٹنے کا مقابلہ شروع ہو چکا تھا اور ملکی خزانے لوٹنے اور بیرونی ممالک سے ملے قرضوں پر ہاتھ صاف کرنے کے نت نئے طریقے آزمائے جانے لگے۔ یوں جاگیرداروں، سرداروں کے علاوہ لینڈ مافیا، قبضہ گروپ، شوگر مافیا، ٹیکسٹائل مافیا نہ صرف معاشرے میں مضبوط تر ہوتا چلا گیا بلکہ سیاست میں بھی ناقابل تسخیر حد تک اپنے قدم جما چکا تھا۔

صوبے بننے سے مافیاز مضبوط ہوتے گئے

صوبے بننے سے سب سے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ ایک تو قوم پرستی کی سیاست پنپنے سے ملک کے شہریوں میں آپس کی نفرت پیدا کی جا چکی تھی، دوسرے ہر صوبہ میں سیاسی پارٹیوں خصوصاً قوم پرست جماعتوں، بیوروکریسی، جاگیرداروں، سرداروں کا آپس میں گٹھ جوڑ مضبوط ہو چکا تھا۔ صوبوں میں زمینوں پر قبضے، کرپشن، لوٹ مار، ٹیکس چوری، منشیات فروشی، سمگلنگ کے گھناؤنے افعال میں ملوث عناصر کو نہ تو ججوں سمیت کوئی روک رہا تھا بلکہ قومی خزانے کو نقصان پہنچانے، معاشرے کو تباہی کی طرف لے جانے والے اور ملکی معیشت کو تباہ کرنے میں سبھی نے ایکا کر لیا تھا۔ اس طرح سے صوبوں میں سارے مافیاز کے مضبوط ہونے کی وجہ سے یہ مافیاز ملک کے ہر شعبے سیاست، تجارت، معیشت، تعلیم، صحت کے میدان میں اپنے پنجے مضبوط کر چکا تھا۔

جوں جوں یہ مافیا مضبوط ہوتا چلا گیا عوام پر ٹیکس لگا لگا کر اور ان کی زندگی ہوش ربا مہنگائی سے اجیرن کر کے عام آدمی کو ہر شعبے سے پیچھے دھکیل دیا گیا۔ دولت کی فراوانی کی وجہ سے، جو صرف 20، 25 فیصد طبقہ کے پاس تھی امیروں کے لئے مہنگے ترین تعلیمی ادارے قائم ہونا شروع ہوئے، فورسٹار ہوٹلوں کی طرز پر مہنگے ہسپتال وجود میں لائے گئے۔ عام طبقے کا اعلیٰ تعلیم، ڈاکٹر، انجینئر بننے کا خواب پورا ہونا ممکن نہ رہا۔ اعلیٰ ملازمتوں میں بھی اس طبقہ کو پیچھے کی طرف دھکیل دیا گیا۔ سفارش، خلاف میرٹ تقرریاں اور اقرباء پروری کو فروغ حاصل ہوا۔

مذہبی مافیا عسکری قوت بن کر گیا

ایک طرف سیاسی، قبضہ گیر، صنعت کار، عوام کا معاشی ناطقہ بند کرنے والا مافیا تھا تو دوسری طرف مذہبی فرقہ پرست مافیا وجود میں آتا چلا گیا۔ ہر فرقہ اپنی سیاسی، مذہبی جماعت بنا کر سکرین پر رہنے کے لئے مذہبی بلیک میلر کی صورت میں سامنے آیا۔ 68 سال میں کسی مذہبی جماعت یا گروپ نے سنجیدگی اور مخلصی سے ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے تو جدوجہد نہیں کی، فحاشی و عریانی کے خلاف بند باندھنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنے مذہبی، سیاسی اور فرقہ پرستی کے مفادات کو ہی پیش نظر رکھا۔ ملک کی تعمیر و ترقی میں رکاوٹ بننے کے لئے لوگوں کے ذہن میں فتور بھر کر انہیں سڑکوں پر لے آتے۔ حال اس مذہبی مافیا کا یہ ہے کہ ظاہراً تو مسلمانوں کا روپ چڑھائے ہوئے لیکن ان کے دلوں میں ہر مخالف کے لئے کدورتیں بھری ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کو ہمیشہ ہی فرقہ پرستی اور قوم پرستی نے جتنا نقصان پہنچایا اسلام دشمن طاقتوں نے بھی کبھی نہ پہنچایا ہوگا۔

مدارس دہشت گردوں کی پناہ گاہیں

شیعہ سنی کی بڑھتی ہوئی محاذ آرائی خونی جنگ میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ پیسے نے ہر قسم کی دہشت گردی، مسلمانوں میں نفرت کے الاؤ جلانے اور آپس کی نااتفاقی کے عمل کو تیز تر کیا۔ وہ مدارس جہاں اللہ اور اس کے رسولؐ کے دین کا درس دیا جاتا تھا دہشت گردوں کی پناہ گاہیں بن کر رہ گئے۔ ایک تو فرقہ واریت کے عمل کو بڑھانے اور دوسرے نفاذ شریعت کا واویلا کھڑا کر کے طلباء کی عسکری تربیت کی جانے لگی۔ ان مذہبی جماعتوں مدارس کو غیر ممالک سے ان کے ہم فرقہ ممالک کی مالی امداد وسیع پیمانے پر دی جاتی تھی۔ علماء کی تربیت پُرامن شہری کے طور پر کرنے کی بجائے جنگجوانہ انداز میں کی جانے لگی۔ دنیا کی واحد ایٹمی طاقت کی مسلح افواج کے جوان 18 کروڑ نفوس پر مشتمل ملک کو بچانے کے لئے اپنی جان تک نچھاور کرنے سے گریز نہیں کرتے رہے۔

طالبان کے کئی گروپ انڈیا اور دیگر ممالک سے پیسہ لے کر پاکستان میں دہشت گردی، بم دھماکوں، تخریب کاری میں ملوث تھے۔ ان گروپوں نے نفاذ شریعت کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا اور پاکستانی حکومت کو امریکہ کا ساتھی گردانتے تھے۔

ملک میں موجود بڑی مذہبی جماعتیں ہمیشہ ہی ان کے بارے میں واضح اور ٹھوس پالیسی اپنانے کی بجائے منافقت بھرا کردار ادا کرتی رہیں۔ بیت اللہ محسود جیسے پاکستان دشمن کی زیر قیادت جس طرح سے ملک کو دہشت گردی کے ذریعے نقصان پہنچایا جاتا رہا۔ وہ ایک دل خراش داستان اور اس مذہبی ٹولہ کے اوپر بدنما سیاہ دھبہ ہے لیکن اس بیت اللہ محسود کے مارے جانے پر جماعت اسلامی کے سابق امیر سید منور حسن دوڑے دوڑے اس کے جنازے میں شرکت کرنے پہنچے۔ ان کی منافقت کا اندازہ آپ اس بات سے کریں کہ نائن الیون کے بعد ساری دنیا کا زبردست دباؤ ہونے کی وجہ سے اسی جماعت کے امیر قاضی حسین احمد طالبان کے خلاف اخبارات میں مضامین لکھتے بھی پائے جاتے رہے۔ یہی حال مولانا فضل الرحمان کا ہے جنہوں نے ایک مرتبہ جوش خطابت میں بیان دے دیا کہ امریکہ کے ہاتھوں کتا بھی مارا جائے تو شہید ہے لیکن ملک کی خاطر جامِ شہادت نوش کرنے والے جانبازوں کے حق میں ان کے منہ سے کبھی کلمہ خیر نہیں نکل سکا۔ ایک ہی وقت میں کبھی طالبان کے خلاف اور کبھی ان کے حق میں بیانات کی وجہ سے عوام ایسی تحریکوں سے متنفر ہو چکے ہیں جس میں شریعت کے نفاذ کا لبادہ اوڑھ کر بے گناہ بچوں، خواتین، بوڑھوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ وزارت داخلہ کی حالیہ رپورٹ کے مطابق ملک کے 285 مدارس کو سعودیہ، ایران، قطر، ترکی، عراق اور کویت سے فنڈنگ کی جا رہی ہے لیکن ان فنڈز کا استعمال اگر دہشت گردی یا غلط مقاصد کے لئے کیا جائے تو ان حرکات سے دنیا کو کیا پیغام جائے گا؟

حقوق کی بات، فرائض سے رُوگردانی

ہر طبقہ اپنے فرائض سے تو ہمیشہ اجتناب کرتا رہا لیکن اپنے حقوق یا مطالبات کے لئے خم ٹھونک کر میدان میں آنا اپنا حق سمجھتا رہا۔ عرصہ دراز سے ملک میں ینگ ڈاکٹرز نے اپنے ناجائز مطالبات کی صورت میں جس طرح سے انسانیت کا قتل عام کرنا شروع کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ کئی کئی روز ان ہسپتالوں میں تالے لگا دینا جہاں مریض موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں ان کی خبر گیری یا میڈیکل ٹریٹمنٹ یا انہیں ادویات کی عدم فراہمی جیسے مکروہ فعل میں ملوث ہونا یا ایمرجنسی میں مرتے ہوئے مریض کو بھی چیک نہ کرنا شاید جنگل کے معاشرے میں بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ میں نے ان کے ناجائز مطالبات کا لفظ اس لئے لکھا ہے کہ ایک غریب اور قرضوں میں جکڑے ہوئے ملک میں ینگ ڈاکٹرز کو بہت زیادہ مراعات حاصل ہیں۔ اب ڈاکٹری پاس کر کے فوری طور پر انہیں لاکھوں روپے تنخواہ دینا تو ممکن نہیں ہوسکتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ تجربہ اور قابلیت کی وجہ سے یہ سب کچھ حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح سے معاشرے کے جس کرپٹ طبقہ پر بھی ہاتھ ڈالا جاتا ہے وہ شور وغل اور واویلا شروع کر دیتا ہے۔ گزشتہ چند ماہ میں پنجاب کے کئی شہروں میں ناقص اشیاء، خوراک تیار کرنے اور فراہم کرنے والے بڑے بڑے ریسٹورنٹ، ہوٹلوں پر چھاپے مارنے شروع کئے گئے اور کسی کو مری ہوئی مرغیاں، کسی کو کچن میں حشرات الارض کی بھرمار اور گندگی کی وجہ سے سیل کیا گیا تو اس مافیا نے ہائی کورٹ میں رٹ کر دی اور ججوں نے بھی عجیب مضحکہ خیز ریمارکس دیئے کہ کسی کی شہرت کو داغدار کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی حالانکہ اس سے براہ

راست عوام متاثر ہو رہے ہیں۔ دوسرے ملک میں ایف بی آر نے اربوں روپے کی ٹیکس چوری، ہوٹلوں یا دیگر جگہوں پر سیلز ٹیکس عوام سے تو بلوں میں وصول کئے لیکن قومی خزانے میں جمع نہ کرانے کے گھپلے پکڑے ہیں۔ اس طرح سے الیکٹرونکس مارکیٹوں میں سمگل شدہ کنٹینرز کے کنٹینرز کسٹم ڈیوٹی ادا کئے بغیر سامان پکڑا ہے۔ کپڑا مارکیٹوں اور دوسری جگہوں پر بھی اربوں روپے کا سمگل شدہ سامان ڈیوٹی ادا کئے بغیر بعض قومی خزانے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے والوں کو پکڑنے کا عمل تیز کیا ہے تو تاجر مافیا نے شور مچانا شروع کر دیا ہے کہ ہمارے کاروبار کو تباہ کیا جا رہا ہے اور یہ قومی معیشت کے لئے نقصان دہ ہے۔ یہی مافیا اس سمگل شدہ اشیاء یعنی ناجائز کمائی سے پلازوں پر پلازے کھڑے کر رہا ہے، نئے نئے بنگلوں کی خرید وفروخت کر رہا ہے، صرف اور صرف قومی خزانے کو شدید نقصان پہنچا کر اور خزانہ خالی ہونے بر نزلہ صرف اور صرف غریب عوام پر گرتا ہے۔ کبھی گیس، کبھی بجلی اور کبھی پٹرول کے نرخ بڑھا کر۔

ملک میں لاکھوں کی تعداد میں اپنے اوپر ظلم وستم ہونے والے عوام پہلے پولیس کے تھانوں میں چکر لگانے اور بعد میں انصاف کی تلاش میں عدالتوں میں اپنی جوتیاں گھسیٹتے عمر کا زیادہ حصہ ضائع کر دیتے ہیں لیکن نہ تو مظلوم کو کسی قسم کا ریلیف ملتا ہے اور نہ ہی عدالتیں انہیں انصاف فراہم کرتی ہیں۔ آئے روز جج حضرات معاشرے کی حالت زار، یہاں ہونے والی لوٹ مار اور کرپشن اور عوام پر روا رکھے گئے ظلم وتشدد کے بارے میں بڑے خوبصورت ریمارکس دیتے نظر آتے ہیں اور عوام ان اعلیٰ ترین مسندوں پر بیٹھی بااختیار شخصیات کے اس عزم پر چونک اٹھتے ہیں اور ایک موہوم سی امید ان کے دل میں اٹھتی ہے کہ اب شاید ان کے دکھوں کا مداوا ہو سکے گا لیکن بیانات کی حد تک ہی سب کچھ ہوتا ہے۔

سرکاری محکموں کے مافیا سے تو روزانہ لاکھوں نہیں کروڑوں لوگوں کو واسطہ پڑتا ہوگا۔ کس کس محکمہ، کس کس عہدیدار کی بات کی جائے، پٹواری سے لے کر تحصیلدار، میٹر ریڈر سے لے کر ایس ڈی او، تعلیم، صحت، بلڈنگز، ایکسائز، انہار۔ غرضیکہ ہر شخص عوام کا کام کرنے کے لئے رشوت کے بغیر حرکت میں ہی نہیں آتا۔

صحافت مافیا کے شکنجے میں

صحافت کو معاشرے کی آنکھ اور کان کہا جاتا ہے۔ پہلے ہمیشہ اخبارات، میگزین، ڈائجسٹ کے مالکان میں صرف اور صرف صحافی ہی اترتے تھے، اب اخبار ورسائل کے فیلڈ میں کروڑوں اربوں روپے کی سرمایہ کاری کی وجہ سے صحافی ہی اس فیلڈ سے آؤٹ ہو چکا ہے اور تعلیم، صحت، انڈسٹری سے کروڑوں روپے کمانے والا مافیا صحافت کا بھی اَن داتا بن کر بیٹھ گیا ہے اور صحافی اس کا تنخواہ دار ملازم بن کر رہ گیا ہے اس لئے عوام کی آواز اور لوٹ مار کی بے نقابی اس حد تک ہی میڈیا میں ہوتی نظر آتی ہے جس حد تک صحافتی مافیا اپنے مفادات کی وجہ سے اجازت دیتا ہے۔ سرکاری افسران، جرنیل اور جج حضرات تو ہر دور میں ہی طاقتور رہے ہیں۔ اب کروڑوں اربوں کی جائیدادیں بنا کر انہیں اپنے سے نیچے دیکھنے کی نہ تو فرصت ہے اور نہ ہی ضرورت۔

گیس، بجلی، بینکوں کے نادہندگان

آئے روز بجلی، گیس، پٹرول بڑھانے کی وجوہات میں سب سے اہم وجہ اربوں روپے کے واجبات کی عدم وصولی یا گیس اور بجلی کی چوری ہے۔ ہر حکومت خواہ وہ فوجی ہو یا سیاسی ان مافیاز کے خلاف کارروائی کرنے سے قاصر رہی کیونکہ اربوں روپے کے نادہندگان خواہ وہ بجلی، گیس کے ہوں یا بینکوں سے قرضہ لے کر واپس نہ کرنے

والے ہوں یا اربوں روپے کا ٹیکس دبائے بیٹھے ہوں، یہی لوگ اسمبلیوں میں عوامی نمائندوں کی صورت میں بھی بیٹھے ہیں۔ بڑے بڑے صنعت کاروں، کاروباری حضرات کی صورت میں موجود ہیں۔ حکومت ان پر ہاتھ نہیں ڈالتی کیونکہ یہی لوگ قانون بنانے والے، اسمبلیاں ان کی، عدالتیں ان کے حکم کی تابع، سرکاری افسران (ہاتھ ڈالنے والے) حکومت کے بندے بھی مل جل کر اس ملک کو کھاؤ پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔

مصلحتوں کی خاطر اربوں کی بجلی چوری یا گیس کے بل ادا نہ کرنے والوں پر ہاتھ نہیں ڈالا جاتا۔ فاٹا، قبائلی علاقے کا کوئی شخص بجلی کا بل نہیں دیتا، بلوچستان میں گیس کے 90 فیصد بل ادا نہیں کئے جاتے۔ یہی حال اندرون سندھ اور کراچی میں کنڈے ڈال کر بجلی چوری کرنے والوں کا ہے۔ قانون خود ہی کسی قسم کا ایکشن نہ لے کر اس مافیا کو مضبوط اور قانون کو کمزور کرنے کا باعث ہے۔ بجلی پیدا کرنے والی کمپنیاں (آئی پی پی ایز) مافیا غریب ملک کے غریب عوام کو 14 روپے سے 18 روپے یونٹ تک بجلی فراہم کر رہا ہے جبکہ ملک میں ہائیڈل (پانی کے ذریعے) بجلی پیدا کرنے کی لاگت 1.60 روپے فی یونٹ ہے۔ مہنگی بجلی دے کر ملکی معیشت تباہ کرنے، عوام کو برباد کرنے والے اس مافیا کے پیچھے کون سے ہاتھ ہیں جو ڈیم (سستی بجلی) نہیں بننے دیتے۔ عرصہ 25 سال سے لٹکتے کالا باغ، نیلم جہلم اور تیار ہونے کے باوجود کام نہ کر سکنے والے نندی پور ڈیم کی مثالیں سامنے ہیں۔

منافع خوری، ملاوٹ مافیا

ہم یہودی اور ہندو منافع خوروں کی مثال دیتے تھے۔ آج مسلمان ملک کے دیندار کاروباری لوگوں کا حال یہ ہے کہ منافع کی انتہا خوری میں ہنود و یہود کو ہم پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ 300 فیصدی سے لے کر 500 فیصد تک منافع تاجر، صنعت کار، امپورٹر غریب قوم کے عوام سے حاصل کر کے خود تو محلات کی تعمیر کرنے میں مصروف اور آئے روز عمرے پہ عمرہ کرنے کی دوڑ میں شامل لیکن عام آدمی کی کھال کھینچنے کا عمل رکتا نظر نہیں آ رہا۔ ملاوٹ مافیا اس قوم کو مردہ جانوروں، گدھوں تک کا گوشت تو کھلا رہا ہے۔ انسانی زندگی سے کھیلنے والی ادویات، انجکشن تک جعلی یا دو نمبر بک رہے ہیں۔ ان کی سر عام فروخت کی اجازت کون دیتا ہے؟ ان جعلی ادویات، اشیاء کی تیاری کس طرح ممکن ہے؟ یعنی اس ملک کے عوام کی صحت کو بھی تباہی سے دوچار کرنے کا سلسلہ جاری اور اس مافیا کے ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں۔ پانی کی فراہمی حکومت کا فرض ہوتا ہے۔ ویسے تو دیہات خصوصاً بلوچستان اور سندھ میں عوام کو پانی تک میسر نہیں ہے لیکن کراچی جیسے ڈیڑھ کروڑ کی آبادی والے شہر میں پانی کی سپلائی کرنے والا ٹینکر مافیا لوگوں کی جیبوں سے کروڑوں نکلوا کر ڈاکہ ڈال رہا ہے۔ گھی، دالوں، آٹے تک میں ملاوٹ کرنے والا مافیا بھی ہٹ دھرمی سے اپنا مکروہ دھندہ انجام دینے میں مصروف ہے کیونکہ اسے پتہ ہے کہ دے دلا کر اس ملک میں سب کچھ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ان سب مافیاز کے حوصلے بلند ہیں۔ کسانوں سے سستی روئی، گنا لے کر مہنگے داموں فروخت کر کے اربوں روپے کمانے والا شوگر، ٹیکسٹائل، سیمنٹ، مافیا آج اسمبلیوں میں عوام کی گردان کرتے نہیں تھکتا۔

جمہوریت (اسمبلیاں) مافیاز کے شکنجے میں

آج یہ وقت آ چکا ہے کہ لینڈ مافیا، شوگر، ٹیکسٹائل، صنعت کار مافیا، علاوہ جاگیردار، سردار مافیا اسمبلیوں میں بیٹھا ہے۔ ایک ہی سیٹ پر الیکشن میں 50-50 کروڑ خرچ کرنے والے سے قوم کی خدمت کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟ دیکھنا تو یہ ہے کہ وہ اتنی رقم اسمبلی ممبر بننے کے

لئے کیوں خرچ کر رہا ہے۔ شاید اس سے کئی گنا زیادہ مال کمانے کی خاطر یعنی سیاست آج بہترین کاروبار بن کر رہ گئی ہے۔ ایک لگاؤ چار کماؤ کے جوئے کے فارمولے کی طرح۔ جمہوریت سے جمہور (عوام) تو آؤٹ ہو چکے ہیں۔ عام طبقہ کا کوئی شخص الیکشن میں کھڑا ہونے کی سوچ نہیں سکتا، تو ایسی جمہوریت جس میں عام شخص کا داخلہ ہی بند کر دیا جائے۔ ان کا بیڑہ غرق پروگرام کو جاری رکھا جائے تو بادشاہت بہتر ہے۔ بادشاہ اپنی نیک نامی کی خاطر انصاف تو کرتے تھے۔ عوام کی روٹی روزی کا بھی خیال کیا جاتا تھا۔

جمہوریت تباہ، معیشت برباد، عوام بدحال

ان سارے مافیاز کے ہاتھوں معاشرے، جمہوریت، عوام اور معیشت کا جو حال ہوا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ میں بار بار عرصہ 46 سال کا ذکر اس لئے کرتا ہوں کہ جنرل ایوب خان کے جانے کے بعد سے یہ ساری خرابیاں، بربادیاں، تباہیاں، مسلسل جاری ہیں اور کوئی بھی اسے روکنے کی ہمت نہیں کر پا رہا۔ مافیاز کے ہاتھوں ہی ملک کی معیشت تباہ و برباد ہو کر رہ گئی ہے۔ کرپشن اور لوٹ مار کی وجہ سے خزانے خالی، ٹیکس چوروں اور نادہندگان کی وجہ سے بجٹ ہمیشہ ہی خسارے میں۔ بیرون ملک سے 66 ارب ڈالر (6600 ارب روپے) اور اندرون ملک بینکوں سے 12000 ارب روپے کے قرضوں تلے ملک جکڑا گیا ہے۔ ارکان اسمبلی سرکاری افسروں کی مراعات، گاڑیاں، کوٹھیاں بیرون ملک سے لئے گئے قرضوں سے دی جا رہی ہیں یا بجلی، گیس، پٹرول و دیگر اشیاء کے نرخ بڑھا کر عوام کی کمر توڑ پروگرام پر عمل کرتے ہوئے یہ تمام وسائل حاصل کئے جا رہے ہیں۔ صنعت کار اور کاروباری طبقہ پلازوں، گاڑیوں اور پلاٹوں کی قطار در قطار کھڑا کرتا جا رہا ہے۔ عوام دو وقت کی روٹی سے بھی محروم ہیں اور دوا دارو کے لئے ایڑیاں رگڑنے پر مجبور۔ اسمبلی میں ان کی آواز نہ کوئی بلند کرتا ہے نہ کوئی سنتا ہے۔ مافیاز کی بالادستی ختم کرنے، ملک میں کرپشن اور لوٹ مار کے آگے بند باندھنے کے ذمہ دار ارکان اسمبلی ہی گھٹنے گھٹنے تک کرپشن میں ملوث ہیں۔ کیا یہ مجرم اپنے آپ کو ہی پکڑ سکیں گے؟ باقی رہے دو طاقتور اور بااختیار طبقے فوج اور جج حضرات نہ جانے وہ کس بات سے خوفزدہ ہیں یا گھر پھونک تماشا دیکھنے میں کس قسم کی مصلحت ان کے سامنے آڑے آ رہی ہے؟ ہر قسم کا عذاب، ہر قسم کا بوجھ عوام پر ہی پڑ رہا ہے۔ خواہ اس مافیاز کے ٹیکس چوری، بجلی چوری کرنے کا ہو یا قرضے ہڑپ کرنے کا۔ گھی، چینی، سیمنٹ کے نرخ بڑھانے سے پڑنے والا بوجھ ہو یا ادویات کے من مانے نرخ وصول کرنے کا تختہ مشق عوام خصوصاً غریب عوام ہی ہیں۔

قوم اپنی آزادی کے 69ویں سال میں داخل ہو چکی ہے۔ اس عرصہ میں دوسری اقوام ستاروں پر کمندیں ڈال رہی ہیں اور ہم ابھی سوچ ہی رہے ہیں کہ کروڑوں بچوں کو تعلیم کی روشنی سے کس طرح روشناس کرانا ہے۔ 7½ کروڑ غربت سے نچلی سطح پر افراد کو دو وقت کی روٹی کس طرح سے فراہم کرنی ہے؟ کروڑوں افراد کو بیماریوں اور موت کے منہ میں جانے سے بچانے کے لئے مطلوبہ ادویات بمعہ عملہ کا انتظام کس طرح سے کرنا ہے؟ ملک میں عرصہ 46 سال سے جاری لوٹ مار، کرپشن، ملاوٹ جیسی خرابیوں کو کس طرح سے ختم کرنا ہے؟ ملک کو غیر ملکی قرضوں سے نجات کس طرح سے دلانی ہے؟ عام آدمی تک انصاف کی فراہمی کا کام کب ممکن بنانا ہے۔ قانون پر کب سے عمل درآمد شروع کرانے کی ابتدا کرنی ہے؟ بجلی، گیس کی کمی پوری کر کے ملکی معیشت کی تباہی کے عمل کو کس طرح سے روکنا ہے؟

□◆□

غزل

دستگیر شہزاد

خیال و خواب کے سب سلسلے اُس تک جاتے ہیں
حدیثِ دل لکھوں تو واقعے اُس تک جاتے ہیں

وہ دشتِ ہول سے گزریں کہ جان و دل کی بستی سے
تمناؤں کے سارے قافلے اُس تک جاتے ہیں

سرور و بادہ و مستی کی جب بھی بات چلتی ہے
سبو و جام کیا ہیں میکدے اُس تک جاتے ہیں

دوست اب تو یہ عالم ہے کہ جب بھی شعر کہتا ہوں
مضامین و ردیف و قافیے اُس تک جاتے ہیں

وہ مجھ کو ڈھونڈتا رہتا ہے جاؤ اُس سے یہ کہہ دو
مجھے پانے کے سارے راستے اُس تک جاتے ہیں

میں اس نامہرباں دنیا سے تھک جاتا ہوں جب شہزادؔ
تو آنکھوں کے یہ تشنہ آئینے اس تک جاتے ہیں

ایک پاکستانی بچے کی ملی غیرت کا ایمان افروز واقعہ۔ اس نے پاکستانی پرچم کی توہین کرنے پر ہندو میجر کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔

بچہ اور پرچم

☆ رضوان قیوم

ایک ریٹائر بھارتی اعلیٰ فوجی آفیسر بریگیڈیئر پریم ستیش نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد 1974ء میں اپنی ملٹری سروس کے حوالہ سے ایک یادداشتی کتاب لکھی ہے۔ اس کا نام "Remember" ہے۔

اپنی کتاب کے ایک حصے میں وہ لکھتا ہے کہ یہ 23 نومبر 1971ء کی بات ہے کہ مجھے میرے کمانڈنگ آفیسر نے اپنے دفتر میں بلا کر آرڈر جاری کرتے ہوئے کہا کہ تم نے چٹاگانگ کے مضافاتی علاقہ میں پاکستانی 14 بٹالین کی ٹکڑی پر شب خون مارنا ہے۔

''تم نے رات 3 بجے تین اطراف سے حملہ کرنا ہے''۔ اس نے مجھے تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہماری اطلاعات کے مطابق اس پاکستانی ملٹری کے پاس اسلحہ تقریباً ختم ہو چکا ہے اور ان کے کل فوجیوں کی تعداد صرف 25 کے قریب ہے۔ ہمارے مکتی باہنی کے مخبروں کے مطابق پاکستانی فوج کی یہ ٹکڑی ہمارے مکمل گھیرے میں ہے''۔ پھر کرنل نے مجھے اس علاقے کا نقشہ دیا۔

میں نے اس علاقے کا نقشہ میز پر پھیلا دیا۔ جھک کر اس کا بغور مطالعہ کیا تو مجھے نقشہ کو دیکھ کر یہ نظر آیا کہ جس علاقہ پر مجھے حملہ کرنے کا ٹاسک دیا گیا ہے وہاں کہیں کہیں آبادی ہے جو کہ زیادہ تر مزدور قسم کے لوگوں کی ہے اور اس علاقہ کے زیادہ تر باسی پاکستان اور اس کی فوج کے وفادار ہیں اور ان کا تعلق غیر بنگالیوں سے ہے۔ کمانڈنگ آفیسر کے مطابق یہ ایک آسان ٹارگٹ تھا اور اسے یقین تھا کہ اس علاقہ میں ہمارا حملہ کاری رہے گا اور ہمیں کامیابی حاصل ہوگی اور پاکستانی فوج کی جانب سے مزاحمت نہ ہونے کے برابر ہوگی۔

بہرحال میں نے پوری تیاری کے ساتھ مذکورہ علاقے میں موجود پاکستانی فوجی ٹکڑی پر دو اطراف سے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

حملہ کیا۔ میرے ساتھ 150 جدید اسلحہ سے لیس جوان تھے۔ ہماری جانب سے اچانک کیے گئے شدید حملہ کو خلافِ توقع پاکستانی فوج کی تھوڑی سی نفری نے بہت کم ہتھیاروں کے ساتھ بڑی دلیری سے نہ صرف روکا بلکہ بڑی چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارے چند سپاہیوں کو ہلاک کر کے ان سے کچھ بھاری اسلحہ بھی چھین لیا تھا اور اسی سے انہوں نے ہم سے پامردی سے مقابلہ کیا بلکہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ قدرت پاکستان کی فوج پر یوں مہربان ہو گئی کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ وہاں کی زمین کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ذرا سا بارش پڑنے سے فوری طور پر دلدل کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ ہمارے فوجی اس دلدل میں نہ صرف بُری طرح دھنس گئے بلکہ ان کی اکثریت پاکستانی فوج کی جانب سے کی گئی جوابی کارروائی کے نتیجے میں مارے گئے۔ میں نے بُرے حالات کا ادراک کرتے ہوئے اپنے سپاہیوں کو پسپا ہونے کا اشارہ دیا۔

ہمارے سپاہیوں نے پسپا ہوتے وقت اس علاقے کے کچھ لوگوں کو پکڑ لیا۔ ان کے بارے میں شک تھا کہ یہ پاکستان کے حمایتی ہیں اور انہوں نے بھارتی فوج کی آمد کے متعلق مخبری کر دی تھی۔ ان میں مردوں کی تعداد تیرہ تھی۔ ان میں ایک بچہ بھی تھا اس کے باپ، بھائی کو مزاحمت کرنے پر ہم نے گولی مار دی تھی۔ ہم نے ان پکڑے گئے غیر بنگالیوں سے پاکستانی فوج کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا تھی یعنی ان کی پوزیشن، تعداد، اسلحہ کے بارے میں معلومات درکار تھیں۔

ان لوگوں سے ہمارا ایک میجر شنکرم ستندم کمار پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ ہمیں پکڑے گئے ان لوگوں سے اپنے مقصد کی کافی مفید معلومات مل رہی تھیں۔

ایک گھر سے پاکستانی پرچم بھی ملا تھا۔ اس پرچم سے ایک نوجوان کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے تھے کیونکہ وہ خطرناک نظر آ رہا تھا۔ جب اس سے پوچھ کی گئی تو اس نے کسی قسم کا تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیا اور ستندم کے منہ پر تھوک دیا۔ ستندم اپنے ماتحت فوجیوں کے سامنے یہ توہین برداشت نہ کر سکا اور اس نے مشتعل ہو کر اس نوجوان کو شوٹ کر دیا۔ وہ نوجوان سینے پر تین گولیاں کھا کر منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر پاکستانی پرچم سے بندھے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ نوجوان دم توڑ گیا مگر اس کی آنکھوں میں جو نفرت تھی وہ مرنے کے بعد بھی قائم تھی۔ ستندم کمار کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ مرنے والے کے ہاتھوں پر بندھا پاکستانی پرچم کھول لائے۔ سپاہی نے پرچم کھول کر ستندم کو پیش کر دیا۔

''یہ میرے جوتے صاف کرنے کے کام آئے گا''۔ اس نے پرچم لے کر تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

پھر اس نے کھلم کھلا پاکستانی پرچم کے بارے میں کچھ نازیبا کلمات کہے۔ تو وہاں کھڑے قیدیوں میں موجود بچے کو غصہ آ گیا۔ اس بچے کا نام یونس تھا۔ یونس نے آگے بڑھ کر میجر ستندم کو کہا کہ تم میرے ملک کے قوم پرچم کے بارے میں یوں نازیبا کلمات نہ بکو۔ میجر ستندم نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پہلے تو اسے ڈانٹا اور پھر غرور میں چڑاتے ہوئے پاکستانی پرچم کو اپنے فوجی بوٹوں پر مار کر گرد جھاڑنی شروع کر دی۔ یونس نے برق رفتاری سے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ میجر ستندم کے منہ پر جڑ دیا۔ میجر ستندم اور وہاں موجود سب لوگ ششدر رہ گئے۔

''گولی مار دو اس باسٹرڈ کو''۔ میجر ستندم نے بھڑک کر حکم دیا۔ سپاہیوں نے گنیں تان لیں۔

''سٹاپ!'' میں نے چلا کر کہا۔ ''خبردار! اس بچے کو گولی نہ مارنا''۔ میں نے حلقہ بنائے کھڑے اسلحہ تانے سپاہیوں کو چلاتے ہوئے کہا۔ ''اسے گرفتار کر لو''۔

یونس کو ہمارے سپاہیوں نے سختی سے اپنے قابو میں کر لیا۔

''اسے میرے پاس لے کر آؤ''۔ میں نے بچے کو قابو کیے سپاہیوں سے کہا۔ بچہ ابھی تک شدید غصہ میں مچل رہا تھا۔

''تم نے ہمارے آفیسر کے منہ پر تھپڑ کیوں مارا؟'' میں نے غصے سے تلملاتے بچے سے پوچھا۔

''تم بھارتیوں نے میرے ملک پر حملہ کیا''۔ جواباً یونس نے شدید غصہ کے عالم میں اپنے منہ سے تھوک اڑاتے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''میرے باپ اور بھائی کو مارا۔ تم بڑے ظالم ہو۔ مجھے اپنے بھائی، باپ کی شہادت پر اتنا غصہ نہیں ہے، انہوں نے اپنا لہو اپنے وطن پر نچھاور کیا۔ مجھے اصل دکھ اس بات کا ہوا کہ ایک بھارتی دشمن میرے وطن کے پرچم کی بے حرمتی کر رہا ہے۔ یہ مجھ سے ہرگز برداشت نہ ہوا۔ میں نے بس اپنے ملک کے پرچم کی محبت میں یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ تم مجھے بھی گولی مار دو گے، اس سے زیادہ کیا کر سکتے ہو؟''

''دیکھو میجر!'' میں نے میجر ستندم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ بچہ اپنی موت کو سامنے دیکھتے ہوئے بھی اپنے وطن کے پرچم کی محبت کو نہیں بھولا۔ یہ نہ صرف بہادر بچہ ہے بلکہ یہ اپنے ملک کا وفادار بھی ہے۔ دیکھو، یہ اپنے دشمن کے ہاتھوں اپنے پرچم کی بے حرمتی برداشت نہ کر سکا۔ کاش! ہم بھی اپنے پرچم کی ایسے ہی عزت کر سکیں''۔

مجھے اس بچے کی یہ ادا دل کو لگی۔ بعد میں مَیں نے اپنی ذاتی کوششوں سے اسے محفوظ علاقے میں پہنچا دیا تھا۔

***

تاریخِ اسلام

وہ اور تھے یہ اور ہیں

اس واقعہ کی روشنی میں ذرا مملکتِ خداداد پاکستان کے حکمرانوں کے شاہانہ طرزِ حکمرانی کو دیکھیں تو شک ہونے لگتا ہے کہ ہم ان کی مفتوح قوم ہیں اور یہ حکمران طبقہ کسی اور قوم اور مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔

☆ حبیب اشرف صبوحی

موسم گرما کی ایک ٹھنڈی رات تھی، صحرائی علاقوں میں جہاں دن کے وقت دھوپ کی تمازت کے باعث ریت پر پاؤں نہیں رکھے جا سکتے، راتیں خوب ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ حسب معمول آج بھی شب کا کچھ حصہ آرام کرنے کے بعد مدینہ منورہ کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے۔ گشت کرتے کرتے آپ شہر سے باہر نکل آئے۔ دیکھا دور ایک جگہ ایک خیمہ میں دیا روشن ہے۔ فاروق اعظمؓ کے قدم تیزی سے اس خیمہ کی جانب بڑھنے لگے۔ قریب پہنچے تو دیکھا خیمہ کے باہر ایک شخص اپنا سر پکڑے پریشان بیٹھا ہے۔ فاروق اعظمؓ نے اسے سلام کیا لیکن وہ شخص تھا کہ جیسے اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ آپؓ نے دوبارہ بلند آواز سے کہا۔ السلام علیکم۔ لیکن وہ شخص اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا جیسے اسے کسی کی آمد کا کچھ علم ہی نہ ہو۔ اب فاروق اعظم اس کے بالکل قریب پہنچے۔ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے، آپ بہت پریشان معلوم ہوتے ہیں؟''

''ہاں''۔ اس شخص نے چونک کر سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں مسافر ہوں اور اس وقت سخت پریشانی کے عالم میں ہوں''۔ فاروق اعظمؓ نے کہا، اللہ خیر کرے، اپنی پریشانی بیان کرو۔ شاید میں تمہاری کچھ مدد کروں۔

تمہارا شکریہ! لیکن تم کیا مدد کر سکو گے؟ مجھے تو اپنی وضع قطع سے تم بہت ہی غریب آدمی معلوم ہوتے ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو اور مجھے ناحق پریشان نہ کرو۔

اتنے میں خیمہ کے اندر سے کسی عورت کے رونے کی آواز آئی۔ وہ بیچاری درد سے بُری طرح کراہ رہی تھی۔ فاروق اعظمؓ نے پوچھا کیا تمہاری بیوی بیمار ہے؟ مسافر بولا۔ ہاں، اسے اس وقت ایک دایہ کی ضرورت ہے۔ میں اس وجہ سے سخت پریشان ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ فاروق اعظمؓ نے فرمایا تم فکر نہ کرو، میں ابھی دایہ کا بندوبست کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔

مسافر سے یہ بات کر کے فاروق اعظمؓ تیزی سے اپنے گھر گئے۔ بیوی کو جگایا اور مسافر کی تمام مصیبت اس سے بیان کی۔ بیوی بولی۔ جلدی چلیں میں مسافر کی بیوی کی مدد کروں گی۔ فاروق اعظمؓ نے کہا۔ کچھ کھانے کا سامان بھی ساتھ لے لو خبر نہیں ان بیچاروں نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔

بیوی: اس وقت گھر میں تھوڑا سا آٹا اور زیتون کا تیل موجود ہے۔

فاروق اعظمؓ: کچھ اور اس کے علاوہ؟

بیوی: تھوڑا سا بکری کا دودھ بھی ہے۔

فاروق اعظمؓ: کچھ اور؟

بیوی: اللہ کی قسم اس کے علاوہ گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں۔

فاروق اعظمؓ: تم جلدی سے یہ سب سامان باندھو تا کہ ہم جلد ان لوگوں کی مدد کے لئے وہاں پہنچ سکیں۔

بیوی نے جلدی سے یہ سب سامان باندھا تو فاروق اعظمؓ نے گٹھڑی سر پر اٹھائی۔ اب دونوں تیز تیز مدینہ منورہ سے باہر صحرا کی طرف جانے لگے۔ وہاں پہنچے بدو اسی حال میں خیمہ سے باہر پریشان بیٹھا تھا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اسے سلام کے بعد کہا۔ میری بیوی کو خیمہ کے اندر جانے کی اجازت دیں تا کہ یہ آپ کی بیوی کی کچھ مدد کر سکے۔ مسافر نے کہا۔ میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی صورت میں میرے پاس ایک فرشتہ بھیج دیا ہے۔

فاروق اعظمؓ نے کہا۔ میں آپ کے لئے کھانا لایا ہوں، شاید آپ نے پریشانی میں کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔ یہ کہہ کر گٹھڑی سے کھانا نکال کر مسافر کے سامنے رکھا۔ مسافر واقعی بھوکا تھا۔ کھانا دیکھتے ہی جیسے اس کی جان میں جان آئی۔ فوراً کھانا شروع کر دیا۔ جب کھا چکا تو فاروق اعظمؓ سے مخاطب ہو کر بولا۔ کیا تم مدینے کے رہنے والے ہو؟

فاروق اعظمؓ: میری پیدائش مکہ معظمہ کی ہے۔

مسافر: تو مکہ سے یہاں کیوں آ گئے؟

فاروق اعظمؓ: اپنے آقا (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے ساتھ آیا تھا۔

مسافر: کیا تمہارے مالک نے تمہیں آزاد کر دیا ہے؟

فاروق اعظمؓ: انہوں نے مجھے مسلمانوں کی خدمت کا کام سونپا ہے۔

مسافر: کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے؟

فاروق اعظمؓ: الحمدللہ! میں عمر بھر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کروں تو اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

مسافر: تو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل سناؤ۔

فاروق اعظمؓ: آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خلق عظیم کے حامل تھے۔ قرآن مجید میں جا بجا آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اخلاق حسنہ مذکور ہیں۔

ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ خیمہ کے اندر سے نومولود کے رونے کی آواز آئی۔ اتنے میں خیمہ کا پردہ سرکا اور حضرت فاروق اعظمؓ کی بیوی کی آواز آئی۔

''امیرالمومنین! اپنے دوست کو مبارک باد دیں، اللہ تعالیٰ نے اسے فرزند عطا فرمایا ہے''۔

''امیرالمومنین'' کے لفظ سے مسافر چونکا۔ خوشی کی اتنی بڑی خبر سننے کے باوجود اس پر خوف کے مارے لرزہ طاری ہو گیا۔ کانپتے ہونٹوں سے بولا۔

''یا امیرالمومنین! مجھے معاف فرما دیجئے، میں آپ سے بڑی گستاخی کے ساتھ پیش آیا''۔

فاروق اعظمؓ نے اسے بچے کی پیدائش پر

مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا۔ تم کچھ فکر نہ کرو۔ تم ہرگز کسی گستاخی سے پیش نہیں آئے۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے تمہاری خدمت کے لئے بروقت یہاں بھیج دیا۔ اگر میں مدینہ منورہ میں اپنے گھر میں آرام سے پڑا سویا ہوتا تو یقیناً قیامت کے روز مجھ سے تمہاری اس پریشانی اور مصیبت کے بارے میں سخت سوال ہوتا۔ میرے آقا محمد رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم نے میرے ذمے یہی کام لگایا ہے کہ میں خلق خدا کی خدمت کروں۔ میں راتوں کو جاگتا ہوں تاکہ لوگ آرام سے سوئیں۔ میں نے اپنے آقا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ آپ نے ارشاد فرمایا: جو شخص حکمران ہو، اس کو سب سے زیادہ بھاری حساب دینا ہوگا اور سب سے زیادہ سخت حساب کے خطرے میں مبتلا ہوگا۔

مسافر نے دیکھا کہ امیرالمومنین حضرت فاروق اعظمؓ قیامت میں احتساب کے خوف سے زار و قطار رو رہے تھے۔ جب ان کی حالت ذرا سنبھلی تو آپؓ نے مسافر سے کہا۔ میرے بھائی! میرے لئے دعائے خیر کرتے رہنا۔ میری گردن میں امت محمدیؐ کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ مجھے ڈر آتا ہے کہ دریائے فرات کے کنارے بکری کا ایک بچہ بھی اگر ہلاک ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ مجھ سے اس کے بارے میں سخت بازپرس کرے گا۔

(بحوالہ الفاروق شبلی نعمانی، کنزالعمال جلد 5)

اس واقعہ کی روشنی میں ذرا مملکت خداداد پاکستان کے حکمرانوں کے شاہانہ طرز حکمرانی کو دیکھیں تو شک ہونے لگتا ہے کہ ہم ان کی مفتوح قوم ہیں اور یہ حکمران طبقہ کسی اور قوم اور مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔

❀❀❀

نامور قلمکار محمد رضوان قیوم کا نیا ناولٹ
پُراسرار، ناقابل یقین واقعات، سطر سطر تحیر سے بھرپور سچی کہانی
صدا
چھپ کر تیار ہے، آج ہی اپنی کاپی حاصل کریں۔
کامل سٹیشنری اینڈ گفٹ سینٹر D/820 نزد دعوت ہوٹل، راولپنڈی
خورشید بکس شاپ نمبر 17۔ اقبال مارکیٹ، کمرشل مارکیٹ، سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

ضربِ سکندری

ہمارا شاندار ماضی اور تاریخ

پوری تاریخ میں رحم اور برداشت کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ بادشاہت کے لالچ میں ہر بادشاہ کی اولاد نے اپنے باپ کے خلاف بغاوتیں کیں، بھائیوں میں جنگیں ہوئیں، لاکھوں کی تعداد میں لوگ قتل ہوئے،

☆ سکندر خان بلوچ
balochsk@yahoo.com

مسلمان دنیا کی وہ واحد قوم ہے جو آگے دیکھنے کی بجائے پیچھے دیکھتی ہے۔ جب دوسری قومیں مسلسل مستقبل کی بہتری کے لئے کام کر رہی ہیں تو ہم ماضی کی تاریخ میں ترقی کی روشن مثالیں ڈھونڈنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ہر بچے کو سکول میں پڑھایا جاتا ہے کہ ہمارا ماضی شاندار تھا۔ مگر یہ کوئی نہیں بتاتا کہ کون سا ماضی اور وہ کس طرح شاندار تھا؟ دوسری قومیں اپنی غلطیوں سے سیکھتی ہیں ہم شاندار ماضی کے سنہرے پردے کے پیچھے کبھی اپنی غلطیاں دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور جب تک غلطیوں کا تجزیہ نہیں کریں گے مستقبل شاندار نہیں بنایا جا سکتا۔ ہماری پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ ہی یہ ہے۔

آئیں، آج ذرا اپنی سنہری تاریخ پر نظر ڈالیں۔ شاید اُس راکھ میں سے کوئی چنگاری مل جائے یا کوئی نئی راہ نظر آ جائے۔

برصغیر کی تاریخ میں مسلمان 712ء میں محمد بن قاسم کی آمد کے ساتھ داخل ہوئے اور پھر اس نامور فاتح جرنیل کا اپنے ہی لوگوں نے جو حشر کیا وہ بھی تاریخ کا الگ سانحہ ہے۔ یہ بھی ہمارے شاندار ماضی کی ایک مثال ہے۔ بارھویں صدی کے وسط تک مسلمان پورے برصغیر کے حکمران بن گئے۔ اس کارنامے کا سہرا سلطان شہاب الدین محمد غوری کے سر جاتا ہے جس نے ہندوستان کو فتح کرنے کے بعد 1175ء میں یہاں پہلی مسلمان سلطنت قائم کی اور پھر کم و بیش انیسویں صدی یعنی 1857ء تک مسلمان تاریخ کے مالک رہے۔

یورپی اقوام جب تہذیب و تمدن اور ترقی کے لحاظ سے ہم سے بہت پیچھے تھیں معاشی طور پر بھوکی ننگی تھیں لیکن ہمارے بادشاہ عیش و عشرت میں مست تھے۔ جب یورپی اقوام یونیورسٹیاں بنا رہی تھیں، صنعتی انقلاب لا رہی تھیں ہمارے عاقبت نا اندیش سلطان تاج محل بنا رہے تھے۔ پھر ایک دن یورپ کی یہی بھوکی ننگی اقوام ہزاروں میل دُور سے آ کر برصغیر کی حکمران بن گئیں اور ہمارے دولت میں کھیلنے والے جہاں پناہ اُن کے غلام۔

برصغیر کی تاریخ میں مسلمان حکمرانوں میں سب سے زیادہ مضبوط اور طویل 1526-1857 تک دورِ مغلوں کا رہا ہے جو سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ لیکن

افسوس کہ اُن کی ذاتی تاریخ اس قدر خونچکاں اور بھیانک ہے کہ پڑھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اپنے والد اور بھائیوں تک کو نہ بخشا۔ اسی گھناؤنے پن کی وجہ سے پوری سلطنت ہاتھ سے نکل گئی اور ہم آج بھی اُسی راستے پر چل رہے ہیں۔ اُسی شاندار تاریخ پر عمل پیرا ہیں۔

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیرالدین محمد بابر نے ہندوستان 1526ء میں فتح کیا اور سلطنت مغلیہ کا بانی کہلایا۔ بیٹا ہمایوں بیمار ہوا۔ جب صحت یابی کی کوئی اُمید نہ رہی تو بیٹے کی بیماری خود لینے کی دعا کی جو قبول ہوئی اور یوں ہندوستان فتح کرنے کے محض چار سال بعد وہ مالک حقیقی سے جا ملا۔ بیٹا نصیرالدین ہمایوں تخت نشیں ہوا تو اُسے شیر شاہ سوری ٹکر گیا۔ ہمایوں میدان جنگ میں شکست کھا کر ایران کی طرف بھاگا اور 15 سال تک جلاوطنی کی زندگی گزارتا رہا۔ پندرہ سال بعد تخت دہلی دوبارہ حاصل کیا لیکن چند ماہ بعد ہی زینے سے سر کے بل گرا اور ہلاک ہو گیا لہٰذا اُس کا بیٹا جلال الدین محمد اکبر بچپن میں ہی بادشاہ بن گیا لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ ایک تو دین الٰہی ایجاد کر بیٹھا اور دوسرا اس کا اپنا پیارا بیٹا شہزادہ سلیم اپنے ہی باپ کے خلاف ہو گیا اور الٰہ آباد کی طرف بھاگ گیا۔ شہزادے نے اپنے ہی باپ کے خلاف بغاوت کی اور اپنے والد کے دیوانِ خاص ابوالفضل کو قتل کرا دیا۔ تین سال کی سخت مخالفت کے بعد گو باپ بیٹے میں صلح تو ہو گئی لیکن اکبر اس غم کو بھلا نہ سکا لہٰذا صلح کے تین سال بعد اندر اندر پریشانی میں وفات پا گیا۔ پیچش کی بیماری موت کا سبب بن گئی۔

شہزادہ سلیم بالقب نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ بنا تو اس کے اپنے بیٹے شہزادہ خرم نے اس کے خلاف بغاوت کر دی اور تین سال تک مغلیہ افواج آپس میں لڑتی رہیں۔ دونوں طرف سے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ بالآخر تین سال کی بیکار لڑائی کے بعد باپ بیٹے میں صلح ہو گئی لیکن دلوں کی میل اور کدورتیں نہ مٹ سکیں۔ اسی صدمے سے جہانگیر بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔

جہانگیر کی وفات کے بعد شہزادہ خرم بالقب ابوالمظفر شہاب الدین شاہجہاں کے نام سے بادشاہ بنا۔ بڑی بڑی شاندار عمارات بنوائیں لیکن نہایت زن مرید قسم کا بادشاہ ثابت ہوا۔ ساری عمر اپنی بیوی ممتاز محل کی خدمت میں لگا رہا۔ اُس سے 14 بچے پیدا کیے۔ اس کی محبت میں تاج محل بنوایا۔ شاہجہاں کی زندگی میں ہی چاروں بیٹے داراشکوہ، شاہ شجاع، شہزادہ مراد اور اورنگ زیب باپ سے باغی ہو گئے اور آپس میں جنگ شروع کر دی۔ یوں مغلیہ فوج کو بے پناہ نقصان پہنچا اور لاکھوں آدمی مارے گئے۔ بعد میں اورنگ زیب کے ہاتھوں تینوں بھائی مارے گئے اور اورنگ زیب اپنے ہی باپ شاہجہاں کو قید میں ڈال کر خود بادشاہ بن گیا۔ شاہجہاں 8 سال تک مسلسل قید کی صعوبت میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ اورنگ زیب نے اپنے بھائیوں کو بھی قید کیا اور پھر مختلف الزامات کے تحت انہیں قتل کرا دیا۔ دیکھا آپ نے کہ اس خالص مسلمان قسم کے بادشاہ نے کس طرح اپنے والدِ محترم کی خدمت اور بھائیوں سے محبت کا فرض نبھایا۔

اورنگ زیب کے تین بیٹے تھے۔ شہزادہ معظم، شہزادہ اعظم اور شہزادہ کام بخش۔ اورنگ زیب ایک سمجھدار حکمران تھا۔ بیٹوں کو غیر ضروری جنگوں سے بچانے کے لئے اُس نے اپنی زندگی میں ہی سلطنت بانٹ کر تینوں کو دے دی۔ لیکن بُرا ہو ہوس کا اورنگ زیب کے مرتے ہی بڑے بیٹے شہزادہ معظم نے کابل میں اور شہزادہ اعظم نے احمد آباد میں بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ہولناک جنگ ہوئی۔ شہزادہ معظم نے اپنے

بھائی شہزادہ اعظم کو معہ اس کے دو لڑکوں کے قتل کر دیا۔ بعد میں چھوٹے بھائی کام بخش کو دکن پہنچ کر مار دیا اور خود بہادر شاہ اوّل کے نام سے بادشاہ بن گیا۔ لیکن چند ہی سالوں میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ بہادر شاہ کی وفات کے ساتھ ہی بہادر شاہ کے چاروں بیٹوں عظیم الشان، رفیع الشان، جہان شان اور جہاندار شاہ میں جنگیں شروع ہوئیں۔ ہزاروں آدمی مارے گئے۔ بڑا بیٹا جہاندار شاہ سب بھائیوں کو شکست دے کر اور قتل کر کے بہادر شاہ دوم کے نام سے بادشاہ بن گیا۔

اسی دوران ہندوستان کی سیاست میں دو بھائی جو بادشاہ گر کہلائے سید برادران کے نام سے اُبھرے۔ ان میں سید عبداللہ خان پٹنہ کا گورنر تھا اور سید حسین علی خان الٰہ آباد کا گورنر۔ ان دونوں بھائیوں کو جہاندار شاہ کی بادشاہت پسند نہ آئی لہٰذا ان دونوں نے مل کر شہزادہ عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر سے بغاوت کرا دی۔ جہاندار شاہ کو شکست ہوئی لہٰذا بھتیجا فرخ سیر بادشاہ بن گیا۔ اُس نے اپنے چچا جہاندار شاہ اور اس کے فوجی سپہ سالار کو سولی پر لٹکوا دیا اور یہ موت سب کے لئے باعثِ عبرت بن گئی۔ چند ہی سال بعد سید برادران کا دل فرخ سیر سے بھی بھر گیا۔ انہوں نے اسے معزول کر کے قید کر دیا۔ قید میں اُس کی آنکھیں نکال دیں۔ تڑپا تڑپا کر اُسے بالآخر قتل کر دیا۔

سید برادران نے بہادر شاہ کے پوتے رفیع الدرجات کو پکڑ کر بادشاہ بنا دیا۔ یہ شخص ٹی بی کا مریض تھا۔ 2 ماہ بعد ہی سید برادران نے اُسے معزول کر کے قید کر دیا جہاں وہ ایک ہفتہ بعد ہی مر گیا۔ اب اورنگ زیب کے پوتے اور رفیع الدرجات کے بھائی رفیع الدولہ کو بادشاہ بنا دیا۔ اُس نے شاہجہاں ثانی کا لقب اختیار کیا۔ یہ شخص بھی ٹی بی کا مریض تھا اور چند ماہ بعد ہی خالق حقیقی سے جا ملا۔

''آؤ لمحے غلام کر لیں''

کی خالق ''حکایت'' کی مستقل لکھاری محترمہ نسیم سکینہ صدف کا نیا ناول

خواب سے عذاب تک

سالنامہ فروری 2016ء سے حکایت میں قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ پسماندہ طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان کی عجیب کہانی جسے انصاف کی تلاش تھی۔ مگر قانون اندھا تھا۔

ایک سلگتے ہوئے موضوع پر لہو رنگ تحریر

اب سید برادران نے بہادر شاہ کے پوتے جہان شاہ کو مسند شاہی پر بٹھا دیا۔ اس نے اپنا لقب محمد شاہ رکھا۔ اسے حکومتی کام سے کوئی غرض نہ تھی لہٰذا اقتدار عملی طور پر سید برادران کے ہاتھ رہا۔ محمد شاہ عورتوں اور شراب کا رسیا تھا۔ عیاشی میں اُسکا کوئی ثانی نہ تھا۔ سلطنت کے ٹکڑے ہو گئے اور بادشاہ سلامت اپنی عیاشیوں میں مگن رہے۔ اسی دوران نادر شاہ نے دِلی پر حملہ کیا۔ خون کی ندیاں بہا دیں۔ دہلی کو جی بھر کر لوٹا اور تختِ طاؤس ساتھ لے کر واپس ایران چلا گیا۔

محمد شاہ کی موت کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا جو عیاشی میں اپنے باپ سے بھی چند قدم آگے تھا۔ اسی دوران احمد شاہ ابدالی ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور لاہور تک کے علاقے پر قابض ہو گیا۔ احمد شاہ نے لڑنے کی بجائے یہ سارا علاقہ احمد شاہ ابدالی کے حوالے کر دیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد دکن کے گورنر غازی الدین اور مرہٹہ سردار ہولکر نے مل کر احمد شاہ کو پکڑا۔ اُس کی اور اس کی ماں کی آنکھیں نکال دیں اور جہاندار شاہ کے ایک بیٹے کو عالمگیر ثانی کے لقب سے بادشاہ بنا دیا۔ غازی الدین خود وزیر بن گیا لیکن چند سال بعد ہی غازی الدین نے اسے قتل کرا دیا۔ عالمگیر ثانی کے قتل کے بعد شہزادہ کام بخش کے بیٹے علی گوہر کو شاہ عالم ثانی کے نام سے بادشاہ بنایا گیا۔ اسی دوران سلطنت کا بیشتر حصہ انگریزوں کے زیرِ اثر چلا گیا اور تخت لاہور پر سکھ قابض ہو گئے۔ اس دوران غلام قادر روہیلہ نے دِلی پر قبضہ کر لیا۔ اُس نے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا دیں اور محمد شاہ کے پوتے بیدار بخت کو بادشاہ بنا دیا۔

غلام قادر روہیلہ نے تمام مغل شہزادیوں کو کھلے دربار میں لا کر رقص کرایا۔ چند ہی ماہ بعد مرہٹہ سردار سندھیا نے دِلی پر حملہ کیا۔ غلام قادر کو شکست ہوئی۔ سندھیا نے اُسے پکڑ کر اس کا منہ کالا کیا۔ گلے میں پرانے جوتوں کا ہار پہنایا اور ایک گدھے پر اُلٹا منہ بٹھا کر دِلی کی تمام گلیوں میں پھرایا گیا۔ بعد میں اُسے قتل کر کے جسم کے ٹکڑے کرا دیئے جو کتوں کے آگے پھینک دیئے گئے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے اکبر شاہ ثانی اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے وہ دونوں انگریز حکومت کے وظیفہ خوار تھے۔ بالآخر جنگ آزادی میں بہادر شاہ ظفر انگریزوں کے ہاتھوں قید ہو کر رنگون بھجوا دیا گیا جہاں وہ بقیہ عمر قید تنہائی میں شعر و شاعری کرتا رہا اور یوں سلطنت مغلیہ اپنے انجام کو پہنچی۔

تو یہ ہے ہمارا شاندار ماضی اور ہماری شاندار تاریخ۔ پوری تاریخ میں رحم اور برداشت کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ بادشاہت کے لالچ میں ہر بادشاہ کی اولاد نے اپنے باپ کے خلاف بغاوتیں کیں، بھائیوں میں جنگیں ہوئیں، لاکھوں کی تعداد میں لوگ قتل ہوئے، ہر شہزادہ خون کی ندیاں بہا کر اپنے بھائیوں اور اقربا کو قتل کر کے مسندِ بادشاہت تک پہنچا۔ ایسا آدمی بھلا عوام کی بھلائی کے لئے کب سوچے گا اور اس پر کب عمل کرے گا۔ اِس سارے دَور میں عوام کی بھلائی کہیں نظر نہیں آتی اور شاید یہ ان کا مقصد ہی نہ تھا۔ یہ ساری تاریخ قتل و غارت، ظلم و ناانصافی، سازشوں اور دشمنیوں سے پُر ہے۔ جو شہزادہ اپنے باپ، اپنے سگے بھائیوں کو برداشت نہیں کر سکتا وہ بھلا عوام کے لئے کیا سوچے گا۔

یہ اب قاری پر منحصر ہے کہ آیا ہمیں اِس پر فخر کرنا چاہیے یا شرمندہ ہونا چاہیے۔ بہر حال میری دعا ہے کہ ایسا شاندار ماضی یا شاندار مستقبل اللہ تعالیٰ اور کسی کو نہ دے۔ آمین!

◆✻◆

معاشرت اور قانون

خوابوں کے اسیر

''یہاں ہر کوئی اپنے اپنے خوابوں کا اسیر ہے۔ تم لوگ خالی خولی باتوں سے ان کو خوابوں کے طلسم سے نہیں نکال سکتے۔

☆ عارف محمود

ہمارے ہاں پیر پرستی کی جڑیں زمین کے اندر دور تک چلی گئی ہیں، اتنی گہرائی میں کہ اس جہالت کو جڑ سے اکھاڑنا ممکن نہیں رہا۔ پیروں کا ایک روپ تو وہ ہے جو ان کے مریدوں کو نظر آتا ہے اور مرید مشکل کے وقت اللہ اور رسولؐ کی بجائے اپنے اپنے پیر کو پکارتے ہیں اور ان کے آستانوں پر جا ماتھے رگڑتے ہیں۔ انہی پیروں کا ایک دوسرا روپ بھی ہوتا ہے جو اندھی عقیدت کے مارے مریدوں کو نظر نہیں آتا۔ یہ صرف جرائم پیشہ لوگوں، پولیس والوں یا مجھ جیسے قلمکاروں کو نظر آتا ہے۔ ان نام نہاد جعلی پیروں کے نورانی چہروں کے پیچھے چھپا ہوا شیطانی چہرہ صاف نظر آ جاتا ہے۔

''حکایت'' میں ہمیشہ جھوٹے پیروں، عاملوں اور ''شاہ صاحبوں'' کو بے نقاب کر کے لوگوں کو ان کا اصل چہرہ دکھایا گیا ہے۔ آج بھی میں ایک ایسے ہی جعلی پیر کا قصہ پیش کر رہا ہوں جس کی ابرو کا اشارہ لوگوں کی قسمت بدل دیتا ہے۔

ہوا یوں کہ ایک دوست کے بے حد اصرار پر کڑاہی گوشت کھانے کا پروگرام بن گیا اور ہم دونوں کڑاہی گوشت کے سلسلے میں مشہور علاقے لکشمی چوک جا پہنچے۔ آرڈر دے کر ہم کھانا تیار ہونے کا انتظار کرنے لگے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ ریسٹورنٹ کا بیرونی دروازہ اور دیواریں شیشے کی تھیں اور اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔

تھوڑی دیر ہی گزری ہو گی کہ ایک نئی پجارو جیپ باہر آ کر رکی۔ اس میں سے تین چار آدمی اترے اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں ایک دم دلچسپی سے ان کو دیکھنے لگا۔ ان کا انداز بڑا غلامانہ سا تھا اور پھر میں یہ دیکھ کر چونک پڑا کہ اتنی گرمی میں تنور کی طرح تپتے ہوئے فرش پر وہ ننگے پاؤں کھڑے تھے۔ ان کے کھڑے ہونے کا انداز ایسا فدویانہ تھا کہ میں نے اندازہ لگایا کہ پجارو سے جو بھی شخصیت برآمد ہونے والی ہے، ان لوگوں کے لئے انتہائی محترم ہے۔

پھر پجارو سے ایک شخص اترا۔ لمبا چوڑا قد کاٹھ، گھٹنوں تک پہنچی ہوئی سفید عبا، نیچے سفید چوڑی دار پاجامہ اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں۔ بھری بھری کالی سیاہ داڑھی، سرخ و سفید رنگ، کندھوں تک لٹکتے لمبے بال اور سر پر سبز رومال بندھا ہوا تھا۔ گلے میں چھوٹے بڑے منکوں کی مالائیں اور گلاب کے پھولوں کا ایک ہار پہنے وہ ایسا ہی نظر آ رہا تھا جیسا کسی پیر کا حلیہ پردۂ تصور پر ابھرتا ہے۔

ان پیر صاحب کے پیچھے دو اور آدمی بھی اترے۔ پھر دو عورتیں اتریں اور پھر پیر صاحب اپنے مریدوں کے جلو میں ریسٹورنٹ کے اندر آ گئے۔ جب وہ پیر نما شخص اندر آیا تو میں بڑے غور سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر میری طرف اٹھی تو چند ثانیوں کے لئے ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں بہت تھوڑے سے وقت کے لئے شناسائی کے تاثرات ابھرے اور پھر یکا یک معدوم ہو گئے۔ بالکل ایسے ہی جیسے گھور اندھیرے میں روشنی کی کوئی ننھی سے کرن چمک کے بجھ گئی ہو۔

یہ تاثر یکطرفہ نہیں تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونک سا گیا تھا اور پھر نظریں چرا لی تھیں۔ مجھے بھی اس کے چہرے کے خدوخال کچھ شناسا سے لگے تھے لیکن فوری طور پر یہ یاد نہ آ سکا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔

میرے اندر کا فطری تجسس جو قدرت نے مجھے عام لوگوں [illegible] کچھ زیادہ ہی عطا کیا ہے، مجھے پریشان کرنے لگا اور میں اپنے ذہن کے مختلف گوشوں میں اس چہرے کو کھوجنے لگا۔

دوپہر کا وقت تھا، اس لئے ریسٹورنٹ میں زیادہ رش نہیں تھا۔ یہاں شام کو زیادہ رش ہوتا ہے۔ مریدین نے ایک دور افتادہ گوشہ منتخب کیا اور وہاں جا ڈیرہ جمایا۔ ایک مرید نے جو اپنے حلیے اور لباس سے خاصا خوش حال لگتا تھا، کھانے کا آرڈر دیا۔ ادھر دوسرے لوگ پیر صاحب کی مٹھی چاپی کرنے لگے۔

میں یہ سب کچھ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ہمارا کھانا آ گیا اور ہم کھانا کھانے لگے۔ کچھ دیر بعد پیر پارٹی کا بھی کھانا آ گیا۔ اتنی دیر میں ہم کھانے سے فارغ ہو گئے تھے۔ اب ایک اور دلچسپ منظر دیکھنے کو ملا۔ مرید کھانے کا لقمہ بنا کر پیر صاحب کو پیش کرتے تو وہ کسی مرید کی طرف اشارہ کر دیتے۔ لقمہ کھلانے والا وہ لقمہ اسے کھلا دیتا۔ اس طرح چار مریدوں کو لقمہ کھلانے کے بعد پانچواں لقمہ پیر صاحب نے خود کھایا۔ اس طرح کھانا ختم ہونے تک پیر صاحب نے دس بارہ لقمے ہی کھائے ہوں گے۔

میں نے نوٹ کیا کہ پیر صاحب بولنے سے پرہیز کر رہے ہیں اور زیادہ تر اشاروں سے کام چلا رہے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پیر صاحب نے کچھ اشارہ کیا تو ایک مرید نے فوراً ان کے لئے دو بوتلیں منگوائیں اور پیر صاحب یکے بعد دیگرے دونوں بوتلیں چڑھا گئے۔

پھر پیر صاحب نے اپنے ایک خاص مرید کو اشارہ کیا تو اس نے جلدی سے ایک سنہری پیکٹ سے دو سگریٹ نکالے اور دونوں اکٹھے پیر صاحب کے ہونٹوں میں دے دیئے پھر اس نے ایک قیمتی لائٹر نکال کر سگریٹ سلگانے میں مدد دی۔ جب دونوں سگریٹ سلگ گئے تو پیر صاحب نے ایک زوردار کش کھینچا اور پھر گاڑھے گاڑھے دھوئیں کے مرغولے ریسٹورنٹ کی محدود فضا میں چکرانے لگے۔ جب اس دھوئیں کی بو میرے ناک تک پہنچی تو میرے ذہن نے فوراً نعرہ لگایا، چرس!

چند لمحوں میں سارا ماحول چرس کی ناگوار بو سے مکدر ہو گیا۔ میں نے ریسٹورنٹ والوں سے شکایت کی تو انہوں نے ایک مرید کو بلا کر کہا کہ وہ اپنے پیر صاحب کو چرس بھرا سگریٹ پینے سے منع کرے۔

''یہ بے ادبی ہم نہیں کر سکتے''۔ اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ ''یہ سب معرفت کی باتیں ہیں جو ہم جیسے کم علم نہیں جانتے۔ اس وقت جانے کتنے مؤکل ان کے اردگرد جمع ہوں گے، ابھی وہ مؤکل اس دھوئیں کو صاف کر دیں گے''۔

میں سمجھ گیا کہ یہ مریدوں کی وہ قسم ہے جو اپنے پیر کے خلافِ شرعی کاموں کو بھی ان کی مصلحت، برگزیدگی اور معرفت کا نام دے دیتے ہیں۔ مؤکلوں نے تو کیا دھواں صاف کرنا تھا، تھوڑی دیر میں وہاں لگے ایگزاسٹ فین نے یہ کام کر دیا۔

اس دوران ضعیف الاعتقادی اور ایمان کی کمزوری کا ایک اور ایسا مظاہرہ دیکھا کہ کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔ جونہی پیر صاحب سگریٹ کی راکھ جھاڑنا چاہتے، فوراً تمام مرید اپنے ہاتھوں کے پیالے بنا کر ایش ٹرے کے طور پر پیش کر دیتے۔ حالانکہ میز پر ایش ٹرے موجود تھی۔ پیر صاحب جس مرید کے ہاتھوں میں راکھ جھاڑتے، وہ یوں خوش ہو جاتا جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ وہ بڑی عقیدت سے راکھ کو چومتا اور پھر کھا لیتا۔ ایک دو نے پڑیا بنا کر بطور تبرک محفوظ بھی کر لی۔

جب سگریٹ ختم ہو گئے تو پیر صاحب نے بڑی شانِ بے نیازی سے دونوں سگریٹوں کے فلٹر فرش پر پھینک دیئے۔ فلٹروں کا فرش پر گرنا تھا کہ چاروں مرید دیوانہ وار ان فلٹروں پر ٹوٹ پڑے۔ جن دو

مریدوں کے ہاتھ فلٹر آئے، وہ بڑی عقیدت سے اور بڑے مزے سے اپنا اپنا فلٹر منہ میں ڈال کر چبانے لگے اور پھر نگل بھی گئے۔ اس دوران دوسرے مرید انہیں رشک بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔

شاید پڑھنے والے یہ سمجھیں کہ میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہا ہوں لیکن جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ سو فیصد سچ ہے اور مبالغے کا شائبہ تک نہیں ہے۔

مجھے بار بار اس پیر کا اپنی طرف دیکھ کر چونکنا اور شناسائی کی چمک آنکھوں میں پیدا ہو کر پھر فوراً ہی معدوم ہو جانا یاد آ رہا تھا۔ ویسے بھی مجھے اس پیر کا چہرہ شناسا لگ رہا تھا جیسے میں نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہو۔ کہاں دیکھا ہو، یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس کا ایک مرید میرے پاس سے گزرا تو میں نے اسے روک کر پوچھا کہ یہ حضرت کون ہیں؟

''اعلیٰ حضرت بھولی سرکار ہیں''۔ اس مرید نے کہا۔ ''جس پر نظر کرم کر دیں سمجھو اس کا بیڑا پار ہے...... ہم ان کے خادم ہیں''۔

''کیا میں سرکار سے مل سکتا ہوں؟'' میں نے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔

''ان سے ہر کوئی مل سکتا ہے''۔ اس مرید نے کہا۔ ''بس شرط یہ ہے کہ بندے کو پاک صاف ہونا چاہئے۔ اگر کوئی ناپاک شخص ان کے پاس جائے گا تو ان کو علم ہو جائے گا اور وہ سخت ناراض ہوں گے...... ہم سب باوضو رہتے ہیں''۔

آج کل ہر طرف انعامی بانڈ کے نمبروں کا شور ہے۔ لوگ مختلف بابوں، شاہ صاحبوں اور پیروں عاملوں وغیرہ سے انعامی بانڈ کا نمبر پوچھتے پھرتے ہیں۔ میں نے خود کئی سوٹڈ بوٹڈ لوگوں کو کسی سڑک کے کنارے، ریلوے سٹیشن یا قبرستان وغیرہ میں پڑے گندے مندے، فاترالعقل اور اپنی ہی غلاظت میں لتھڑے ہوئے بابوں کی خدمت کرتے دیکھا ہے۔ یہ دیوانے یا مخبوط الحواس لوگ ان کو گالیاں دینے لگیں تو وہ ان گالیوں کو ڈی سائفر (Decipher) کر کے ان سے اپنے مطلب کے ہندسے نکال لیتے ہیں۔

ایسے ''بابوں'' کی مقبولیت اور پذیرائی دیکھ کر کچھ پیشہ ور نوسرباز بھی اسی میدان میں آ گئے اور لوگوں کو راتوں رات لکھ پتی بنانے کا خواب دکھا کر لوٹنے لگے۔ ہر کوئی بغیر محنت کئے راتوں رات امیر ہو جانے کے چکر میں پڑا ہوا ہے اور یہ نوسرباز لوگوں کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

میں نے اس مرید سے پوچھا کہ کیا یہ بھولی سرکار لوگوں کو انعامی بانڈ اور جیتنے والے گھوڑوں کے نمبر بھی بتاتے ہیں۔

''نمبر کوئی نہیں بتاتے بھولی سرکار''۔ اس شخص نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''بس کہتے ہیں بانڈ خرید لو میں اپنا عمل کر دوں گا۔ بولتے بھی بہت کم ہیں اور اشاروں سے کام چلاتے ہیں۔ اگر کسی سائل کو دائیں ابرو کا اشارہ کر دیں تو اس کا کام ہو جاتا ہے اور اگر بائیں ابرو ہلا دیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت وہ کام نہیں کر سکتی''۔

اس کے بعد وہ مرید اپنے پیر صاحب کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا اور ایسے ایسے واقعات اور معجزہ نما کرامات سنانے لگا جس سے ظاہر ہوتا تھا نعوذ باللہ، اس کائنات کا نظام ان پیر صاحب کی وجہ سے ہی چل رہا ہے۔

مجھے ان خرافات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لئے میں نے اس مرید کا شکریہ ادا کر کے اسے رخصت کر دیا۔ میرا دوست بھی یہ ساری باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ وہ بڑا جوشیلا آدمی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا

کہ میں اس بھولی سرکار کو آزمائے بغیر نہ رہوں گا۔

''کیسے آزماؤ گے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی میں پیشاب کرنے جا رہا ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''طہارت نہیں کروں گا۔ ناپاکی کی حالت میں ان پیر صاحب کو ملوں گا۔ پھر دیکھوں گا کہ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ نہیں۔ طہارت بعد میں کر لوں گا''۔

اور پھر ہم نے ایسا ہی کیا اور میرے دوست نے طہارت کئے بغیر اس پیر سے مصافحہ کیا اور باتیں بھی کیں لیکن پیر صاحب کے فرشتوں کو معلوم نہ ہو سکا کہ ایک شخص ناپاکی کی حالت میں اس کے پاس آیا ہے۔ اب تو مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ یہ پیر سرتاپا فراڈ ہے۔

اب چونکہ اس فراڈ پیر کو قریب سے دیکھنے اور گفتگو کرنے کا موقع ملا تھا، اس لئے میں بڑے غور سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی کہ اس شخص کو کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے، یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ بھی غالباً میری اس کیفیت کو سمجھ رہا تھا کہ میں کس کشمکش میں مبتلا ہوں۔ شاید میری بے بسی کے احساس سے اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی اور اس کے چمکدار دانت نظر آنے لگے۔ میری نظر بے اختیاری میں اس کے دانتوں کی طرف اٹھ گئی اور پھر اچانک میرے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور پھر آگہی کے در مجھ پر وا ہو گئے۔ اس ایک لمحے کے تبسم نے اس کا بھید کھول دیا تھا۔ میں اسے پہچان گیا تھا، اب میرے مسکرانے کی باری تھی۔

''میں آپ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں سرکار!'' میں نے ادب سے کہا۔

سرکار نے میری طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر دایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر گونج دار لہجے میں کہا۔

''تخلیہ!''

اس کی ہی آواز سن کر سب مرید بڑی سرعت سے اٹھے اور الٹے قدموں چلتے ہوئے دور جا کر بیٹھ گئے۔

''ڈریکولا!'' میں نے تنہائی پا کر سرگوشی میں کہا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''آخر تم نے پہچان ہی لیا''۔ اس نے بھی سرگوشی میں کہا۔ ''تمہاری تجسس والی عدالت اب تک ویسی کی ویسی ہے...... ہاں، میں بھولا ہی ہوں''۔

''یہ سب کیا چکر ہے بھولے!'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''تم اور بھولے سرکار؟''

''بھولا تو میں پہلے ہی تھا''۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''سرکار ان لوگوں نے بنا دیا ہے''۔

میں اس سے ڈھیر سارے سوال کرنا چاہتا تھا جو میرے ذہن میں چکرانے لگے تھے اور میرے جذبۂ تجسس کو مہمیز کرنے لگے تھے۔

''یہ لو میرا کارڈ رکھو''۔ میرے مزید کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس نے ایک کارڈ نکال کر مجھے تھما دیا اور کہنے لگا۔ ''یہاں موقع نہیں ہے، آستانے پر آ جانا پھر جی بھر کر باتیں کریں گے۔ اس وقت میں ایک خاص مرید کے پاس جا رہا ہوں، بڑی تگڑی اسامی ہے''۔

اس کے بعد اس نے مریدوں کو اشارہ کیا اور اسی پجارو میں جا بیٹھا اور پھر جلد ہی پجارو وہاں سے چلی گئی۔

میں نے کارڈ پڑھا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس پر لکھا تھا۔ حضرت مولانا محمد بخش شاہ صاحب عرف بھولے سرکار۔ ایڈریس کی جگہ پر آستانۂ عالیہ لکھا تھا اور پورا ایڈریس لکھا تھا۔ فون اور موبائل فون نمبر بھی لکھے تھے۔ میں زمانے کے انقلاب دیکھ کر حیران ہونے لگا۔

محمد بخش عرف بھولا دسویں کلاس سے لے سیکنڈ ائیر تک میرا کلاس فیلو رہا تھا۔ پھر ایف اے کا امتحان دیئے بغیر ہی وہ کالج سے غائب ہو گیا تھا۔ ہم دوست اسے مذاق میں ڈریکولا بھی کہتے تھے اور اس بات کا وہ بُرا نہیں مانتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے سامنے کے دائیں بائیں کے دو دانت عام لڑکوں سے زیادہ لمبے اور نوکدار تھے۔ ویسے عام طور پر اسے بھولا کہہ کر پکارتے تھے، محمد بخش شاید ہی کوئی کہتا ہو۔ حتیٰ کہ ٹیچر بھی اسے بھولا ہی کہتے تھے۔

وہ ایک مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس کی سوچیں اور خیالات بہت بلند تھے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ چار پانچ ہزار کی نوکری نہیں کرے گا، کوئی ایسا کام کرے گا جس سے دنوں میں امیر ہو جائے۔

''کیا ڈاکے مارنے کا پروگرام ہے؟'' ایک دوست نے اس سے مذاق کیا۔

''ضرورت پڑی تو یہ کام بھی کروں گا''۔ بھولے نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ ''میں اپنے باپ کی طرح ساری عمر معمولی تنخواہ پر گزارا نہیں کرسکتا''۔

مختصر یہ کہ بھولا شروع سے ہی احساسِ کمتری کا شکار تھا اور اپنے گھر پر چھائی ہوئی غربت کا خاتمہ کر کے آرام و آسائشوں سے بھرپور زندگی گزارنے کا خواہاں تھا۔ وہ ہمیشہ دو اور دو چار کی بجائے پانچ بنانے کے چکر میں رہتا تھا۔

اسی بھولے کو میں نے اعلیٰ حضرت بھولے سرکار کے روپ میں دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے اس نے اپنا مقصد پا لیا ہے۔ آج اس کے پاس بڑی شاندار گاڑی تھی، دولت تھی، اس کے اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کرنے والے مرید تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ سب کچھ اس نے فراڈ کے ذریعے حاصل کیا ہے لیکن اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ دولت حاصل کرنے کے لئے وہ جائز ناجائز ہر حربہ اختیار کرے گا۔

میں اس سے ملاقات کرنے اور اس کے بھولا سے ''بھولا سرکار'' بننے تک کے سفر کا حال جاننے کے لئے بے چین ہونے لگا۔ میں نے دوسرے تیسرے دن ہی وقت نکال کر اس سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔ چوتھے دن میں نے بھولے سے ملنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ سارا دن سورج زمین کو جلاتا رہا اور اپنا قہر برساتا رہا۔ سورج غروب ہونے کے بعد بھی زمین بُری طرح تپ رہی تھی اور گرم ہوا بدن کو جھلسا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے دل کڑا کر کے گھر سے نکل کر کارڈ پر دیئے گئے پتے پر جا پہنچا۔ آستانہ بھولے سرکار ڈھونڈنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

تقریباً دس بارہ مرلے کا گھر تھا۔ اوپر ایک ہرے رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ لوہے کے گیٹ پر ''آستانہ عالیہ بھولے سرکار'' لکھا تھا۔ اندر دس پندرہ مرد اور پانچ چھ عورتیں بیٹھی نظر آ رہی تھیں۔ ایک مرید باری باری لوگوں کو اندر بلا رہا تھا۔ میں بھی ایک طرف بیٹھ گیا اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں وہی مرید مجھے نظر آ گیا جس سے میں ریسٹورنٹ میں سوال پوچھتا رہا تھا۔ اس نے بھی میری طرف دیکھا تو پہچان لیا اور میرے پاس آ گیا۔ میں نے اس کو اپنا کارڈ دے کر کہا کہ وہ سرکار کو میری آمد سے آگاہ کر دے۔

وہ کارڈ لے کر چلا گیا اور پھر جلد ہی واپس آ گیا اور کہنے لگا آپ میرے ساتھ اندر آ جائیں۔ میں اس کے پیچھے اندر چلا گیا۔ اس نے مجھے ایک سجے سجائے کمرے میں بٹھا دیا اور کہنے لگا کہ سرکار تمام سائلوں کو فارغ کر کے مجھ سے ملیں گے۔

وہ چلا گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی ایک شخص

مشروب کا جگ اور گلاس لے کر آ گیا۔ میں نے ٹھنڈا اور خوش ذائقہ مشروب پیا تو سکون کی ایک لہر میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد بھولا اس کمرے میں آیا اور خوب بھینچ کر مجھ سے گلے ملا۔ اس کے بعد ہم دونوں باتیں کرنے اور سکول کالج کے زمانے کی یادیں تازہ کرنے لگے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کالج سے کیوں بھاگا تھا اور اس کے بعد کیا کرتا رہا اور محمد بخش سے بھولا سرکار کیسے بنا؟

''یہ بڑی لمبی کہانی ہے''۔ بھولے نے کہا اور پھر خلا میں گھورنے لگا جیسے حالات و واقعات کو ترتیب دے رہا ہو پھر اس نے کہنا شروع کیا۔ ''میں اپنی داستانِ زندگی تم کو سنا دیتا ہوں۔ میں نے اچھا کیا یا بُرا کیا، یہ نتیجہ تم خود ہی نکال لینا''۔

پھر اس نے مجھے اپنی ساری کہانی تفصیل سے سنا دی۔ میں بھولے کی یہ داستان آپ کو اپنے الفاظ میں سنا دیتا ہوں اور اس کا سوال بھی آپ کے لئے چھوڑ دیتا ہوں کہ اس نے اچھا کیا یا بُرا؟

بھولا ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ ایک سرکاری دفتر میں کلرک تھا۔ بھولا تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ماں باپ نے ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار کر کے اسے بگاڑ دیا۔ گھر میں ہمیشہ تنگی ترشی رہتی تھی لیکن ان حالات کے باوجود بھولے کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

ذرا بڑا ہوا تو اسے سکول داخل کرایا گیا تو اس نے سکول جانے سے صاف انکار کر دیا۔ بڑی مشکل سے اسے لالچ دے دے کر سکول بھیجا جاتا۔ اس کے کلاس ماسٹر کے پاس اس کے لئے گولیاں ٹافیاں اور دیگر تحفے رکھوائے جاتے جو ماسٹر اسے وقفے وقفے سے دیتا رہتا تھا۔ اس طرح بھولا تحفوں کے لالچ میں سکول جانے لگا۔ پڑھنے کی طرف اس کا دھیان کم ہی تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے مڈل کیا اور پھر ہائی سکول داخل کرا دیا گیا۔

یہاں وہ میری کلاس میں ہی تھا۔ یہاں آ کر اس کے خیالات بدل گئے اور اس کو یہ احساس ہونا شروع ہو گیا کہ اس کا باپ غریب آدمی ہے اور بڑی مشکل سے اسے پڑھا رہا ہے۔ اب اس نے باپ کو پیسوں کے لئے تنگ کرنا چھوڑ دیا اور پڑھائی پر بھی توجہ دینے لگا۔ مگر چونکہ اس کی بنیاد کمزور تھی اس لئے وہ اچھا طالب علم نہ بن سکا، بس گزارا ہی تھا۔

وہ بڑا چرب زبان تھا اور دوسروں کو شیشے میں اتارنے کا فن جانتا تھا۔ اب اس نے امیر کبیر اور پیسے والے لڑکوں سے دوستی گانٹھ کر ان کے پیچھے پر عیش کرنے کا فن سیکھ لیا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کلرک کی نوکری نے اس کے باپ کو کچھ بھی نہیں دیا تھا۔ بڑی مشکل سے کھینچ تان کر گھر کی گاڑی چل رہی تھی۔ اوپر سے تین بیٹیوں کے بوجھ نے وقت سے پہلے ہی اس کی کمر جھکا دی تھی۔ وہ تو شکر تھا کہ مکان اپنا تھا ورنہ دال روٹی کھانی بھی مشکل ہو جاتی۔ بھولے کی ماں پیٹ کاٹ کاٹ کر بیٹیوں کے لئے تھوڑا بہت جوڑ رہی تھی۔

پھر میٹرک کا امتحان ہو گیا۔ بھولے نے بمشکل تھرڈ ڈویژن میں دسویں جماعت پاس کی۔ وہ میرے والے کالج میں داخل ہو گیا۔ اگر اس کے نمبر دیکھے جاتے تو اسے کبھی داخلہ نہ ملتا لیکن وہ فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا اور اسی بنیاد پر اسے کالج میں داخلہ مل گیا۔

کالج داخل ہونے کے بعد اس نے ذرا آزادی محسوس کی تو پَر پُرزے نکالنے لگا۔ یہاں بھی اس نے اپنے مطلب کے دوست بنا لئے اور ان کے پیسے پر عیش کرنے لگا۔ انہی دوستوں کی محفل میں پہلے اس

نے سگریٹ پینا شروع کئے اور پھر چرس بھی پینے لگا۔ یہی وہ وقت تھا جب بھولا شریفانہ زندگی سے دور ہی دور ہوتا گیا۔

اس کے دوستوں نے اسے پہلے تاش اور پھر سٹہ کھیلنا، قماربازی اور ریس کے گھوڑوں پر شرط لگانا سکھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی چرس کے علاوہ شراب بھی پینے لگا۔ وہ چونکہ بہت ذہین اور موقع شناس تھا، اس لئے سٹہ اور ریس کھیلنے کے اسرار و رموز کو سمجھ گیا اور اس کے اندازے اکثر و بیشتر درست ہوتے تھے۔

اب اس کے دوست کسی گھوڑے پر شرط لگانے سے پہلے یا سٹے پر رقم لگانے سے پہلے اس سے ضرور پوچھتے تھے۔ اس نے یہ شرط رکھ دی کہ اگر اس کے بتائے ہوئے نمبر پر کوئی جیتے گا تو اس کو بھی کمیشن دے گا۔ دوستوں نے بخوشی یہ بات مان لی۔ اس طرح جلد ہی اس کے پاس اچھی خاصی رقم اکٹھی ہو گئی اور وہ خود بھی جوا کھیلنے لگا۔

جلد ہی بھولے کے تعلقات بڑے بڑے تجربہ کار جواریوں سے ہو گئے۔ ان کی مدد سے وہ اندر کی باتیں بھی جان گیا تھا کہ کیسے لکھ پتیوں کو ککھ پتی بنایا جاتا ہے۔ کیسے جیتنے والے گھوڑے کو جان بوجھ کر ہروایا جاتا ہے۔ انتظامیہ کا ایک شخص اس کو اندر کی باتیں بتا دیا کرتا تھا۔

اس وقت بھولا سیکنڈ ایئر میں پڑھتا تھا۔ پڑھتا تو کیا تھا، بس کالج کا چکر لگا کر غائب ہو جاتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے کالج آنا بالکل ہی چھوڑ دیا۔ کالج والوں نے اس کے گھر نوٹس بھجوایا تو اس کے باپ کو علم ہوا کہ بیٹا تو کسی اور ہی منزل کا راہی بن گیا ہے۔ اس نے بھولے کو سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کی لیکن وہ اس قدر دور نکل چکا تھا کہ واپسی ممکن نہیں تھی۔

باپ نے اس بات کا بڑا بُرا اثر لیا کہ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو تباہی کے راستے پر چل نکلا۔ وہ اس غم سے بیمار رہنے لگا اور چارپائی سے لگ گیا۔ بھولے نے گھر جانا بالکل ہی کم کر دیا تھا۔ اس کا گھر والوں سے صرف اتنا ہی تعلق رہ گیا تھا کہ جب بھی وہ موٹی رقم جیت کر آتا، بہنوں کے لئے تحفے تحائف اور نقد رقم ماں کو دے کر آتا۔

پھر ایک دم اس کے بُرے دن آ گئے اور وہ لمبی لمبی رقمیں ہارنے لگا۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ بالکل ہی کنگال ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو چرس اور شراب کے نشے میں گم کر لیا اور ہاری ہوئی رقم واپس جیتنے کے منصوبے بنانے لگا۔

''سب کو کنگال کر دوں گا''۔ وہ نشے میں دھت ہو کر اکثر کہتا۔ ''ایک ہی داؤ میں سب ہارا ہوا مال منافع کے ساتھ جیت لوں گا...... ریس والوں کو کنگال کر دوں گا...... سٹے والوں کو برباد کر کے رکھ دوں گا، کسی کو نہیں چھوڑوں گا''۔

بھولا موقع کی تلاش میں تھا۔ ریس کلب کی انتظامیہ میں شامل شخص نے اسے بتایا تھا کہ جلد ہی وہ اسے جیتنے والے گھوڑے کے بارے میں اطلاع دے گا۔ یہ شخص ان سے جیت کے مال میں اپنا حصہ لیتا تھا۔ اس لئے اس کی اطلاع قابل بھروسہ ہوتی تھی۔

آخر اس شخص نے بھولے اور چند دوسرے جواریوں کو ایڈوانس پیسے لے کر جیتنے والے گھوڑے کا نام اور نمبر بتا دیا۔ بھولا اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ جب وہ اپنا ہارا ہوا مال معہ منافع حاصل کر سکتا تھا۔ اب اس نے اس گھوڑے پر لگانے کے لئے زیادہ سے زیادہ رقم اکٹھی کرنی تھی اور اس کے لئے اس نے اپنے ہی گھر پر ہاتھ صاف کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ اس وقت وہ بالکل کنگال تھا اور اسے یقین تھا کہ اس ایک داؤ سے اسے لاکھوں ملنے والے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ

جیت کر اس سے دُگنے پیسے گھر والوں کو دے دے گا۔

مثل مشہور ہے کہ چور اور عصمت فروش پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے لیکن جواری کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ ہارا ہوا جواری کوئی راہ نہ پا کر جیتنے کی امید پر اپنی بیوی کو بھی داؤ پر لگا سکتا ہے۔ اپنی بہن کا زیور چوری کر سکتا ہے۔ اپنی ماں کے سر سے چادر اتار سکتا ہے۔ بھولا بھی ذلت کی اس حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے راتوں رات اپنے گھر سے جو بھی پیسہ ہاتھ آیا، سمیٹ لیا۔ ماں نے بچت کر کر کے بہنوں کے لئے تھوڑا بہت زیور بنا رکھا تھا، وہ بھی ٹرنک سے نکالا اور بیچ کر ساری رقم اکٹھی کر کے اگلے دن ریس کے میدان میں جا پہنچا اور ساری رقم "لکی" نامی گھوڑے پر لگا دی۔ اسے پورا یقین تھا کہ "لکی" اس کے لئے لکی ثابت ہو گا اور قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہو جائے گی۔

جب ریس شروع ہوئی تو حسب توقع لکی سب سے آگے نکل گیا۔ بھولا تماشائیوں میں بیٹھا اپنے گھوڑے کی حوصلہ افزائی کے لئے نعرے لگانے لگا۔ دوسرے لوگ جنہوں نے لاکھوں کی رقمیں لگا رکھی تھیں، وہ اپنے اپنے گھوڑے کی جیت کے لئے نعرے لگا رہے تھے، دعائیں مانگ رہے تھے۔

جب آخری چکر رہ گیا تو لکی بدستور سب سے آگے تھا۔ اس کا قریب ترین حریف گھوڑا اس سے دس گز پیچھے دوڑ رہا تھا۔ بھولے نے سوچا فتح کے لئے تو ایک فٹ کا فاصلہ بھی کافی ہوتا ہے یہاں تو دس گز کا فرق ہے۔

پھر جونہی آخری چکر شروع ہوا تو بھولے نے محسوس کیا کہ لکی کا حریف گھوڑا دس گز کے فاصلے کو کم کر کے اس کے قریب ہو رہا ہے۔ پھر جو کچھ بھولے نے دیکھا اس سے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ لکی کا جوکی بالکل غیر محسوس انداز میں اس کی باگیں کھینچ کر اس کی رفتار کم کر رہا تھا۔ یہ سراسر بے ایمانی تھی اور لکی کو جان بوجھ کر ہروایا جا رہا تھا اور ایسا انتظامیہ کی ملی بھگت سے ہو رہا تھا۔ بعض اوقات فیورٹ گھوڑے کو جان بوجھ کر کھنچوا دیا جاتا ہے۔ چونکہ اس گھوڑے پر لوگوں نے بے تحاشا رقمیں لگا رکھی ہوتی ہیں، اس طرح یہ سب مال انتظامیہ کے حصے میں آ جاتا ہے۔

اور لکی کے ساتھ بھی یہی کیا گیا تھا۔ لکی اس ریس میں دوسرے نمبر پر رہا تھا۔ وہ دوسرے نمبر پر رہتا یا آخری نمبر پر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ بھولے کو غش آنے لگے اور اس کا سر گھومنے لگا۔

"بے ایمانی...... بے ایمانی...... بے ایمانی"۔

اس کا ذہن ایک ہی لفظ کی گردان کئے جا رہا تھا۔ اس نے اپنی بہنوں کا زیور بیچ کر یہ آخری داؤ لگایا تھا۔ اسے اپنے باپ کا قہر زدہ چہرہ نظر آنے لگا۔ ماں کی آنکھوں میں دنیا جہان کی ملامت تھی۔ بہنوں کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے کہ بھائی تو بہنوں کے سر ڈھانپا کرتے ہیں، تم کیسے بھائی ہو جس نے اپنی بہنوں کے سر سے سہاگ کے دوپٹے کھینچ لئے ہیں؟

اس کے دماغ میں جھکڑ سے چلنے لگے اور پھر ایسا لگا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ اسے کچھ ہوش نہ رہی۔ بس اتنا یاد رہ گیا کہ وہ ریس انتظامیہ کے دفتر میں داخل ہو کر سب کو ننگی گالیاں بکنے لگا اور توڑ پھوڑ کرنے لگا۔ انتظامیہ والے ایسی باتوں کے عادی تھے۔ اکثر کوئی نہ کوئی بڑی رقم ہارنے والا کم ظرف اس قسم کا ہنگامہ کر دیتا تھا۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے انہوں نے انتظام کر رکھا تھا۔

بھولے کو چند ہٹے کٹے ملازموں نے پکڑ کر پہلے تو اس کی دھنائی کی اور پھر اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ وہ کافی دن اپنی چوٹیں سہلاتا رہا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو چرس اور شراب کے نشے میں ڈبو کر سب کچھ

بھول جانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کی حالت نیم پاگلوں جیسی ہو گئی اور وہ بے خودی میں سٹے کے نمبر، مختلف گھوڑوں کے نام بڑبڑاتا رہتا۔

چند ہفتوں میں اس کی داڑھی بے تحاشا بڑھ گئی، مونچھیں بھی خوب بڑی ہو گئیں۔ وہ کہیں بھی پڑا رہتا، لوگ اسے کھانے کو دے دیتے اور چند روپے بھی دے جاتے۔ آہستہ آہستہ لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ وہ بڑا پہنچا ہوا بابا ہے اور اکثر صحیح نمبر بتاتا ہے۔

اس کے منہ سے نکلے ہوئے نمبروں پر ایک دو جواریوں نے جوا کھیلا تو وہ اتفاقاً جیت گئے۔ بس پھر کیا تھا، وہ اس قسم کے لوگوں میں مشہور ہو گیا اور لوگ باقاعدہ اس سے سٹے کا نمبر، جیتنے والے گھوڑے کا نمبر اور انعامی بانڈوں کے نمبر پوچھنے کے لئے آنے لگے۔ جیتنے والے اس کے لئے نقد نذرانے کے علاوہ کپڑے اور مٹھائی بھی لاتے تھے۔

لوگ اسے "بڑی سرکار" کہتے تھے۔

"میں تو بھولا ہوں"۔ وہ اکثر مسکرا کر کہتا۔ "یہ دنیا بڑی ٹیڑھی ہے"۔

اس کے بعد لوگوں نے اسے بھولا سرکار یا بھولی سرکار کہنا شروع کر دیا۔ بھولے نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو اس نے باقاعدہ خوبصورت داڑھی بڑھا لی اور سر کے بال کندھوں تک لمبے کر لئے اس کے علاوہ اس نے ایسا حلیہ بنا لیا جیسے وہ واقعی کوئی بہت بڑی روحانی ہستی ہے۔ پھر اس نے اپنے اردگرد اپنے مطلب کے مرید بھی اکٹھے کر لئے جو اس کے لئے پروپیگنڈا کرتے تھے اور سادہ لوح لوگوں کو پھانستے تھے۔

اس کے ارادت مندوں میں کاروں کوٹھیوں والے، جرائم پیشہ، عادی جواری، غریب امیر بھی شامل تھے۔ عورتیں اور جوان لڑکیاں بھی اس کے پاس اپنے مسائل لے کر آنے لگیں۔ ان میں زیادہ تعداد پڑھی لکھی اور امیر لڑکیوں کی تھی۔

بھولا شروع سے ہی بڑا چرب زبان تھا اور ہر قسم کی اداکاری کر سکتا تھا۔ یہ سلسلہ اسے خوب راس آیا اور اس نے خوب مال کمانا شروع کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے اپنی تینوں بہنوں کے زیور، کپڑے اور جہیز کا بندوبست کیا اور ان کی شادیاں کر دیں۔ وہ گھر میں نہیں رہتا تھا۔ اس نے اپنے لئے ایک الگ مکان لے لیا جسے عقیدت مندوں نے "آستانہ عالیہ بھولی سرکار" کا نام دے دیا تھا۔

"اب میں نے دنیا کے ساتھ ٹیڑھا چلنا سیکھ لیا ہے"۔ بھولے نے اپنی کہانی سنانے کے بعد کہا۔ "یہاں ایمان داری، سچائی، خلوص اور محنت کی کوئی قدر نہیں۔ خوب بے ایمانی کرو، دوسرے کو دھوکا دو، ہر جائز ناجائز ذریعے سے دولت اکٹھی کرو، اپنی ایک بوٹی کھانے کی خاطر دوسرے کا بکرا ذبح کرا دو، سوائے اپنی ذات کے کسی کے ساتھ مخلص نہ ہو، بغیر مطلب کسی کو سلام بھی نہ کرو...... یہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے سنہری اصول ہیں"۔

"مگر حق حلال کی آمدنی میں جو سکون......"

میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے میری بات کاٹ دی۔

"یہ سب صرف باتوں کی حد تک اچھا لگتا ہے"۔ اس نے کہا۔ "ایک عام آدمی حق حلال ذریعے سے اتنا کما ہی نہیں سکتا کہ اسے سکون ملے۔ بلکہ تنخواہ دیکھ کر بے سکونی اور پریشانیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے کہ اس محدود رقم سے بجلی، پانی، سوئی گیس کے بل ادا کرے، مکان کا کرایہ دے یا دال روٹی پوری کرے؟ اور اگر کوئی بیماری گھر میں آ جائے تو قرضہ لینا پڑتا ہے۔ شادی غمی کے اخراجات اس کے علاوہ ہیں خود ہی انصاف سے بتاؤ کہ ایسی حق حلال کی کمائی سے

کسی کو سکون مل سکتا ہے؟''

اس نے میری ہی نہیں بلکہ پوری قوم کی دکھتی رگ پکڑ لی تھی۔ میرے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ باتوں باتوں میں اور بحث کرنے میں مَیں اس کا مقابلہ کر سکتا تھا لیکن ان مسائل کا کوئی عملی حل میرے پاس نہیں تھا، اس لئے میں نے خاموش رہنا بہتر سمجھا اور باتوں کا رخ بدل دیا اور اس کو بتایا کہ میں ایک ماہانہ پرچے میں کام کر رہا ہوں اور اس کی کہانی اس میں شائع کرنا چاہتا ہوں۔

''چھاپ دو یار!'' اس نے بلا جھجک کہا۔ ''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟''

''اس سے تمہارا نقصان نہیں ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''کیسا نقصان؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''لوگ تمہاری اصلیت جان جائیں گے''۔ میں نے اس کو سمجھایا۔ ''اور پھر تمہارے چکر میں کون آئے گا۔ لوگوں کو علم ہو جائے گا کہ تم سراسر فراڈ ہو۔ ہو سکتا ہے کچھ دل جلے تمہارے خلاف سخت کارروائی پر اتر آئیں''۔

''کچھ بھی نہیں ہوگا''۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''ایک پرچے کو چھوڑو، بے شک ملک بھر کے اخباروں میں چھپوا دو، گلی محلوں میں اشتہار لگوا دو، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم فریب خوردہ قوم ہیں، سنہرے خواب دیکھنے کے عادی ہیں۔ ہر کوئی بغیر محنت کئے راتوں رات دولت مند بننا چاہتا ہے۔ کار، کوٹھی اور پُرآسائش زندگی کے خواب ہر شخص نے آنکھوں میں سجا رکھے ہیں۔ اسی لئے ''ڈبل شاہ'' جیسے لوگ کامیاب ہوتے ہیں۔ میں بھی ہر سائل کو اس کے خوابوں کی حسین تعبیر کا فریب دیتا ہوں اور لوگ ہنسی خوشی یہ فریب کھاتے ہیں۔ وہ اپنے خوابوں سے کسی صورت دستبردار ہونا نہیں چاہتے اور نہ ہی کوئی ان کو خواب دیکھنے سے روک سکتا ہے......

''یہاں ہر کوئی اپنے اپنے خوابوں کا اسیر ہے۔ تم لوگ خالی خولی باتوں سے ان کو خوابوں کے طلسم سے نہیں نکال سکتے۔ عام آدمی کو روٹی کپڑا اور مکان کون دے گا؟ دکھ بیماری میں طبی سہولتیں کون دے گا؟ انصاف اور تعلیم کون دے گا؟ ہر روز بڑھتی ہوئی بے لگام مہنگائی کے آگے بند کون باندھے گا؟ اگر تم عوام کو یہ سب کچھ نہیں دے سکتے تو کم از کم ان سے ان کے خواب تو نہ چھینو...... یہ ظلم نہ کرو''۔

وہ کتنی ہی دیر تک بولتا رہا اور میں سنتا رہا۔ اس وقت وہ جعلی اور فراڈ پیر کی بجائے کوئی مفکر یا عالم فاضل لگ رہا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ آئے دن اخباروں میں کسی نہ کسی جعلی پیر، عامل، نجومی وغیرہ کی بدمعاشیوں کی خبر آ جاتی ہے لیکن یہ سلسلہ پھر بھی اسی طرح جاری وساری ہے۔

لیکن اس سب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم برائی کو برائی کہنا چھوڑ دیں اور اسے بے نقاب نہ کریں۔ ''حکایت'' کی ہمیشہ سے یہ پالیسی رہی ہے کہ اس نے جعلی پیروں، عاملوں اور شاہ صاحبوں کے خلاف جہاد کیا ہے۔ لوگوں کی ضعیف الاعتقادی، جہالت اور سادہ لوحی اور ایک فراڈ پیر کی یہ داستان ہم اسی پالیسی کے اعادے کے طور پر شائع کر رہے ہیں۔ کوئی ایک فرد بھی اس سے فائدہ اٹھا کر سنبھل گیا تو ہم سمجھیں گے کہ محنت اکارت نہیں گئی۔

آخر میں حکومت کے ارباب بست وکشاد سے میرا سوال ہے کہ آخر لوگوں کو خوابوں کے اس طلسم سے کون نکالے گا؟

✱■✱

جگ بیتی

پھلاں دے رنگ کالے

قوت، دولت اور اختیار کے نشے میں رب قہار کو بھلا دینے والے فرعون صفت شخص کا فسانہ عبرت

☆ ڈاکٹر مبشر حسن ملک
0345-6875404

www.aiourdubooks.net

تمام علاقے میں گویا ڈھنڈورا پٹ گیا تھا۔ ''کیا یہ واقعی درست ہے؟'' ہر نیا جاننے والا دوسرے سے دریافت کرتا، پھر ردعمل کا اظہار کرتا ہوا مجمعے کے ساتھ یک جان ہو جاتا اور اس روز تو مجمع جم غفیر کا روپ دھار چکا تھا، پھر یہ اجتماع غیظ و غضب میں بھر گیا۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ اس اکٹھ میں تمام ہی صالحین تھے اور کسی شیطان کو انجام تک پہنچا دینے کے درپے تھے۔ اچنبھے کا پہلو یہ تھا کہ ملزم نورالدین ہفتہ پہلے تک، علاقے میں معتبر گردانا جاتا تھا اور مذہبی عالم ہونے کے علاوہ روحانی پیشوا بھی مانا جاتا تھا۔ چند ہی دنوں میں اتنا بڑا تغیر رُونما ہوگیا تھا کہ مذکورہ شخص عقیدت کی بلندیوں سے ذلت کی پاتال میں گر پڑا تھا اور اس سے علم و عمل سیکھنے والے اسی کے محاسبے کی رٹ لگانے لگے تھے۔ اب ہر طرف انتقام کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

''پولیس تک خبر پہنچا دی گئی ہے۔ تھانے سے پارٹی آیا چاہتی ہے''۔ گاؤں کے چوہدری جابر خان نے مجمعے کو نوید سنائی۔ بات سن کر عوامی احتجاج قدرے ماند پڑنے لگا۔ ضرورتاً مرد شرکاء کا دھیان بھی بٹنے لگا اور تھکن کے اثرات زائل کرنے کے لئے آوارہ نظریں نسوانی بھیڑ میں نئے جوبن ٹٹولنے لگیں۔

''سنگساری پر بھی بات کرو''۔ ایک عمر رسیدہ خاتون زور سے چلائی، جو کبھی بڑے چوہدری کی داشتہ بھی جاتی تھی مگر اس روز حراجاً عفت کی دیوی دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کی للکار سن کر کئی ہاتھ پتھروں کی طرف بڑھے مگر اسی اثناء میں پولیس وہاں پہنچ گئی اور معاملے نے یکدم قانونی رخ اختیار کرلیا۔

چوہدری جابر نے آگے بڑھ کر تھانیدار کا استقبال کیا فوراً اسے بے ساختہ گلے لگا لیا۔ معانقہ اس وقت تک برقرار رہا جب تک پولیس افسر کا حوصلہ ساتھ دیتا رہا، آخر اسے نجات مل گئی، پھر صورتِ حال معمول کی طرف آتی دکھائی دینے لگی۔

''کیا ہوا؟'' پہلا قانونی سوال وارد ہوا۔ جواب دینے کے لئے کئی زبانیں یکدم کھلیں مگر چوہدری جابر کے اشارے نے سبھی کو خاموش کرا دیا۔ وہ اہلِ دیہہ کی ترجمانی بطریق احسن کرسکتا تھا۔

''راجہ صاحب! بات بڑی شرمناک ہے۔ شرافت کی دھجیاں اڑا دی گئی ہیں۔'' چوہدری جابر نے بات شروع کی۔ ''مولوی نوردین کو گاؤں والوں نے بڑی عزت دی تھی۔ تمام مرد و زن اسے تکریم کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کئی تو اسے پیر و مرشد کا درجہ بھی دیتے تھے مگر بُرا ہو شیطان کا، جو کسی کو نہیں بخشتا، اس نے مولوی کو بھی گھیر لیا''۔

''کیا ہوا، چوہدری صاحب؟'' تھانیدار کے لہجے میں تجسس نمایاں تھا۔ اس نے سوال دہرا دیا۔

''مولوی نوردین ازدواجی بکھیڑے اور جھنجھٹ پالنے سے ہمیشہ گریزاں رہا۔ وہ کبھی بھی عقد کے بندھن میں نہ بندھا۔ گاؤں والے سالہا سال اسے تنہا دیکھ رہے تھے۔ اب ملحقہ گاؤں میں اس نے مکان کرائے پر لے لیا ہے۔ وہاں ایک عورت اس کے ساتھ بس رہی ہے۔ علاقے میں اس خاتون کو پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا''۔ چوہدری جابر نے بتایا۔

''تو گویا مولانا نے اپنے علاقے میں رہائش رکھنے سے اجتناب کیا۔ دوسرے لفظوں میں اس نے ملحقہ گاؤں کی طرف رخ اس لئے کیا کہ وہ کسی برائی میں مبتلا ہونے کی نیت رکھتا تھا''۔ تھانیدار نے معاملہ سمجھنے کی کوشش کی۔

''جی، اللہ آپ کا بھلا کرے! آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی''۔ چوہدری جابر بولتا رہا۔ ''گاؤں والے یہ معاملہ ہضم نہ کرسکے اور طیش میں آپے سے باہر ہوگئے۔ اب لوگ مولوی کو برائی کی علامت سمجھتے ہیں اور اسے قرار واقعی سزا دلوانا چاہتے ہیں''۔ گاؤں کے ترجمان نے دلی مدعا بیان کردیا۔

تھانیدار نے لمبی سی ''ہوں'' پر اکتفا کیا اور اپنے گرد موجود مجمعے پر طائرانہ نظر دوڑائی۔

''مولانا کی عمر وہ نہیں اور نہ ہی رتبہ ایسا ہے کہ وہ کسی غیر سنجیدہ حرکات کے مرتکب ہوں۔ ہمیں یہ پہلو بھی دیکھنا پڑے گا۔ مذکورہ عورت مولانا کی ہمشیرہ یا پھر کوئی دوسری قریبی رشتہ دار بھی ہوسکتی ہے''۔ تھانیدار نے رائے دی۔

''نہیں صاحب!'' چوہدری جابر مسکرایا، پھر یقین سے بولا۔ ''ہم نے اپنے طور پر تحقیق کر لی ہے۔ الزام درست ہے۔ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھیں۔ ہیں کواکب کچھ اور نظر آتے ہیں کچھ۔ آج نمازیوں نے مسجد میں مولوی کا گھیراؤ کرلیا تھا۔ میں فوری مداخلت نہ کرتا تو اس بدبخت کی تکہ بوٹی ہو چکی ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ لوگوں کا حوصلہ مزید نہ آزمایا جائے اور مولوی کو بغیر تاخیر کے قانون کے شکنجے میں کس دیا جائے''۔ چوہدری جابر نے حتمی رائے دے دی۔ مجمعے پر خاموشی چھا گئی۔

''ٹھیک ہے، چوہدری صاحب! میں اب چلتا ہوں''۔ تھانیدار نے کہا۔ ''میرا عملہ مولانا کو تھانے لے آئے گا۔ میری طرف سے آپ گاؤں والوں کو باور کرا دیں کہ اس کیس کی مکمل، غیر جانبدارانہ اور صحیح تفتیش کی جائے گی، وہ تسلی رکھیں''۔

تھوڑی دیر بعد مولانا کو مسجد کے حجرے سے گرفتار کرلیا گیا اور اسی شام وہ بدسلوکیوں کا ڈسا ہوا، تھانے میں محصور تھا۔ اس کے چہرے پر متانت ماند پڑ گئی تھی اور نقوش میں دکھ اُمڈ آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو تیرنے لگتے اور وہ بمشکل انہیں روک پاتا۔ تھانے کے ماحول میں وہ بُری طرح سہم چکا تھا، پھر گزرتے وقت کے ساتھ اس کی حالت مزید ابتر ہونا شروع ہوگئی۔ اسے جب تھانیدار کے حضور پیش کیا گیا تو وہ لاغر اور مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں آمنہ کو قید و بند میں دیکھ کر اسے یکدم اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا اور وہ چکرا کر دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ چوٹ آنے کے باعث اس کے منہ سے لہو بہنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب اوسان بحال ہوئے تو تھانیدار اس سے گویا ہوا۔

''مولانا! میں نے آپ کی امامت میں نماز پڑھی ہے اور آپ کی تقریریں بھی سنی ہیں۔ میرے دل میں آپ کے لئے احترام ہے مگر ہم سب مسلمان ہیں۔ ملت اسلامیہ میں مرد و زن کے بیچ عقد کا مسنون طریقہ موجود ہے جو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ ہندوانہ رسوم کے تحت شاید زن اور مرد یکجا بھگوان کے حضور قسم کھانے کے بعد بطور میاں بیوی زندگی کا آغاز کرسکتے ہیں مگر ہم مسلمان ایسا نہیں کرسکتے۔ ہمیں معاشرے کے سامنے ایک دوسرے کو اپنا لینے کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کے پاس آمنہ کے ساتھ نکاح کا قابل قبول ثبوت موجود ہے تو کوئی مسئلہ نہیں لیکن اگر ایسا نہیں تو مجبوراً مجھے آپ دونوں کو حدود آرڈی نینس کے تحت جیل بھیجنا پڑے گا۔ پھر عدالت میں آپ کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا مناسب موقع ملے گا''۔ تھانیدار نے بات مکمل کی۔

معاملہ پیچیدہ ہونے کی وجوہ موجود تھیں۔ دورانِ تفتیش مولانا نورالدین اپنے جوابات میں ابہام کی کیفیت دور نہ کرسکا تھا بلکہ یوں لگتا تھا جیسے وہ اہم واقعات دانستہ طور پر چھپا رہا تھا۔

اگلے روز مولانا نورالدین اور آمنہ کو جیل کی علیحدہ علیحدہ بیرکوں میں بھجوا دیا گیا، جہاں مولانا کی حالت تو جوں کی توں رہی لیکن آمنہ کی ذہنی صحت تیزی سے ابتر ہوتی گئی اور وہ ناقابل فہم حرکات و سکنات کرنے لگی۔ جلد ہی اسے مقامی ہسپتال بھیج دیا گیا تاکہ اس کا دماغی معائنہ کیا جاسکے۔

......★......

بیرسٹر اختر حسن علی جیل پہنچا تو اس دم صبح طلوع ہو چکی تھی مگر کالے بادل مشرق کی سمت گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ڈی ایس پی سعد نے سبزہ زار کے چھوٹے دروازے پر اس کا خیر مقدم کیا، پھر اسے ہمرکاب کرلیا۔ دو رویہ نباتی باڑوں کے بیچ راستہ تنگ تھا اور پگڈنڈی آویزاں پختہ اینٹوں کی بے ترتیبی نمایاں ظاہر کرتی تھی مگر ایستادہ پُرشکوہ عمارت کے باسیوں کے لئے شاید حُسن وسلیقہ ضروری نہیں تھا۔ بیرسٹر اختر کو اس وقت چکنی مٹی میں دھنسی ہوئی اینٹیں بھی بری نہ لگیں کیونکہ برکھا نے انہیں دھو کرنکھار دیا تھا اور یہ منظر اسے جیل کی بے ترتیب زندگی کے ہم آہنگ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ڈی ایس پی سعد کے پیچھے چلتا رہا، سوچوں میں غلطاں، حتیٰ کہ سبزہ زار کا فاصلہ طے ہوا اور نیم پختہ پگڈنڈی جیل کی وسیع شاہراہ میں گم ہوگئی جو عمارت کی راہداری میں مدغم ہو رہی تھی۔ یکا یک جیل کے گارڈ کمانڈر نے اپنی بارعب صدا میں للکار بھری اور سکوت میں ہلچل مچا دی۔ ڈی ایس پی سعد کے دفتر میں ناشتے کا پُرتکلف اہتمام کیا گیا تھا جو لاہوری ذائقے اور رنگ سے مالا مال تھا۔ رُت اور کھانوں کی ہم آہنگی واضح نظر آتی تھی۔

یکا یک بادلوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی۔ باراں پھر دھرتی سے ٹکرانے کی کتھا سنا رہی تھی۔ سورج گہرے بادلوں میں اوجھل ہو چکا تھا۔ صبح کا رنگ کالا تھا۔ ڈی ایس پی سعد نے کھڑکی سے پردہ سرکایا تو شدت بھری باد کے سنگ بارش کی مہین پھوار اس کے بدن پر بکھیر گئی۔

''یہ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے''۔

اس نے تیز لہجے میں لفظ ادا کئے پھر بیرسٹر اختر سے مخاطب ہوتے ہوئے موضوع کی طرف آ گیا۔

''آپ نورالدین اور آمنہ کے سلسلے میں مقدمے کی تیاری کررہے تھے، ملا کچھ مواد؟''

''بے بہا، زمانے کی کج رنگی کے کئی ڈھب دکھائی دیئے''۔

''نورالدین نے چند واقعات کا انکشاف کیا تھا، کیا وہ سچ ثابت ہوئے؟''

''سعد! نورالدین مجھ سے حقائق چھپاتا رہا۔ وہ مجھے بہت کم بتا سکا تھا۔ طاقت کے خداؤں نے اس کا حوصلہ توڑ دیا تھا۔ چوہدری جابر تھانیدار کے ذریعے غالباً اسے اہم تفصیلات بتانے سے روک رہا تھا۔ کچھ وہ خود بھی ڈرتا تھا کہ اس نے گر تمام راز آشکار کر دیئے تو چوہدری جابر آمنہ کو نقصان پہنچا سکتا تھا''۔

''مجھے تو یہ طبقاتی کشمکش نظر آتی ہے''۔

''ہاں، سعد! نوع انسانی نے بڑے بڑے بکھیڑے پال لئے ہیں۔ لالچ کی کوئی حد نہیں رہی، کیونکہ خود غرضیوں نے مفادات کے حجم بڑھا دیئے ہیں اور انسانیت ہوس کی بھینٹ چڑھی نظر آتی ہے''۔

''درست کہا، بدقسمتی سے معاشرتی اونچ نیچ نے ناانصافیوں کو جنم دیا ہے''۔

''طاقتور طبقے نے اپنے گرد معاشرتی حصار قائم کر لئے ہیں تاکہ اس کے مفادات کی حفاظت تسلسل سے ہوتی رہے۔ ان حصاروں کو اصولوں کا نام دے دیا گیا ہے۔ بغور دیکھیں تو ذات پات کا نظام بھی اسی نظریے کی ایک کڑی ہے۔ عموماً ماجرا یہی ہے''۔

''لگتا ہے، آپ نے کوئی بڑی کہانی تلاش کر لی ہے؟''

''وکالت پیشہ ہی بکھری داستانیں سنبھالنے کا ہے۔ ہماری کاوشیں الجھی ہوئی کہانیوں کو سلجھا کر حقائق کا رخ عطا کرتی ہیں۔ کہانیاں انصاف کے تقاضوں پر انجام پا جائیں تو انسانیت فتح مند ہو جاتی ہے۔ ورنہ......''

''نورالدین اور آمنہ کی بپتا مجھے تو الجھاؤ کا گورکھ دھندا دکھائی دیتی ہے۔ آپ اسے کیا شناخت دیں گے؟''

''سچ پوچھیں تو ان کی کہانی مجھے آج طلوع ہونے والی کالی صبح کی طرح دکھتی ہے۔ اگر عنوان دینا چاہوں تو میں کہوں گا...... 'پھلاں دے رنگ کالے'۔''

''میں یہ کہانی جاننا چاہوں گا''۔

موسلادھار بارش شروع ہو چکی تھی۔ تند باد کی یلغار اور بہتے پانی میں گرتے ابر کا شور طوفانی گھن گرج میں رچ کر یکجائی پا رہے تھے۔ لگتا جیسے فلک سیلِ رواں زمین پر منتقل کر دینا چاہتا تھا۔

''سعد! معاملہ یوں ہے کہ نورالدین کبھی نوری ہوا کرتا تھا اور الہڑ آمنہ کی ہجولیاں اسے پیار سے آمی کہا کرتی تھیں۔ وہ دونوں ایسے لازوال پیار میں مبتلا ہو گئے جس کی مثالیں خال خال ملتی ہیں مگر ان کی مہم جوئی نے ایسے قہر و غضب کو جنم دیا جو حدوں پر نارِ جہنم کو چھوتا تھا۔ وہ زیرِ عتاب ہو گئے پھر ایسا وقت بھی آیا جب ان دونوں کے لئے دنیا میں کوئی پناہ گاہ نہیں بچی تھی۔ وہ ایسے پریمی تھے جنہوں نے رائج ضابطوں کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر دی تھی اور ہاں، یہ بتا دوں کہ ان کی کہانی وقت کے ان سلسلوں پر پھیلی ہوئی تھی جب الہیان دیہہ سچائی اور سادہ لوحی کی تصویر ہوا کرتے تھے اور جدت کے موجودہ معیاروں سے قطعی نابلد تھے''۔

''آپ مجھے تفصیل بتائیں''۔

......★......

نورالدین گاؤں کا کڑیل جوان تو نہیں تھا لیکن خوبروئی میں ہزاروں کو مات دیتا تھا۔ اس وقت وہ نوری کہلاتا تھا۔ وہ دور اس کی نوعمری کا تھا۔ وہ دنیا کے نت نئے سیاپوں میں آنکھیں کھول رہا تھا مگر کسی حد تک احساس برتری کا شکار ہو چکا تھا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا اس کی شخصیت کا چرچا گاؤں کی حدوں سے نکل کر دور دور تک پھیل گیا تھا اور بستیوں کے لوگ معمولی کسان کے خوش خصائل بیٹے کا تذکرہ کرتے نہ تھکتے تھے۔ دبلا پتلا، سفید چٹا اور چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی، یہ تھا اس کا سجیلا روپ۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت چمکتی تھی۔ آواز میں لوچ تھا کہ ترنگ میں گاتا تو زمانہ جھوم اٹھتا۔ گاؤں کے مولوی، نظام صاحب خصوصاً اس کے شیدا تھے۔ اذان کا وقت آتا تو اس کی موجودگی میں کسی دوسرے کو پکار کا اعزاز نہ ملتا۔ وہ مدرسے میں بھی ان کا شاگرد ارجمند سمجھا جاتا تھا۔

کھیتی باڑی میں نوری کے توانا بھائی کافی سمجھے جاتے تھے جس کے باعث چھوٹا دیگر امور سنبھال سکتا تھا مگر اسے صرف علم حاصل کرنے کا شوق تھا، جو مولانا نظام نے اس کی گھٹی میں ڈال دیا تھا۔ اب وہی ان کی کتابیں کا پیاں بھی اٹھایا کرتا تھا، چلم تازہ کرنے کے لئے دیگر کئی موجود تھے۔ طبعاً نوری شستہ مزاج سمجھا جاتا تھا، اس کے علاوہ وہ حسِ مزاح کا بھی مالک تھا۔ یاوہ گوئی سے پرہیز کرتا۔

عصر کے بعد پہر ڈھل رہا تھا کہ نوری گھر سے تازہ دودھ کا ڈول سنبھالے مولانا نظام کے در پر پہنچ گیا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ جانتا تھا کہ مولانا صاحب کچھ علیل تھے۔ شاید اسی لئے دودھ لینے وہ خود دروازے تک نہ آ سکے، صرف کسی کو پکار کر رہ گئے۔ چند لمحوں بعد دو نسوانی ہاتھ پردے کی اوٹ سے برتن کی طرف بڑھے۔ دودھ، مکھن جیسے سفید حنائی ہاتھ سامنے پا کر نوری کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی دودھ کا برتن اپنی طرف کھینچ لیا۔ حنائی ہاتھ پردے میں الجھ کر رہ گئے، پھر نہ جانے یکدم پردہ کیسے زمین بوس ہو گیا۔ لمحہ بھر صاعقہ سی نوری کے دل پر کوندگئی پھر روح تک اتر گئی۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔

نوعمر نوری کے مقابل ماہ لقا کھڑی تھی۔ حسین جیسے پری، اس کے چاند چہرے پر زلفوں کی گھٹائیں بکھر گئی تھیں۔ پل بھر کے لئے نوری کو کائنات کا سارا حُسن

ماہ لقا کی آنکھوں میں سجا دکھائی دیا۔ پھر یہ نگاہیں یکدم جھک گئیں۔ نوری کی کتابِ زیست میں جوانی کی یہ پہلی واردات تھی۔ وہ اپنے آپ کو کسی حسین گناہ کا مجرم سمجھنے لگا۔ پھر دودھ کا برتن حنائی ہاتھوں کی سمت بڑھا دیا جسے تھام لیا گیا۔ اس دم اسے احساس ہوا کہ بجلیاں انگلیوں کے پور ٹکرانے سے بھی جسموں میں اتر جاتی ہیں۔ لمحے شعور کی جانب پلٹے تو ایک اچھوتی سی مسکان اس کے دل میں گھر کر گئی جو اس کے نزدیک حُسن کائنات کا کرشماتی رنگ تھی۔ نوری کو یہ احساس بھی ہوا کہ اگر یہ چوٹ بھاری تھی تو مقابل کے دل پر بھی لگ چکی تھی۔ دید کا سفر تمام ہوا تو بیتاب دلوں کے بیچ پردہ دوبارہ تن چکا تھا اور چتون پر بھی ردا کھنچ آئی تھی، لمحے لیکن امر ہو چکے تھے۔

وہ کون تھی؟ اس خیال نے نوری کے من میں دھمال مچا دی تھی۔ چاند چہرہ اس کی آنکھوں میں بسا تو ذہن پر چھا گیا اور دل میں درد جگائے رکھتا تھا۔ وہ انوکھے تجربوں سے گزر رہا تھا، جو جاری تھے۔ کبھی انگلیوں کے پور اس کے لبوں میں سجھانے لگتے، تو کبھی وہ مانوس اجنبی سے باتیں کرنے لگتا۔ اس کا سکون چھن گیا تھا۔

اگلے دو روز بعد اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے من میں بسی مورت آمی تھی، جس کے چرچے نوعمر لڑکیوں میں عام تھے۔ وہ علاقے کے سب سے بڑے رئیس، چوہدری نادر کی بھتیجی تھی جس کے باعث اس کی ناز برداریاں صرف مثالوں میں ملا کرتی تھیں۔ اس کی مقبولیت کی وجوہ اور بھی تھیں کہ وہ شخصی لحاظ سے بڑی بلند پایہ تھی۔ حُسن کے علاوہ وہ انسانی خوبیوں سے بھی مالا مال تھی۔ خود کو بلند تر رکھنا جانتی تھی۔ دبیز پردوں میں رہا کرتی تھی مگر کبھی پردے بھی بغاوت کر جاتے ہیں اور چھپے حُسن کو آشکار کر دیتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو فن کاروں کے مقدر میں شاہکاروں کی تعریف نہ آتی۔

نوری وقت کے ہمرکاب آگے بڑھا تو نسوانی محبت کا اسیر بنتا گیا۔ آتشِ عشق اب اس کے تن من میں پوری طرح اتر چکی تھی۔ رتجگوں کے بیچ جو وقفہ اسے ملتا، بے سکونی کی نذر ہو جاتا۔ آخر نوبت شفا خانے کی حاجت روائی تک آ پہنچی۔ وہاں اسے لواحقین نے بھیجا تھا مگر وہ اور بھی گہری چوٹ کھا آیا۔

پردوں میں سِمٹی آمی وہاں براجمان تھی، خواتین کی معیت میں۔ شاید وہ بھی نارِ محبت کا علاج پانے دربدر ہو گئی تھی۔ آسودگی اسے مگر ملی تو ستم گری میں ملی ہو گی؟ نقاب کی اوٹ سے وہ لحظہ لحظہ نوری کے طلسم میں کھوئی رہی۔ اٹھی تو باہمی چاہت کے بھانبڑ کچھ اور مچا گئی۔ نقاب سرکایا اور ادا سے برق گرا گئی۔ فتنہ گر کچھ بڑھ کر فتنہ مچا گئی۔

وہ تمام لوازمات پیدا ہو چکے تھے جو پریم کہانی آگے بڑھا سکتے تھے۔ آمی اب نوری کی خالہ زاد، حانی کے گھر آنے لگی تھی۔ وہ کمال ہوشیاری سے راہوں پر چلنا سیکھ رہی تھی۔ سفر کے پہلے چند روز باہمی توجہ طلبی میں صرف ہوئے، پھر ایک روز پروانہ رخِ روشن کے مقابل آ ہی گیا۔ سب کچھ بظاہر اتفاقاً ہوا تھا۔ کیا دن تھا وہ، ساون پورے جوبن پر تھا مگر گھٹائیں دھرتی کو ترسا رہی تھیں، پھر اچانک میگھا برس پڑی۔

''السلام علیکم!'' پہل آمی نے کی۔ گھبراہٹ میں آنکھیں مٹکائیں پھر نظریں جھکا لیں اور دایاں ہاتھ ماتھے کی سمت اٹھا دیا۔ لحہ بھر دوبارہ نگاہیں اٹھائیں اور شوقِ جنوں اکھیوں کی راہ بہا دیا۔

''وعلیکم السلام! خدا کرے کہ آپ پر بھی سلامتی کی برکھا برسے''۔ نوری نے جواب دیا اور دل کی بھڑتی ہوئی دھڑکن پر قابو پانے کی سعی کرنے لگا۔ لمحوں کے تناؤ میں اس نے ہاتھ میں گرفت گلِ احمریں بلا ارادہ طاق پر رکھ دیا۔ پھر راہِ الفت پر پہلا قدم بھی اٹھا لیا۔ اس روز

نوعمر پریموں کے بیچ پہلی بار بلاواسطہ گفتگو ہوئی تھی جس میں حواس کا تصرف کم اور بدحواسیاں ہر قدم موجود رہی تھیں۔ پریم لڑی میں پرونے کے لئے تو بہت کچھ ہو سکتا تھا مگر لمحوں کے رنگ برنگ موتی جابجا بکھر گئے اور لڑی وجود نہ پا سکی۔ کبھی ہونٹ کپکپائے تو کبھی زبان نے بغاوت کر دی۔ چاہت کا سلسلہ دراز رہا مگر گفتگو اختصار میں سمٹ گئی۔ کچھ جملے تکرار میں آئے تو کئی باتیں ان کہی رہ گئیں۔

حانی کمرے میں داخل ہوئی تو بے قابو دھڑکتے دلوں پر لمحے سہل ہوئیں پریموں کے وجود میں البتہ تخیل اور جذبوں کے نئے باب کھل گئے۔ وہ لفظ بارہا سوچ میں آئے جو کہے گئے تھے مگر اَن کہے لفظوں نے بھی قلوب میں ہلچل مچائے رکھی۔ نوری کے من پر ایسی واردات بھی گزری تھی، جو درد کی مٹھاس اور چاشنی میں لازوال تھی۔ وقتِ رخصت آمی وہ گلِ خندہ ہمراہ لے گئی تھی جو نوری نے طاق پر رکھ دیا تھا۔ اس کے لب و رخسار بھی اس گل میں خوشبو بکھراتے رہے تھے۔

جذبے رخِ حیات کا جزو لازم ہیں۔ بلا خیزی میں ڈھل جائیں تو پروانہ سوئے شمع جرأت پرواز پاتا ہے، بپھر جائیں تو ناتوانیاں جاں گسل پیانوں سے سرشار ہو جاتی ہیں۔ نوری کو بھی جرأت پروانہ لے اڑی تھی۔ شام، کسی وقت وہ آمی کے دریچے میں تازہ پھول رکھ آیا کرتا تھا، جو صبح دم وہاں موجود نہ ہوتا۔ طوفان ہو یا میگھا، وہ اپنا پیغام ضرور پہنچاتا تھا، اس توقع پر کہ اس کا جواب ضرور آئے گا۔ آخر ایک روز وہ فیضیاب ہو گیا۔ باہمی ملاقات کی آرزو نے اسے دیوانہ کر دیا۔ پھر وہی ہوا جو زمانے کی ریت سے موسوم کیا جاتا ہے۔

''بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق''

رات کی پلکیں بھیگ چکی تھیں۔ چندا تاروں کے جھرمٹ میں جگمگا رہا تھا۔ چاندنی طول و عرض میں پھیل گئی تھی۔ اس دم گاؤں کی عمومی حیات محوِ خواب ہوا کرتی تھی۔ کھیتوں کے رکھوالے البتہ کہیں کہیں محوِ کار تھے اور کھڑی فصلوں کی آبیاری کر رہے تھے۔ یہ مناظر دیکھے تو نوری سوچ میں پڑ گیا۔ اسے احساس ہوا کہ غمِ دوراں بھی رتجگوں سے ہمکنار کر سکتا ہے، جس طرح کہ غمِ جاناں۔ سارے عشق کے حربے ہیں، کوئی جو بھی دکھ پال لے۔

موسم میں سردی کا ہلکا سا عنصر تھا۔ شبنم کی تراوت سے فصلیں مہک رہی تھیں۔ پانی کے جھرنے راستوں کی اطراف میں مچل رہے تھے۔ سیماب رنگ پانی میں چندا اتر رہا تھا۔ نوری اپنے چاند کا متلاشی تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا گاؤں سے باہر نکل آیا تھا۔ آخری عمارت جو اس کے راستے میں آئی، وہ آمی کی قیام گاہ تھی۔ درختوں کے جھرمٹ میں گھری ہوئی حویلی میں چند بتیاں اس دم بھی روشن تھیں۔ نوری بل کھاتے ہوئے دریا کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔ دریا اسے اپنے وجود کی طرح دکھائی دیا، جس کے ظاہری سکون میں بھی کئی مدوجزر پوشیدہ تھے۔ اس کے بعد وہ اشجار کے جھنڈ کی طرف بڑھنے لگا، جہاں چھوٹے بڑے پتھر پڑے تھے اور گزشتہ دریائی طغیانیوں کا پتہ دیتے تھے۔ یہی اس کی منزل تھی۔ چشمے کے قریب پتھروں کی اوٹ میں آمی اس کی منتظر تھی۔ آبگینوں نے ہوا میں بکھر کر اس کے وجود کو پناہ میں لے رکھا تھا۔ آہٹ پا کر وہ چونک اٹھی۔ نوری حسن فطرت میں حسن مجسم پا کر مبہوت ہو گیا۔ دکھتا ہوا اسے قدرت کا انعام لگا۔ چاندنی میں آمی کا چہرہ حیا کی کرنوں سے دمک رہا تھا۔ نوری کو لگا جیسے چندا فلک سے زمین پر اتر آیا تھا۔ لمحوں کے سفر میں وہ بے اختیار سا ہوا، حواس میں لوٹا تو زمین کا چاند اس کی بانہوں میں مچل رہا تھا۔

اس شب دو پریموں کے بیچ بہت سارے عہد و پیمان ہوئے، آغازِ محبت کی پہلی ریت نبھائی گئی۔ دونوں کی سوچ ایک جیسی تھی کہ انہیں ایک دوسرے کے لئے پیدا

کیا گیا تھا۔ انہوں نے عمر بھر ساتھ نبھانے کا عزم کیا اور اس سلسلے پر قربانی دینے پر آمادہ ہوئے۔ عہد و پیاں کا پاس رکھنے کے لئے قسمیں کھائیں اور کامرانیاں پانے کے لئے دعائیں بھی مانگیں۔ ملاقات طوالت میں اس قدر بڑھی کہ پو پھٹنے لگی۔ وقت بیت جانے کا احساس ہی نہ ہوا، مگر بیت جانے والا ہر لمحہ امر ہوتا گیا اور نوع انسانی کے پیچیدہ ناطوں کا گواہ بن گیا۔

تنہائی میں جنم پانے والی اس ملاقات کے بعد نوری اور آمی کے بیچ چھپ کر ملنے کا سلسلہ چل پڑا۔ اس راہ میں ہر کامیابی ان کا حوصلہ کچھ اور بڑھا دیتی تھی، مگر اس نوع کے سلاسل کبھی دیرپا نہیں ہوا کرتے اور مخفی پُر خطا رویوں کے نتائج ضرور سامنے آ جاتے ہیں، جلد یا بدیر۔ نوری اور آمی کے تعلق پر بھی چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں، بالآخر افواہیں حویلی کے بند دروازوں بھی سنائی دینے لگیں۔ ایک رات چوہدری نادر نے ڈیوڑھی میں نرم ریت کی تہہ ڈلوا دی اور صبح سویرے آمی کو کردہ جرم کی پاداش میں پکڑ لیا۔ وہ ریت میں پیوستہ اپنے نقوشِ پا کو نہ جھٹلا سکی۔ جب کھوجیوں نے کھرا اٹھایا تو نوری کو بھی دھر لیا گیا۔

لوگوں کو یقین تھا کہ چوہدری نادر نوری کو زندہ نہیں چھوڑے گا کیونکہ حویلی کے مالک اہلیان دیہہ کے لئے حکمرانوں کا درجہ رکھتے تھے اور علاقے میں سیاہ وسفید کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ عوام الناس ان کے قہر سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ رہا معاملہ آمی کا، تو لوگ جانتے تھے کہ وہ حویلی کے زیراثر نصف جائیداد کی مالکہ تھی، مزید یہ کہ جس روز اس کا باپ، چوہدری فاضل قتل ہوا تھا اسی شام یہ علان کر دیا گیا تھا کہ آمنہ عرف آمی، چوہدری دلاور کی منگیتر تھی۔ دلاور، چوہدری نادر کا بیٹا تھا اور حویلی کا اکلوتا وارث بھی۔ یوں خاندان جائداد کا معاملہ اندرون خانہ ہی نمٹ گیا تھا اور قریبی احباب کے ہاتھ صرف محرومیاں اور مایوسیاں آئی تھیں۔ نوری کے ساتھ وہی ہوا جس کا بستی والوں کو اندازہ تھا۔

چوہدری نادر کے غنڈے اسے اٹھا کر دور ویرانے میں لے گئے اور ایک ٹنڈ منڈ شجر کے ساتھ الٹا لٹکا دیا۔ پھر اسے اتنا مارا کہ جسم کی ہڈیاں توڑ دیں، آخر میں اسے ایک سڑک کے کنارے پھینک دیا گیا۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں وہ تادیر وہیں پڑا رہا۔ چند راہگیر ادھر سے گزرے تو انہوں نے اسے قریبی ہسپتال پہنچا دیا، جہاں عالم بے ہوشی میں بھی وہ متواتر آمی کو پکارتا رہا۔ اسے صحت مند ہونے میں طویل عرصہ لگا۔ یہ اس کی زندگی کا مشکل ترین دور تھا۔ ایسے ادوار کبھی انسان کو مزید نڈر بنا دیتے ہیں اور اس میں موجود ردِعمل کی قوت بڑھا دیتے ہیں۔ صحت یاب ہونے پر نوری کے عزم میں بلا کی پختگی آ چکی تھی۔

بیرسٹر اختر ڈی ایس پی سعد کو آمی اور نوری کے واقعات سنا رہا تھا اس بیچ اس کا چہرہ جذبوں سے اَٹ گیا تھا۔ وہ قدرے بے چین بھی ہوا۔ برکھا رُت کی شدت برقرار تھی، کبھی کہانی میں جذبوں کے ہم آہنگ بڑھ جاتی۔

ذہنی ارتکاز برقرار رکھنے کے لئے بیرسٹر اختر نے سگار سلگا لیا اور روداِدِ عشق جاری رکھی۔

اس رات بھی برکھا اپنے جوبن پر تھی جب نوری مولانا نظام کے گھر پہنچ گیا۔ رینا کا پچھلا پہر تھا۔ مولانا صاحب تہجد سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ان کے در پر دستک ہوئی۔

''کون ہے، خدا کا بندہ اس موسم میں؟'' انہوں نے صدا لگائی۔

''جی نورالدین''۔ جواب ملا۔

چند لمحوں بعد دروازہ کھل چکا تھا۔

''تم اور اس پہر، کیا روپ بھر لیا ہے؟'' مولانا

صاحب حیران ہوئے۔

نوری کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ بارش میں بُری طرح بھیگ چکا تھا۔ اس کے لباس اور بدن سے مسلسل پانی ٹپک رہا تھا۔

''اپنا کچھ پتہ نہیں''۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''رتجگے کاٹنے والے عشاق ہوا کرتے ہیں، میرے مولا کے یا اس کی مخلوق کے۔ تمہارا تذکرہ خلق کی زبان سے سنا ہے''۔

''کیا ایسا ممکن ہے کہ میں اپنی مراد پا سکوں؟''

''دعا تو میں کر سکتا ہوں، دوا ذرا مشکل ہے۔ پھر بھی میں وسیلہ ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا''۔ مولانا صاحب نے شفقت بھرے لہجے میں وعدہ کیا، وہ سنجیدہ تھے۔

انہوں نے چوہدری جعفر کی وساطت سے اپنی سی سعی کی مگر ناکام ہو گئے۔ الٹا چوہدری نادر کی ناراضی مول لے لی۔

بستی پر رات کی تاریکی چھا چکی تھی۔ ریلوے پلیٹ فارم تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ ہواؤں میں سردی کا عنصر واضح تھا۔ نوعمر لڑکی اور لڑکا ایک کونے میں موجود تھے۔ انتہائی افسردہ اور پریشان حال، تھکن سے چُور دکھائی دیتے تھے۔

''ہمیں جلد از جلد جاگیر کی حدوں سے نکل جانا ہوگا''۔ نوری نے آمی سے کہا پھر دونوں گاڑی پر سوار ہو گئے۔ آمی مسلسل رو رہی تھی جبکہ نوری اسے تسلیاں دے رہا تھا۔

''مجھے اب دھرتی میں آگ نظر آنے لگی ہے، اندازہ کر سکتی ہوں کہ حویلی میں کس نوع کی قیامت برپا ہوئی ہوگی۔ سوچتی ہوں تو ذہن ماؤف ہونے لگتا ہے۔'' آمی نے کہا۔ نوری کو بھی گھر والوں کی فکر لاحق ہو چکی تھی مگر ان کے واپسی کے راستے مسدود ہو گئے تھے۔ اب وہ صرف آگے بڑھ سکتے تھے۔ دونوں گہری سوچوں میں غلطاں تھے جبکہ مسافر گاڑی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

.......★.......

قصبے میں ریلوے سٹیشن کے قریب چھوٹی سی مسجد واقع تھی جس میں ظہر کی نماز جاری تھی۔ امام مظہری نے دعا ختم کی تو نوری نمازیوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے امام صاحب سے استدعا کی کہ وہ ایک لڑکی کو ہمراہ لایا ہے اور اس سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ لڑکی بھی عقد کے لئے آمادہ ہے۔ براہ کرم نمازیوں کی موجودگی میں انہیں بندھن میں باندھ دیا جائے۔ اسی اثناء میں آمی بھی وہاں پہنچ چکی تھی اور نیچی سی چاردیواری کے پیچھے کھڑی نظر آ رہی تھی۔ نمازیوں کے لئے انوکھی صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی۔ چند بزرگوں نے بڑھ کر آمی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کی کہانی جاننے کی کوشش کی۔

''ہمارا عقد کروا دیں''۔ آمی نے برملا کہہ دیا۔

بات سن کر بیشتر افراد شش و پنج میں پڑ گئے۔ پڑھے لکھے افراد اپنی اپنی آراء دینے لگے۔ ایک وکیل صاحب کی رائے معتبر جانی گئی اور ان کے بیان کردہ طریقے پر عقد کا مرحلہ انجام دے دیا گیا۔ رسم عقد انتہائی مختصر تھی۔ آمی اور نوری نے باہمی قبولیت کا قصد دہرا دیا، اپنے اسماء اور ولدیتوں پر سے پردہ اٹھا دیا۔ بعد میں کوائف وکیل صاحب نے پاس رکھ لئے تاکہ مسجد سے ملحقہ نکاح رجسٹرار کے دفتر پہنچا سکیں۔

عقد کے بعد آمی اور نوری قریبی ہوٹل میں چلے گئے تاکہ آرام کر سکیں۔ وہ اگلی صبح دوبارہ سفر کرنا چاہتے تھے تاکہ اپنے علاقے سے کم از کم ایک ہزار میل دور پناہ ڈھونڈ سکیں۔ وہ اس بیچ چند گھنٹے وہیں روپوش رہنا چاہتے تھے۔

ایک ایسا شخص بھی رسم نکاح میں موجود تھا جس

کی ہمدردیاں چوہدری نادر کے ساتھ تھیں۔ جونہی اسے آمی کے کوائف کا اندازہ ہوا، اس نے فوری طور پر اپنا خاص آدمی جاگیر کی طرف روانہ کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ وقت ضائع کر دینا کس قدر بھاری پڑ سکتا تھا۔

اگلی صبح آمی اور نوری جب ریلوے سٹیشن کے قریب پہنچے تو انہیں احساس ہوا کہ چوہدری نادر کے غنڈے وہاں پہنچ چکے تھے۔ یہ جان کر ان کے جسموں سے گویا جان نکل گئی۔ انہوں نے راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کی اور ایک گاڑی والے سے لفٹ مانگی مگر اسی بیچ رائفل برداروں کے نرغے میں گھر چکے تھے۔ کسی بے قابو غنڈے نے بھاری رائفل کا بٹ نوری کے سر پر دے مارا۔ وہ چکرا کر زمین پر گر پڑا اور تڑپنے لگا، پھر ایک بھاری پاؤں اس کی گردن پر ٹک گیا۔ تھوڑی دیر بعد آمی اور نوری بے بس ہو چکے تھے اور چوہدری نادر کی جیپ پر لدے واپس جاگیر کی سمت جا رہے تھے۔

بیرسٹر اختر کی آواز میں افسردگی واضح محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے سگار کے کئی کش پھونک ڈالے۔ موسم جمادات و حیات پر بدستور بھاری تھا۔ کمزور پناہ گاہوں کے مکینوں پر لرزہ طاری تھا۔ ڈی ایس پی سعد سوچ رہا تھا کہ پولیس طاقتور افراد کے خلاف کس قدر بے بس نظر آتی ہے۔ داستان عشق جاری تھی۔

......★......

سورج دھرتی پر آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ صبح کی سردی میں تمازت نکھر گئی تھی مگر فضاؤں پر گہری افسردگی طاری تھی۔ گاؤں کے لوگ سہم گئے تھے۔ بڑا مجمع حویلی کے پہلو میں جمع ہو چکا تھا۔ نوری کو لکڑی کے پول سے باندھ دیا گیا تھا۔ اسے جب کھلی جگہ لایا گیا تھا تو اس کا بدن الم اور تھکن سے چُور دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے تمام رات تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ چوہدری نادر کے غنڈے اس دم بھی اپنی مخصوص دہشت گردی میں مصروف تھے۔ وہ گاؤں والوں کو مسلسل للکار رہے تھے اور طاقت کے خداؤں کا راگ الاپ رہے تھیں۔

یکا یک چوہدری نادر اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ منظر پر نمودار ہوتے ہی اس نے اپنا مخصوص ہنٹر ہوا میں لہرایا اور پوری قوت سے نوری کے بدن پر داغ دیا۔ دلخراش چیخ سکوت میں بلند ہوئی اور گاؤں کی فضاؤں میں بکھر گئی۔ کئی دیکھنے والوں کے دلوں پر بجلی کی طرح گری۔ نوری تڑپ کر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کا بدن الم سے سنبھلتا، ایک دوسرا وار اسے گھائل کر چکا تھا۔ اس بار اس کی چیخ اور بھی دلدوز تھی۔ پھر یہ سلسلہ لگاتار شروع ہو گیا۔ ہر وار پر نوری کا جسم ہچکولے کھانے لگتا۔ کتنے ہنٹر اس کے بدن پر جڑے گئے لوگوں نے گننا چھوڑ دیا۔ چوہدری نادر بھی تھکنے لگا تھا۔

''محبت لازوال ہے''۔ نوری نے قوت جمع کی اور نعرہ لگا دیا۔ اس کی درد میں ڈوبی ہوئی نوا رعد کی صورت طول و عرض میں پھیل گئی۔ چوہدری نادر نوری کی قوت برداشت پر حیران رہ گیا۔ اگلے پل اس کا لہراتا ہوا ہنٹر گھوڑے کی باگ میں الجھ کر رہ گیا اور وہ حواس باختہ نظر آیا۔ ''لوگو! جان لو، نادر کی بھتیجی آمنہ اب میری منکوحہ ہے۔ اپنی مرضی سے وہ میری رفیقہ ہو چکی ہے۔ مان لو کہ ہمارا پیار امر ہو کر رہے گا''۔ للکار سن کر چوہدری نادر کا طیش حدیں چھونے لگا۔

اس نے پوری قوت سے نوری پر وار کیا لیکن اس بار نوری نے نہ تو ہچکولے کھائے اور نہ ہی چیخا بلکہ اب وہ ہنس رہا تھا۔ چوہدری نادر گھوڑے سے اترا اور نوکدار پتھر اٹھا کر اسے دے مارا، جس پر نوری نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ ماجرا دیکھ کر گاؤں والے بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔

''لوگو! سن لو، عشق انمول مایا ہے، عشق پاک جذبہ ہے، عشق انسانی معراج ہے، عشق لازوال ہے''۔ نوری مسلسل بول رہا تھا۔

چوہدری نادر کو لگا کہ اس کے تمام حربے نوری پر بے اثر ہو چکے تھے اب اسے اپنا غیظ و غضب بھی عرفہ جذبوں کے مقابل ہیچ دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے اپنا پسینہ پونچھا اور ایک طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔ معاملہ قیمتی جاگیر کا نہ ہوتا تو شاید وہ ہار مان لیتا۔ نوری تشدد سہنے کے باعث مضمحل ہو گیا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف جھکی دکھائی دے رہی تھی اور اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اس کے لب البتہ متحرک تھے۔ غالباً وہ آمی کو صدائیں دے رہا تھا۔ لوگوں نے معاشرے کی بدصورتی دیکھی تھی، مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ مظلوم نوجوان کی دادرسی کر سکتا۔ یکا یک ایک عورت مجمعے سے نکلی اور ردا سمیٹتی ہوئی چوہدری نادر کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔

''خدا کا خوف کرو، چوہدری! کیا بشر پروردگار سے بڑا ہو سکتا ہے؟ اس کے قہر کو آواز نہ دو''۔ وہ ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔ ''جاگیریں انسانی خون چوسنے لگیں تو دریاؤں میں بہہ جاتی ہیں۔ زلزلے انہیں ملیامیٹ کر دیتے ہیں۔ ظلم حدوں سے بڑھ جائے تو ہوائیں بھی طوفانی روپ دھار لیتی ہیں اور فرعونوں پر پتھر برسانے لگتی ہیں''۔ وہ بولی۔ پھر وہ اپنے لختِ جگر سے لپٹ گئی، جو زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔

''کیا وہ ہستی عشق کے قابل نہیں ہو سکتی جس کے قدموں تلے خالق نے جنت رکھ دی ہے اور جس نے دھرتی کے تمام عاشقوں کو جنم دیا ہے؟ کیا عشق صرف ظاہری حُسن ہی کا حق ہے؟ کیا خوبصورت باطن عشق کے قابل نہیں ہو سکتا؟ عشق کرنا ہے تو اس سے کرو جس نے جذبوں کو قوت عطا کی ہے اور جو ہمیشہ یکتا رہے گا''۔ نوری کی ماں نے کہا۔ نوری ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اپنی آنکھیں موند لیں۔

''گھٹیا عورت! اپنی اوقات میں رہ۔ تم کسی ٹٹ پونجیئے سے مخاطب نہیں ہو۔ نوری نام کا لوفر کبھی تمہارا بیٹا تھا، اب وہ ہمارا داماد بن چکا ہے۔ کیا تم نے اس کی بات نہیں سنی؟ آؤ، اس کی تکریم کرو، اس کے آگے سر جھکاؤ، کورنش بجا لاؤ''۔ چوہدری نادر گرجدار میں بولا۔ اس کے لہجے کا گھٹیا تمسخر چہرے پر بھی بگڑ گیا تھا۔

''اب یہ ہمارے عرفہ خاندان پر نحوست کا سایہ تان چکا ہے، اس کی مہمانداری کی سزا بھی ہم ہی پائیں گے۔ تم واپس چلی جاؤ۔ اب یہ ہمارے محلوں میں ٹھہرے گا، جہاں خدام اس کی سیوا کیا کریں گے۔ تمہارے نصیب میں ہوا تو کبھی تمہاری کٹیا میں لوٹ آئے گا ورنہ اسے بھلا دینا''۔ اس نے مزید کہا اور دائیں ہاتھ سے ماتھے کا پسینہ ہوا میں بکھرا دیا۔

ماں کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ اس نے بولنا چاہا مگر اس کے لب لرز کر رہ گئے۔ وہ ساکت کھڑی چوہدری کی طرف دیکھتی رہی۔ آنسو اس کے گالوں پر پھسلنے لگے۔ اس نے چوہدری نادر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ پھر اپنا دوپٹہ اس کے قدموں میں بچھا دیا۔ اگلے ہی لمحے سفید کپڑا متکبر قدموں تلے رُلنے لگا۔

''تمہارے ڈھکوسلے مجھے متاثر نہیں کر سکتے۔ جاؤ، میری نظروں اوجھل ہو جاؤ۔ اب یہ ڈھونگی ڈھینگرا ہمارے ہاں رہے گا۔ کوئی ہے جو اس بدتمیز ڈھڈو کو ساتھ لے جائے؟'' چوہدری نادر ایک بار پھر دھاڑا۔

بات انتہا پر پہنچ چکی تھی۔ نصیب خان انبوہ سے نکلا اور قلانچیں بھرتا بیوی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے دکھیا خاتون کو کھینچ کر ایک طرف کر دیا اور خود لرزتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر چوہدری نادر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''لے جاؤ، اس منہ پھٹ عورت کو''۔ چوہدری نادر پھر کلکارا۔ ''یہ خاندانی ہوتی تو ایسا مجرم کیوں جنم دیتی؟'' اس نے کہا اب وہ غصے میں کانپ رہا تھا۔ بستی والوں کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اب وہ مزید کیا کہے گا۔

''اور ہاں، سن لو''۔ وہ بولا۔ ''میں اپنی جاگیر

کے کونے پر گندگی مزید برداشت نہیں کرسکتا۔ بہت تماشہ ہو چکا۔ اپنی بنجر خاک کے دو ٹکڑے مجھے بیچ ڈالو، ورنہ میرے بندے جاگیر کا کونہ کھدرا سیدھا کرنا جانتے ہیں۔ میں بہت لحاظ کر چکا۔ چھوڑ دو یہ علاقہ، بڑے آئے زمیندار۔ ذات کی چھپکلیاں اور شہتیروں سے چپھے"۔ چوہدری نادر کے حکم صادر کیا اور اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔

نوری کے ماں باپ نے منت سماجت کے لئے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن چوہدری نادر کے مصاحبوں نے انہیں روک لیا کہا کہ۔ "چوہدری صاحب جو چاہتے ہیں، اس پر عمل کیا جائے، بس"۔ ادھر چوہدری نادر اپنے کارندوں کو حتمی مشورے دے رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے نیم بے ہوش نوری کو خچر پر باندھ دیا اور نامعلوم مقام کی طرف نکل گئے۔

انبوہ کے افراد اب چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے، چند ایک چوہدری نادر کے قریب بھی پہنچ گئے تھے۔

"اگر کسی گمراہ مولوی نے بول پڑھا دیئے ہیں، تو اسے خاموشی پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ رجسٹر کون سی آسمانی کتاب ہے کہ جس میں سے ورق نہیں پھاڑے جاسکتے۔ گواہ اگر واویلا مچا دیں تو ان کی زبانیں گنگ بھی کی جا سکتی ہیں۔ جاؤ انہیں میرا بتاؤ، نہیں تو مایا صرف کرو، پیسہ ہو تو کون سا کام نہیں نکل سکتا؟" چوہدری نادر کہہ رہا تھا۔

"نوری اگر مر جاتا تو آج میرے دل کو تسلی ہو جاتی"۔ دوسرے کونے میں کھڑی اس کی ماں نے کہا۔

"موجودہ صورت میں تو عمر بھر کا رونا ہے"۔ ممتا کی ماری بار بار کہہ رہی تھی۔

"بیٹا کیا گیا، ساتھ ہماری روزی بھی لے گیا"۔ نصیب نے بے چارگی سے سینے پر ہاتھ مارا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"آج شام اسے اندھے کنوئیں میں پھینک ڈالنا"۔ چوہدری نادر نے اپنے پوردہ غنڈوں کو حکم دیا۔ اس کا اشارہ نوری کی طرف تھا۔

"چوہدری صاحب! جاڑے کا آغاز ہے، سانپ اور بچھو اس موسم میں بلوں کی طرف سدھار جاتے ہیں۔ کنوئیں میں زہریلے حشرات باقی نہیں رہتے"۔ ایک کارندے نے التجا کی۔ معاملہ جان کر چوہدری نادر غضب ناک ہوگیا۔

"جسے رحم کرنے کی بیماری لگ گئی، میں اسے جہنم واصل کر دوں گا"۔ وہ چلایا۔ "میں نہیں جانتا، مجھے زہریلے ناگ کنوئیں میں چاہئیں، چاہے تم کہیں سے پکڑ کر لاؤ۔ کیا بین بجانے والے سپیرے مر گئے ہیں؟" وہ دھاڑا۔ کارندوں کے چہرے پیلے پڑ گئے۔ کسی میں جرأت نہ تھی کہ وہ گفتگو کو طول دیتا۔ کارندے ایک طرف ہٹ گئے جبکہ غنڈے حکم کی تعمیل پر تیار نظر آئے۔

جاگیر کی حدود میں چند اندھے کنوئیں موجود تھے۔ اسی دن نوری کو ایک اندھے کنوئیں میں پھینک دیا گیا۔ دو تین کارندوں نے اس پر نیکی کر دی تھی جو چہ چا کئے بغیر اس کے بدن پر ہلدی کا لیپ کر دیا تھا اور اسے پانی بھی پلاتے رہے تھے۔ اس بیچ ان کے دل سے اس کے لئے دعائیں بھی نکل جاتیں۔ سب جانتے تھے کہ چوہدری نادر ظلم کی مد میں حیوانی جذبات رکھتا تھا اور اکثر کنوئیں میں بل کھاتے سانپوں کو دیکھ کر لطف محسوس کیا کرتا تھا۔

"میری عادتیں عجائب کا مجموعہ رہی ہیں"۔ وہ خود بھی اعتراف کرتا تھا۔

......★......

یوں تو آمی حویلی میں مقیم تھی، مگر اس کے لئے حویلی کی فضا بدل چکی تھی۔ جب سے اس کے والد چوہدری فضل کا انتقال ہوا تھا، عملاً تمام جائیداد پر اس کا چچا، چوہدری نادر قابض ہو چکا تھا۔ اس کا بیٹا، چوہدری

دلاور تو آمی پر بھی اپنا حق جتایا کرتا تھا حالانکہ آمی اسے ناپسند کرتی تھی۔

نکاح کے بعد جب سے آمی حویلی واپس لائی گئی تھی، وہ اپنے کمرے میں محصور تھی۔ دیگر مکینوں کے ساتھ اس کے روابط عملاً ختم ہو چکے تھے۔ نوری کا معاملہ نمٹانے کے بعد چوہدری نادر آخرکار اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ دونوں کے درمیان ہونے والی ملاقات انتہائی تلخ رہی۔

"تم نے آباؤ اجداد کی ساکھ کو ڈبو کر رکھ دیا ہے، ان کی روحیں تم پر تین تین حرف بھیجتی ہوں گی"۔ ملاقات کے دوران چوہدری نادر نے کہا۔

"جو آپ نے نوری کے ساتھ کیا، کیا ہمارے اجداد اس پر فخر کرتے ہوں گے؟" آمی نے سوال کیا۔

"تلافی اسی صورت ممکن ہے کہ تم وقت ضائع کئے بغیر دلاور سے بیاہ کرلو"۔

"میں نوری کی منکوحہ ہوں"۔

"مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہ لگاؤ، کوئی بھی جعلی نکاح تسلیم نہیں کرسکتا"۔

"میں نوری کو نہیں چھوڑ سکتی"۔

"وہ تمہاری جائداد ہتھیانا چاہتا ہے"۔

"میں اپنی جائیداد پہلے ہی آپ کو دے چکی ہوں"۔

"باقی تمہارے نکاح کے ساتھ دلاور کے پاس چلی آئے گی۔ میں یہی چاہتا ہوں"۔

"میں کسی پاگل کو نہیں اپنا سکوں گی"۔

"میرے غصے کو ہوا نہ دو"۔

"جیوں گی تو نوری کے لئے، ورنہ بے کار زندگی پر موت کو ترجیح دوں گی"۔

"سوچ لو"۔

"بغیر سوچے بات نہیں کرتی"۔

"جو بھی نادر کے مقابل آیا، اسے دھرتی نے نگل لیا"۔

"اللہ سے بڑا کوئی نہیں ہوسکتا"۔

اسی روز چوہدری نادر نے حویلی میں اعلان کر دیا کہ وہ آمی کے لئے قبر کی سزا تجویز کر رہا ہے۔ جاگیر میں آبائی قبرستان کے قریب ایک پُراسرار پکی قبر موجود تھی، جس کے بارے میں کئی کہانیاں سنائی جاتی تھیں۔ یہ قبر ہمیشہ ہی سے خالی رہی تھی مگر نافرمانوں کو ایذا پہنچانے کے لئے بارہا استعمال کی گئی تھی۔ اس کی تہہ تک رسائی کے لئے سیڑھیاں موجود تھیں، مگر ان کے سہارے نیچے اتر جانا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ حویلی کے پرانے مصاحب اس قبر کو آسیب زدہ گردانتے اور اس کی طرف آمدورفت سے منع کیا کرتے تھے۔ کسی جاگیردار نے یہ قبر اپنے لئے بنوائی تھی جس میں کسی وجہ سے وہ دفن نہ ہوسکا۔

"اگر تم لایعنی ڈھونگ کو واقعی نکاح سمجھ بیٹھی ہو تو میں تمہیں خلع دلوا سکتا ہوں"۔ چوہدری نادر نے آمی کو سوچنے کا ایک آخری موقع اور دیا۔ آمی نے تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔ نوعمر لڑکی اس دم بہت بے بس دکھی، جب چوہدری نادر کے کارندے اسے زبردستی حویلی کی آسائش سے قبری عقوبت خانے کی طرف لے جا رہے تھے۔ محلوں کی شہزادی یکدم ذلت کے گڑھے میں گر پڑی تھی اور اس کی بے ربط چیخیں حویلی میں تماشہ بھائی دے رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد دھکم پیل کے ذریعے اسے قبر کی خوفناک گہرائی میں اتار دیا گیا، پھر اس کا دایاں بازو مضبوط ہتھکڑی میں جکڑ دیا گیا۔ اب وہ قبر کی سیڑھیاں تو چڑھ سکتی تھی، مگر وہاں سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔

"میں کسی صورت بھی ہار نہیں مانوں گی"۔ آمی نے چوہدری نادر کے غنڈہ حواریوں پر واضح کر دیا۔

ادھر نوری اندھے کنوئیں میں موت کا انتظار کرتا رہا۔ اس مقام پر اس کی تیسری شب کا آغاز ہو چکا تھا مگر

موت کی منزل سے اس کی دوری کم نہیں ہوئی تھی۔ اسے لگا کہ بین بجانے والے بھی تھک ہار چکے تھے۔ چند زہریلے سانپ باری باری کنوئیں میں پھینکے گئے تھے مگر نوری نے انہیں پتھریلی دیواروں پر پٹخ کر مار ڈالا تھا۔ وہ یہ ڈھنگ جانتا تھا۔ چوتھے روز اسے کنوئیں سے باہر نکال لیا گیا۔

”کنوئیں کا خوف عشق کے مسئلے کا موثر حل ہو سکتا تھا لیکن اب مجھے اسے چھوٹی جاگیر روانہ کرنا پڑے گا“۔ چوہدری نادر نے مایوسی کے عالم میں اپنے معتمد کارندے کو حکم دیا اور ناگواری سے قدم اٹھاتا ہوا شکارگاہ کی طرف نکل گیا۔

اس کے نزدیک انسانوں اور جانوروں کے شکار میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ آمی جان چکی تھی کہ اس کے خلاف نفسیاتی جنگ کے حربے استعمال کئے جا رہے تھے تاکہ اسے کسی طرح جھکایا جا سکے لیکن اس تمام کھیل میں اس کی جان بھی ارزاں سمجھ لی گئی تھی۔ معاملہ جان لینے کے باوجود بھی پرانے قبرستان کی ہیبت اس کے حواس پر سوار ہو گئی تھی۔ خصوصاً رات کے وقت قرب و جوار میں ابھرنے والی صدائیں اسے انتہائی خوفزدہ کر دیتیں اور ایذا اس پر اس قدر بڑھ جاتی کہ اسے اپنا دھڑکتا دل رُکتا ہوا محسوس ہوتا۔ کبھی اس کے حلق سے دلخراش چیخیں ابھرتیں، جو فضاؤں میں بکھر جاتیں مگر کوئی جواب نہ حاصل کر پاتیں۔ کبھی کوئی پہریدار قریب سے گزرتا تو چند لمحے اس کی جان میں جان آ جاتی مگر کسی شخص میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اسے دلاسہ دے سکتا یا نزدیک آ کر کہیں کچھ دیر ٹھہر جاتا۔ وہ نام لے لے کر پکارتی، خصوصاً بے حال ہو جاتی مگر کوئی اسے پانی تک نہ دیتا۔ ان دنوں البتہ اس کا ایک پُراسرار رفیق بن گیا تھا جو انتہائی خوفناک تھا۔ یوں تو حشرات الارض قبرستان کے علاقے میں اکثر گھوما پھرا کرتے تھے مگر ایک سفید اژدہا خصوصاً آمی کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا جو بسا اوقات اس کے قریب سے گزر جاتا۔

ایک رات پچھلے پہر روشنی کا چمکدار ہالہ بھی اسے اپنی طرف محوِ سفر نظر آیا۔ یہ قبر میں اس کی اکیسویں رات تھی۔ تیز روشنی اسی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پھر اسے گھوڑوں کی ٹاپیں بھی سنائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد چوہدری نادر اس کے قریب کھڑا تھا۔ لگا اس نے شراب پی رکھی تھی۔ آمی کو دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا۔ اس کی اس دہشت بھری آواز نے خفتہ حیات کو جگا دیا۔ جواباً کئی بولیاں گورستان سے ابھرنے لگیں۔

”چھوہری! کیوں اپنی جان آزمائش میں ڈالتی ہو؟ عشق کا بھوت سر سے اتار دو اور اپنی زندگی میں واپس چلی آؤ۔ وہ پھوہڑ اور مسکین تمہیں کیا دے گا؟“ چوہدری نادر نے اونچی آواز میں کہا۔

”مر جاؤں گی مگر پیار اسی سے نبھاؤں گی، جس کی خاطر دنیا میں اتاری گئی ہوں۔ یہی میرا آخری فیصلہ ہے۔ یہ بات اچھی طرح سن لو، چوہدری نادر خان!“ آمی نے جواب دیا۔ ”اور ہاں، اگر میں یہاں مر جاؤں تو مجھے اسی قبر میں دفنا دینا، یہ سمجھ کر کہ یہ گور تمہارے دادا پردادا نے میرے لئے تحفتاً بنائی تھی“۔ اس نے مزید کہا۔

”حسین چڑیل! اس قبر میں بھی تمہارا نخرہ نہیں گیا، یہ جگہ بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکی“۔ چوہدری نادر کسی طرح بھی مکمل حواس میں نہیں تھا۔ آمی بُری طرح ڈر گئی۔

اسی وقت سفید اژدہا قبرستان سے برآمد ہوا، جسے قریب پا کر سیاہ گھوڑا بُری طرح بدکا۔ چوہدری نادر نے عفریت کی طرف دیکھا تو اس ڈر کے مارے اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ اس نے بغیر وقت ضائع کئے وہاں سے راہِ فرار اختیار کی۔ خوش قسمتی سے اس شب اژدہا فجر تک قبر کے قریب ہی پھرتا رہا۔ اگلے روز آمی کا ٹھکانہ تبدیل کر دیا گیا۔ قبر کے نزدیک ہی گورکن کا پرانا خستہ

مکان موجود تھا جسے ویران ہوئے کئی برس بیت چکے تھے۔ اس بوسیدہ عمارت کو آمی کے لئے تیار کیا گیا جہاں اسی شب اسے قید تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ زندان کی نوعیت دیکھ کر آمی کو اپنے مستقبل کا ادراک بھی ہو گیا۔

......★......

چھوٹی جاگیر کا علاقہ گویا کالا پانی تھا جہاں پہنچنے کے لئے دشوار گزار پہاڑی علاقوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ چوہدری نادر کی اس دور دراز علاقے میں دلچسپی کی وجہ سنگِ مرمر کے وسیع ذخائر تھے جہاں سے پتھر نکالنے کا ٹھیکہ اس نے لے رکھا تھا۔ اس کے کارکن وہاں ہمہ وقت مصروف کار رہتے تھے۔ موسم کی سختیوں میں بھی جفاکشی جاری رہتی تھی۔ کارکن غلاموں کی صورت دکھائی دیا کرتے تھے۔ افرادی قوت کی غالب اکثریت جبری مشقت کرنے والوں کے زمرے میں آتی تھی۔ ایسے خاندان بھی موجود تھے جو سالہا سال سے مجبوریوں کی اس چکی میں پس رہے تھے۔ ان پر گرفت بھی آہنی ہوا کرتی تھی اور وہ اپنے شب و روز کڑے پہروں میں گزارا کرتے تھے۔ انہی پہاڑوں میں چوہدری نادر کے نجی جیل خانے بھی واقع تھے جن میں عموماً نافرمانوں کو رکھا جاتا تھا۔ عقوبت خانے انہی جیلوں کا حصہ تھے۔ چوہدری نادر کے شاطر کارندے پالتو غنڈوں کی مدد سے چھوٹی جاگیر کا نظام چلایا کرتے تھے۔ بدقسمتی سے قانون کو ان علاقوں سے زیادہ سروکار نہیں تھا۔

نوری کو کنوئیں سے نکالا گیا تو وہ خاصا مضمحل دکھائی دے رہا تھا۔ اس وقت بھی غنڈوں نے مار مار کر اسے ادھ موا کر دیا۔ بسا اوقات شاہ کے مصاحب بھی اپنا خراج وصول کرنے سے نہیں چوکتے۔ ان کے لئے اچنبھے کی بات تھی کہ نوری کا جذبہ عشق اس دم بھی سلامت تھا۔ حواس بحال ہوئے تو وہ کسی ٹرک پر محوِ سفر تھا۔ اس کا وجود ساز و سامان کے انباروں تلے چھپایا گیا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ چوہدری نادر کے کارندے باہم گفتگو کر رہے تھے۔ یہ گفتگو ان کی عادات کی طرح گھٹیا تھی۔

نوری کو معلوم ہو گیا کہ اس کی قید تنہائی شروع ہونے والی تھی جو برسوں پر محیط ہو سکتی تھی۔ اس بیچ اسے قتل بھی کیا جا سکتا تھا۔ چوہدری نادر ہر صورت آمی کی جائداد ہتھیانا چاہتا تھا۔ اس بابت وہ ہر حربہ بروئے کار لا سکتا تھا۔ نوری کو اندازہ ہوا کہ چوہدری نادر کے لئے اس کا وجود مٹا دینا آسان نہیں تھا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ بستی کے لوگ اس کے حد درجہ ظلم کے باعث مضطرب ہو چکے تھے اور چند نوجوان جان ہتھیلی پر رکھ کر اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر سکتے تھے، خصوصاً وہ کڑیل افراد جنہیں اکثر وہ کمین گروہ کہا کرتا تھا۔ اس گروہ کے چند اراکین وہ چھوٹی جاگیر بھی بھجوا چکا تھا جہاں انہیں مشقت کے دوران پاؤں میں بیڑیاں پہنائی جاتی تھیں۔ چوہدری نادر کو اندیشہ تھا کہ نوری کمین گروہ کی طاقت میں بے پناہ اضافہ کر سکتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نئی نسل قانونی راستوں سے آشنا ہو رہی تھی۔

رات گئے نوری سمیت قافلہ اپنی منزل پر پہنچ گیا جہاں اس کا استقبال ہرزہ سرائی سے کیا گیا۔ اس وقت ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ٹرک ایک مختصر عمارت کے پہلو میں کھڑا تھا، اس عمارت کے تہہ خانے میں ایک کمرہ نوری کے لئے منتخب کیا گیا تھا جس کے روشندانوں میں لوہے کی سلاخیں بہت مضبوط تھیں۔ ایک ناگوار مہک کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں نوری کا دم گھٹنے لگا۔

”اب یہی تمہارا ٹھکانہ ہے جوان! اسے جنت جانو یا جہنم کہو“۔ ایک کارندے نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس کی ہتھکڑیاں کھول کر اسے پاؤں سے ٹھوکر ماری۔ نوری سیدھا دیوار پر جا لگا۔ ”عشق اتنا لازم تھا تو کسی ہم پلہ کے ہاں منہ مار لیتے“۔ اسے طعنہ دیا گیا۔

''خواب جتنے اونچے ہوں گے، شعلے اسی قدر زیادہ بھڑکیں گے جو آخر سب کچھ جلا کر بھسم کر دیں گے''۔ایک دوسرے شخص نے کہا۔

نوری ٹھوکر سے سنبھلا تو زنداں کا در بند ہو چکا تھا۔اس نے بصد مشکل رات کے چند گھنٹے بسر کیے، صبح اسے احساس ہوا کہ تہہ خانہ انتہائی مہیب مقام تھا جس کی دیواروں سے جا بجا پانی رس رہا تھا۔صفائی کے فقدان کی وجہ سے اندر مچھروں کی بھرمار تھی۔وہاں روشنی بھی بہت کم آتی تھی۔دن کی نیم تاریکی شب تاریکی میں مدغم ہو جایا کرتی تھی۔یہ مناظر دیکھ کر اس کا دل بہت گھبرایا اور حوصلہ بھی ٹوٹ گیا۔ذہن پر بوجھ پڑا تو وہ زور زور سے چیخنے لگا۔دروازے پر ٹکریں ماریں اور دیواروں پر مکے اور ٹھڈے برساتا رہا، پھر تھک ہار کر فرش پر ڈھیر ہو گیا، سوائے ہاتھ پاؤں تڑوانے کے وہ کچھ بھی نہ پا سکا۔

''ہر برس سرما کی بارشوں سے دیواریں گیلی ہو جاتی ہیں۔ابر رحمت کا دور لد گیا تو ہر طرف مہیب خشکی پاؤ گے اور بوند بوند پانی کو ترس جاؤ گے''۔صبح اسے کھانا دینے والے نے سمجھایا۔

''تمہاری یہاں سے نجات صرف اسی طرح ممکن ہے کہ تم آمی سے ناطہ توڑ لو اور چوہدری نادر سے اپنی خطاؤں پر معافی مانگ لو۔اس طرح آمی کی مشکلات بھی ختم ہو جائیں گی۔ویسے بھی آمی جذبات کی رو میں بہہ رہی ہے، وہ تم جیسے کمتر شخص کے ساتھ کیسے جیون نبھاہ سکتی ہے؟'' اس شخص نے مزید کہا۔نوری تھوڑی دیر خاموش رہا، بیچ حواس پر قابو پایا پھر بولا۔

''عشق کا طوق گلے لگا کر جان دے دینا وفاؤں کے قتل سے بدرجہا بہتر ہے''۔یہی اس کا حتمی جواب تھا جو چوہدری نادر کو موصول ہو گیا۔

''تمام جائداد مجھ سے لے لو، مجھے اور نوری کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے دو''۔آمی نے بارہا چوہدری نادر کو یہی پیغام دیا تھا۔وہ اپنی جائداد سے دستبردار ہونے پر آمادہ تھی مگر تصفیے کی یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔چوہدری نادر کو یقین ہو چکا تھا کہ اسے اگر آمی کو اپنی بہو بنانے کا خواب تعبیر تک پہنچانا ہے، تو اسے نوری کو راستے سے ہٹانا پڑے گا ورنہ جائداد میں پھیلاؤ کے بارے میں اس کا خواب ادھورا رہ جائے گا۔خوابوں سے منسلک اس کے اندیشے بھی شدید تھے۔وہ آمی کے خالو سے کسی حد تک ڈرتا تھا۔یہی واحد شخص تھا جو اس کے مقابل کھڑا ہو سکتا تھا اور بھانجی کی بے لوث مدد کر سکتا تھا۔بہن کی وفات اور روابط میں بُعد کی وجہ سے وہ فی الحال آمی کے معاملات سے ناآشنا ہو چکا تھا۔

قید تنہائی جب نوری کی قوتِ برداشت سے بڑھنے لگتی تو وہ گردموجود کارندوں کی منت کیا کرتا کہ اسے مشقت کے لئے باہر نکالا جائے تاکہ وہ روشن دھرتی کسی طور دیکھ سکے۔اگر اس کی تمنا رد کر دی جاتی تو وہ چیخیں مارتا، چلاتا، دیواروں سے سر ٹکراتا اور کارندوں کو بددعائیں دیتا۔پھر بے بس ہو کر اونچی آواز میں رونے لگتا۔تھکتا تو ایک طرف کونے میں سما جاتا اور ''آمی آمی'' پکارتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو جاتا۔کبھی متوازن حواس میں لوٹ آتا تو کسی طور کتب حاصل کرنے کی سعی کرتا جو اس کے دُکھوں کا کسی حد تک مداوا کیا کرتی تھیں۔کتنے برس تہہ خانے کی نذر ہوئے، وہ یہ نہیں جانتا تھا مگر اتنا علم ضرور رکھتا تھا کہ اس کی زنداں میں آمد کے بعد عمارت کی دیواریں چھ مرتبہ بارشوں کے باعث گیلی ہوئی تھیں اور باراں کا پانی اندر فرش پر پھیل گیا تھا۔ایسے ہی شدید موسم میں اسے قید و بند میں ڈالا گیا تھا۔

ادھر آمی کی کیفیت بھی نوری سے جدا نہیں تھی بلکہ حالات کی چکی میں پس کر وہ مکمل طور پر مخبوط الحواس ہو چکی تھی۔حویلی میں اسے پاگل یا دیوانی کے لقب سے موسوم کیا جاتا تھا۔وہ حرکات بھی ایسی ہی کیا کرتی تھی۔

مسلسل ذہنی دباؤ نے اس کا دماغی توازن مفلوج کر دیا تھا۔گھنٹوں بے ربط صداؤں میں چلایا کرتی، کبھی بیچ میں قہقہے بھی برسانے لگتی۔

اپنے والدین کو صدائیں دیتی تو کبھی نوری کو پکارا کرتی۔چوہدری نادر کو اس کی بگڑتی ہوئی دماغی صحت کے بارے میں علم تھا مگر وہ اس سے لاتعلق رہا۔حصول جائداد کی تمنا نے اس کا دل پتھر کر دیا تھا۔ایک شام اس نے اپنے پوشیدہ مکروہ عزائم بیٹے دلاور پر بھی آشکار کر دیئے، کہا۔

''تم آمی سے بیاہ کر لو''۔

''میں؟'' دلاور بُری طرح چکرایا۔

''ہاں، دلاور! تم''۔

''مگر وہ تو پاگل ہو چکی ہے''۔

''بعد میں ایک نئی بیوی بھی ڈھونڈ لینا''۔

''پاگل سے شادی کیوں ضروری ہے، آخر کون سی آفت آن پڑی ہے؟''

''ضروری ہے، اولاد جنم دلوانے کے لئے''۔

''اس سے پگلی کو کیا فائدہ ہو گا؟''

''فائدہ اسے نہیں ہو گا، تمہیں ہو گا۔اس کی جائداد تمہارے دامن میں آن گرے گی''۔

''وہ کیسے؟''

''بچہ اس کی جائداد کا وارث ہو گا''۔

''دیوانی سے شادی بڑا مشکل کام دکھائی دیتا ہے''۔

''سوچ لو، برخوردار! دریا کے کنارے واقع زمین سونا اگلتی ہے اور مشرقی سمت والے باغ پھلوں سے لدے بہانے دِکھتے ہیں۔کیا ان پر ہمارا قبضہ ضروری نہیں؟''

''لیکن میں پاگل لونڈیا سے نبھاہ کیسے کروں گا؟''

''یہی تو امتحان ہے لختِ جگر! بعد میں بڑے مزے ہیں۔تم تمام جائداد کے مالک بن جاؤ گے''۔

''تجویز بجا دکھتی ہے''۔

''سال بھر کا قصہ سمجھو، یہ کم بخت پاگل خانے سدھار جائے گی۔گئی تو سمجھ لو جہنم واصل ہوئی۔نہ میں چاہوں گا اور نہ یہ وہاں سے باہر نکلے گی۔گمنامی میں مر کھپ جائے گی''۔دلاور خاموش رہا، سوچ میں نظر آیا۔

''سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی''۔چوہدری نادر نے مزید کہا۔

''منصوبہ احسن ہے، مگر اس کے علاوہ بھی راستے ہوں گے، جو حصول جائداد آسانی سے ممکن بنا دیں؟''

''عملاً تو ساری زمین میرے قبضے میں ہے، حویلی اور سرمایہ بھی مگر جی میں کانٹا سا کھبا رہتا ہے کہ چھوہری کا وجود ابھی سلامت ہے۔کبھی بظاہر مرے ہوئے سانپ بھی جی کر حملہ کر دیتے ہیں۔بھائی جان کے مرنے پر جب تقسیم ہوئی تھی تو میری کوشش تھی کہ باغات مجھے مل جائیں مگر خاندان والوں نے پلڑہ لڑکی کی طرف بھاری رکھا۔خصوصاً اس کے خالو چوہدری نبی داد کا کردار خاصا ظالمانہ تھا۔اس کا بس چلتا تو بھائی کی تمام جائداد اس کی بیٹی کے حوالے کر دیتا۔وہ تو شکر ہے کہ اس نے میرے عارضی مختار بننے پر اعتراض کرنا مناسب نہ سمجھا۔تمام موروثی جائداد پر بظاہر تصفیہ ہو گیا تھا مگر میں نے اسی وقت قسم کھائی تھی کہ یہ زمینی میوے حاصل کر کے رہوں گا، چاہے اس کے لئے مجھے کوئی بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے''۔

''روزِ قیامت آپ بھائی کو اپنے کہے پر کیا توجیہہ دیں گے؟''

''بے کار قسم کی سوچوں سے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ الجھاؤ بڑھتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے، ابا! آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی

ہوگا''۔

''شادی کی تیاری کرلو''۔

''رسم کیسے ممکن ہوگی؟''

''خدام ہی معاملے سنبھالیں گے۔ لڑکی مختصر ترین وقت کے لئے سٹیج پر آئے گی۔ نکاح کے فوراً بعد اسے الگ کرلیا جائے گا۔ بعدازاں وہ تمہاری نگرانی میں رہے گی۔ بندھن کے بعد اسے پاگل قرار دلوانا ہمیں ماضی کی پیچیدہ سرگرمیوں سے بھی بری الذمہ ٹھہرادے گا۔ ہم پر خلق کی انگلیاں نہیں اٹھیں گی، شکوک نہیں ابھریں گے۔ تمہارا اس سے اولاد پالینا ہمیں ہر پہلو سرخرو کردے گا''۔

''گزشتہ پانچ برسوں کی سیاہی کون مٹائے گا؟''

''ہمارے گھریلو معاملات صرف خدام جانتے ہیں۔ مجوزہ بیاہ ممکن ہو جائے تو ہر کوئی ماضی پر مٹی ڈال دے گا۔ میں یہ بزور بھی کرواسکتا ہوں''۔

''اور وہ نکاح، جو اس نے نوری سے کیا تھا؟''

''کیا ثبوت ہے اس کا؟ وہ ایک افواہ تھی جو دم توڑ چکی۔ چلو مان لیتے ہیں کہ نکاح ہوا تھا تو بھی۔ خاوند گرلاپتہ ہو جائے تو منکوحہ کیا عمر بھر اس کا انتظار کرے گی؟ دلاور بیٹا! ویسے بھی پاگل خانے جانے کے بعد اس سے وابستہ اس نوع کے معاملات اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ تمہیں اب سنجیدگی سے آگے بڑھنا چاہئے۔ یہ بیاہ اس کی زندگی سے پچھلے پانچ برس مٹادے گا اس کی کہانی وہیں سے شروع ہوگی جہاں سے وہ حویلی چھوڑ کر زندان گئی تھی بلکہ وہ زندان گئی ہی نہیں تھی''۔

★

چوہدری نادر کی حویلی بقع نور بنی ہوئی تھی۔ چراغاں کی بہار مایا کی تاب دکھا رہی تھی۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ تقریب کا آغاز تھا۔ یہ بزم رنگ و سرود روایتاً سبزہ زار پر سجائی گئی تھی جس کے گرد پھول فضا مہکا رہے تھے اور احمرین سنگ کے فوارے ہوا میں آبگینے برسا رہے تھے گیلی فضا کی تراوت ماحول پر طاری تھی۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ سرِ شام ہی جاری تھا۔ رات ڈھلی تو رنگ برنگ لباسوں کی قوس قزح حویلی میں اتر آئی اور فضا بڑھ کر جگمگانے لگی۔ ہر سو دلوں میں جوڑے کے لئے امنگیں مچلتی دکھائی دیتی تھیں۔ تقریب کا آغاز ہوا تو موسیقی کی تانیں ہواؤں میں بکھرنے لگیں۔ پھر جواں روپ جسم انگ اور لے پر تھرکنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد محفل جوبن پر آ گئی۔ حویلی کا دبدبہ حسن فن سے پگھلنے لگا، گو طول و عرض پر سراسیمگی کا انجانا عنصر ہر دم غالب دکھائی دیا اور فضا انجانے خوف سے لرزتی رہی۔ حویلی کے خدام بھی بجھے بجھے نظر آتے تھے۔

''شور مچاتی ہوائیں مجھے باور کراتی ہیں کہ اشجار پر شیاطین قہقہے برسا رہے ہیں''۔ حویلی کی پرانی خادمہ نے دیگر عورتوں سے کہا۔

''کچھ غلط ہو گیا تو سب بے موت مارے جائیں گے''۔ ایک دوسری عورت بولی۔ آمی کو سٹیج پر لے جانے کا وقت آ چکا تھا۔ نکاح خواں وہاں پہنچ چکا تھا۔ مدعوئین بھی دیر سے دلہن کے ناطے رخ محفل سجانے کا تقاضا کر رہے تھے۔ ادھر خدام لڑکیوں نے آمی کا عروسی روپ سجانے میں انتھک محنت کی تھی اور واقعی دلہن جب سبزہ زار پر محوِ خرام ہوئی تو حاضرین نے اپنے دل تھام لئے۔ لگا جیسے فلک کا چاند زمین پر اتر آیا تھا۔ اس نسوانی پھبن کو دیکھنے والوں کی طرف سے مثالوں کا جامہ پہنایا گیا تو الفاظ و خیال کے ذخائر کم پڑ گئے۔

چوہدری نادر کا ذہن البتہ وسوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ الجھاؤ کے ان گورکھ دھندوں کے باوجود لمحہ بھر وہ دلہن کے حسن میں کھو کر رہ گیا۔ پھر ایک تیکھا سا احساس اس کے دماغ میں جاگزیں ہوا کہ کاش نوری کا قصہ وجود نہ پاتا، تو وہ اپنی بھتیجی کو بخوشی عزت کی ردا اوڑھا دیتا مگر

حقیقی دکھ یہ تھا کہ وہ خود ہی اس لڑکی کی بربادی کا ذمہ دار بن چکا تھا۔ یہ خیال اسے اس دم پریشان کرنے لگا تھا۔ اُدھر دلہن اس کے لختِ جگر کے پہلو میں براجمان ہو چکی تھی۔ مسکراہٹ چوہدری نادر کے لبوں پر پھیل گئی۔ اپنے خوابوں کے سراب اسے ممکنات کا روپ پاتے دکھائی دیئے۔ تصور میں بھائی نے گلہ کیا تو کئی تلخ خیال اس نے ذہن سے جھٹک دیئے۔ اسے سنائی دیا کہ حاضرین اپنی چہ میگوئیوں میں عروسی جوڑے کی ستائش کر رہے تھے۔ پھر یکا یک منظر نے پلٹا کھایا اور تلخ حقائق مصنوعی پن کے فریب پر حاوی دکھائی دینے لگے۔

جونہی مولانا صاحب نے رسم نکاح کا آغاز کیا آمی بپھر گئی۔ اس نے ایک خوبصورت بلا کا روپ دھار لیا اور سٹیج سے نیچے اتر آئی۔ حاضرین اس اچانک تبدیلی پر انگشت بدنداں رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ کوئی سنبھل پاتا آمی نے رقصاں لڑکیوں پر ہلہ بول دیا۔ ایک کو دکھا دے کر زمین پر پٹخا جبکہ دوسری کا گلا دبوچ لیا۔ لوگوں کو دیکھتے پر یقین نہ آیا۔ حاضرین میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اب آمی پوری طرح پاگل نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر قہر و غضب جھلک رہا تھا۔ خدام اس پر قابو پانے کے جتن کر رہے تھے جبکہ وہ جواباً مقابلہ کر رہی تھی۔

''پکڑنا اس پاگل کو، ورنہ یہ کسی کا خون کردے گی''۔ بوڑھی خادمہ نے پریشانی میں ہانک لگائی۔

''دورہ پڑ گیا، اوہ، دورہ پڑ گیا''۔ چوہدری نے حاضرین کو باور کرایا۔

''لڑکی پر مرگی کے دورے پڑتے ہیں، آج اس نے دوا نہیں کھائی ہوگی''۔ اس نے زور دے کر کہا۔ پھر خدام کو بری طرح کوسنے لگا۔ اس کے چہرے پر ابھرا تاثر بتا رہا تھا کہ پریشانی اس پر غالب آ چکی تھی اور وہ بظاہر حقائق جھٹلانے کی تدبیر کر رہا تھا۔ دیکھنے والوں میں ہر قسم کے تبصرے شروع ہو چکے تھے، جن میں اکثر منفی تھے۔ لوگ اپنے اپنے اندازے لگا رہے تھے۔ کئی خواتین خوفزدہ ہو چکی تھیں جبکہ بچے مناظر دیکھ کر رو رہے تھے۔ خدام نے بالآخر آمی پر قابو پا لیا اور پچکارتے ہوئے اسے دوبارہ سٹیج پر لے آئے گو اکثر چہرے تلخ معاملات کی چغلی کھا رہے تھے۔

''مولانا! جلدی سے دو بول پڑھا دیں''۔ چوہدری نادر نے بارعب آواز میں کلام کیا مگر مولانا صاحب الجھن میں مبتلا نظر آئے۔ قدرے تذبذب کے عالم میں گویا ہوئے۔

''معذرت چاہتا ہوں حضور! میں کسی مخبوط الحواس کا نکاح نہیں پڑھا سکتا''۔ ہر طرف چہ میگوئیاں پھر شروع ہو گئیں۔ مجمعے پر نظر دوڑاتے ہوئے مولانا صاحب دوبارہ بولے۔ ''جہاں تک میں سمجھتا ہوں شریعت کے مطابق ایجاب و قبول بہ حالت حواس و شعور ہونا ضروری ہے۔ براہ کرم انتظار کیا جائے۔ میں لڑکی سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں''۔ انہوں نے مضبوط لہجے میں وضاحت کی۔

''بیٹا! کیا نام ہے آپ کا؟'' وہ آمی سے مخاطب ہوئے۔ جواباً آمی نے زور زور سے ہنسا شروع کر دیا۔ وہ مولانا صاحب کا منہ دیکھ رہی تھی اور متواتر قہقہے لگا رہی تھی، پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تن تنہا سٹیج پر ناچنے لگی۔ مولانا صاحب نے یہ دیکھا تو نکاح پڑھانے سے انکار کر دیا۔ چوہدری نادر نے ان پر اپنا دباؤ جاری رکھا، بُرا بھلا بھی کہا مگر مولانا صاحب اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ چوہدری نادر نے دھمکی دی تو ان کا جواب کچھ اس طرح تھا۔

''چوہدری صاحب! اللہ تعالٰی نے اپنے بندوں کو اختیار عوام الناس کی بھلائی کے لئے دیا ہے مگر اس میں آزمائش کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ بادشاہی بڑی عارضی چیز ہے۔ آپ خدا کے غضب کو آواز نہ دیں۔ اسے رحمٰن ہی

رہنے دیں۔ اس کا قہر ٹوٹ پڑا تو آپ کی سلطنت سب زیر و زبر ہو جائے گی اور کچھ باقی نہیں بچے گا۔ اس کے ہاں نامیوں کے نام مٹنے میں دیر نہیں لگا کرتی''۔ مولانا صاحب نے زور دے کر کہا۔ اس بیچ حاضرین میں شدید بے چینی پھیل چکی تھی۔

''بٹیا کا یہ حال کیسے ہوا؟'' آمی کے خالو چوہدری نبی داد نے کڑے لہجے میں سوال کر دیا۔ اس کے چہرے پر الم اور تشویش کے نقوش ابھر آئے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

''بیماری ہر جاندار پر آ سکتی ہے، آمی پر بھی آ گئی۔ تیز بخار کے بعد اس کا دماغ الٹ گیا تھا، اس میں قصور میرا بھی تھا۔ اس لئے مناسب جانا کہ چپکے سے اسے اپنی پناہ کی ردا میں ڈھانپ لوں۔ گھر کی بیٹی ہے، بات نکلی تو تمام برادری رسوا ہو جائے گی''۔ چوہدری نادر نے بظاہر وضاحت کی مگر اس کا لہجہ کھوکھلا اور اعتماد سے عاری تھا۔ پسینہ اس کے چہرے پر جھلک رہا تھا اور وہ بے بس اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

محفل میں دکھ اور بے چینی کی فضا قائم ہو گئی تھی جبکہ آمی تھک کر اپنے لباس سے الجھ رہی تھی۔ اسے حویلی کی خدمتگاروں نے گھیر رکھا تھا۔

''اس لڑکی کا سب سے بڑا مجرم میں ہوں جو لندن میں جائیداد بڑھاتا رہا، کارخانے لگاتا رہا۔ وطن میں اپنی ذمہ داریاں بھول گیا۔ چوہدری نادر! میں نے چند افواہیں سنی تھیں مگر ان پر یقین نہ کر سکا۔ سمجھا کہ آپ اپنے مرحوم بھائی کو دھوکہ نہیں دیں گے، اپنے محسن کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے مگر یہ میری نادانی تھی۔ آپ نے معصوم لڑکی کو تباہ و برباد کر دیا''۔ چوہدری نبی داد نے کہا۔ اس کے لہجے میں رنج و ملال واضح تھا۔

''احباب خود میرے پاس نہیں آتے تھے ہونے کسی کو بھی میل جول سے منع نہیں کیا''۔ چوہدری نادر نے جواب دیا۔

''منع روپے کر دیا کرتے ہیں''۔ چوہدری نبی داد نے وضاحت کر دی۔ صورت حال چوہدری نادر کے ہاتھوں سے نکل رہی تھی۔ تمام احباب کو پہلے ہی گلہ تھا کہ حویلی کا مالک انہیں ہم پلہ نہیں جانتا تھا اور ان کی حویلی تک رسائی صرف تقریبات میں ہوا کرتی تھی۔

''آمی کو مزید آپ کے رحم و کرم پر چھوڑنا حماقت ہو گی''۔ چوہدری نبی داد نے دوسرا معاملہ بھی اٹھا۔

''یہاں رہی تو وہ مر جائے گی''۔ اس نے اندازہ کیا۔ چوہدری نادر کو احساس ہو چکا تھا کہ تمام احباب چوہدری نبی داد کے ساتھ کھڑے تھے۔

''ہمیں اس لڑکی کو یہاں سے نکالنا ہو گا اور اس کے علاج پر توجہ دینا ہو گی''۔ چوہدری نبی داد نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ ''مجھے اس کی جائیداد سے کوئی سروکار نہیں، میں صرف اس کی زندگی چاہتا ہوں''۔ اس نے مزید کہا اور احباب کی مدد سے آمی کو حویلی سے نکال کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اگلے روز چند احباب نے قریبی گاؤں کا رخ کیا، جسے اب نادر بستی کہا جاتا تھا۔ انہوں نے وہاں حالاتِ ماضی سے آگاہی حاصل کی۔ سربستہ راز کھلے تو ان کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ چوہدری نبی داد نے آمی کو دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کرا دیا اور واقعات کی چھان بین کے لئے پولیس حکام کو درخواست کر دی۔

چوہدری نادر کو زندگی میں پہلی بار کسی نے للکارا تھا۔ یہ تبدیلی ہضم کر لینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ طرز کہن کا عادی تھا اور روایت شکنی بڑی خطا جانا کرتا تھا۔ بستی والوں کے بدلتے ہوئے تیور بھی اس کی پریشانی بڑھا رہے تھے اور وہ اپنی فرعونیت خطرے میں دیکھ رہا تھا۔ یہ حقائق اسے بوکھلا دینے میں اہم ثابت ہوئے اور اس نے وہ قصد کر لیا جو بظاہر اسے ناگزیر دکھا

مگر بعد ازاں حماقت بن کر اس کے گلے پڑ گیا۔

......★......

مناسب ہوتا کہ وہ اپنے بیٹے دلاور سے مشورہ کر لیتا مگر اس نے محض حکم دینا موزوں سمجھا۔ کسی کے قتل کا حکم عموماً وہ اس قبر پر بیٹھ کر دیا کرتا تھا جس میں اس نے آمی کو قید رکھا تھا۔ یوں وہ روایت کی پاسداری پر فخر کیا کرتا تھا۔ طاقت کے خداؤں کے اپنے توہمات ہوتے ہیں۔ دلاور کو وہاں پہنچ جانے کا حکم سنایا گیا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ دونوں باپ بیٹا ڈھلتی شام کے وقت مذکورہ قبر پر ملے۔

''دلاور! جنگ اور محبت میں سبھی کچھ جائز کہلاتا ہے''۔ چوہدری نادر نے تمہید باندھی، پھر کہا۔ ''میں نے پہروں سوچا ہے، ہماری بقاء اسی میں ہے کہ نبی داد کا قصہ پاک کر دیا جائے ورنہ یہ اژدہا ہمیں نگل جائے گا اور کسی کو ہمارا وجود بھی نظر نہیں آئے گا۔ میں نے چنگیز کانے سے بات کر لی ہے۔ ماہر نشانچی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ ہمارا پرانا نمک خوار ہے اور پہلے بھی بڑے بڑے کام کر چکا ہے۔ منصوبہ سازی کر رہا ہے۔ کام ذرا بڑا ہے، میرا گمان ہے کہ ہر قدم پر تمہاری شرکت بہت ضروری ہو گی۔ بھول چوک ہم پر بھاری پڑ سکتی ہے اور ہاں، وقوعے کے دوران کسی کو نظر نہ آنا کیونکہ مخالفت میں گواہیاں جان لیوا ہوا کرتی ہیں۔ ہوشیار رہنا، مشاورت دیواروں سے بھی نہ کرنا۔ مزید یہ کہ تم خود عقلمند ہو''۔ چوہدری نادر نے کہا، خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ حکم کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔

دلاور کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ حد درجہ خوفزدہ ہو چکا تھا۔ اب وہ جرائم کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ اپنے آپ کو بے بس سمجھ رہا تھا کیونکہ روایتاً قبر پر کی جانے والی گفتگو پر بحث کی گنجائش نہیں ہوا کرتی تھی، یہی وجہ تھی کہ قبر حویلی والوں کے لئے خوفناک فیصلوں اور قہر کی پہچان بن چکی تھی۔

چنگیز اپنے طور پر تیاری کر چکا تھا۔ اس نے حکمتِ عملی ترتیب دے رکھی تھی۔ پروگرام کے مطابق اس کے نشانہ باز تین گھاٹیوں پر پوزیشن لے چکے تھے۔ جونہی نبی داد کی گاڑی پہاڑی میں داخل ہوئی اسے اندھا دھند فائرنگ نے گھیر لیا۔ اس کا بیٹا فرزند علی البتہ شاطر ثابت ہوا وہ اپنی گاڑی سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے محافظوں نے مؤثر جوابی فائرنگ کی اور دو حملہ آوروں کی بندوقیں خاموش کرا دیں۔ اسی بیچ چنگیز پہاڑی گھاٹی سے نیچے گر پڑا اور فرزند علی کی گولی سے مارا گیا۔ دلاور نے راہِ فرار اختیار کی مگر پہچان لیا گیا۔ چند گولیاں اس کی گاڑی پر بھی لگیں۔ لاشیں فرزند علی کے محافظوں نے قبضے میں لے لیں اور معاملہ فوری طور پر پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ اسی روز چوہدری نادر، دلاور اور ان کے ساتھیوں کے خلاف قتل کا پرچہ درج ہو گیا۔

......★......

دلاور جائے واردات سے فرار ہوا تو حد درجہ بوکھلایا ہوا تھا۔ اپنے تئیں پھر بھی اس نے عقلمندی سے کام لیا اور بجائے حویلی جانے کے ریسٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ جو باغات کے گھنے اشجار میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی بھی درختوں میں چھپا دی۔ خون کر دینے کے اثرات اس پر گہرے ہو چکے تھے۔ اس کا بدن خوف اور غیر متوازن جذباتی کیفیت کے باعث لرز رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا دم نکل جاتا، اسے شراب کا سہارا لینا پڑا۔

چوہدری نبی داد کے قتل کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ خونی واقعے نے علاقے میں ہلچل مچا دی۔ گرد و نواح کے عوام سہم گئے۔ اکثر لوگ افسردہ بھی تھے۔ روزمرہ کی زندگی معطل ہو گئی۔ جلد صورتِ حال کی خبر اونچے ایوانوں تک پہنچ گئی اور قانونی نظام حرکت میں آ گیا۔

''دو روز ہوئے دلاور جاگیر کے معاملے طے کرنے شہر جا چکا ہے''۔ چوہدری نادر نے پولیس افسر کو بتایا۔ پھر کہا۔ ''صبح ہم اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کروا لیں گے''۔ یہ بھی بتایا۔ ''میرے چند کارندے مجھ سے منحرف ہو چکے ہیں اور جاگیر کی حدود چھوڑ چکے ہیں۔ وہ اپنے کرتوتوں کے خود ذمہ دار ہیں''۔

خونی منصوبہ چوہدری نادر کی توقع کے برعکس مکمل ہوا تھا، اس لئے وہ اندر ہی اندر بہت خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ آنے والے دن کئی پیچیدگیاں پیدا کر دیں گے کیونکہ اس کا نام بھی قاتلوں کی فہرست میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نظام قانون مرحلہ وار اس کی جانب بڑھے گا اور وقت کے ساتھ اس کے گرد گھیرا تنگ ہوتا جائے گا۔ فی الحال پولیس نے اس کے شہر چھوڑنے پر پابندی عائد کر دی تھی۔ دوسری طرف وکلاء اسے بچانے کے لئے حرکت میں آ چکے تھے۔ اپنے تمام ہتھکنڈے استعمال کئے بغیر وہ ہار ماننے والا شخص نہیں تھا۔

رات گئے اس نے اپنے دلاور بیٹے کو ڈبل کیبن گاڑی میں ڈالا تو اس دم بھی جوان نشے میں دھت تھا اور چوہدری نبی داد کے لواحقین سے مسلسل معافیاں مانگ رہا تھا۔

''یہ میرا خون نہیں دکھتا''۔ چوہدری نادر نے وہاں موجود مصاحبوں سے کہا اور دائیں طرف حقارت سے تھوک دیا۔ یہ عمل اس کی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا تھا۔ اس وقت رات کی خاموشی پوری طرح چھائی ہوئی تھی اور چاند آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ قتل و غارت تو ہمیشہ حویلی کا تاریخ کی حصہ رہی تھی مگر خوف و الم کی فضا جو چوہدری نبی داد کے قتل سے پیدا ہوئی تھی، وہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ ہوا کی سرسراہٹ بھی باغ میں مشغول کارندوں کے دل دہلا دیتی تھی۔ پرندے چیختے تو بے حس قلوب بھی خوف کے مارے پھٹنے لگتے۔ ڈبل کیبن گاڑی حویلی کی حدود سے نکلی تو چوہدری نادر بھی بُری طرح رو پڑا۔ اسے لگا جیسے اس کے لختِ جگر کا جنازہ جا رہا تھا۔ اس کا دل بیٹھ گیا اور وہ اپنے کمرے میں جا کر مسلسل روتا رہا۔

چوہدری نادر کو معلوم تھا کہ پولیس حویلی کے گرد سڑکوں پر موجود تھی اس لئے اس نے دلاور والی گاڑی خفیہ راستوں پر جاگیر سے باہر بھجوائی تھی مگر ایک سنگین غلطی خود بھی کر بیٹھا۔ جلد بازی میں غلط چال چل گیا۔ پولیس جان چکی تھی کہ اس کی گاڑیاں کس ورکشاپ پر مرمت کے لئے جایا کرتی تھیں۔ جونہی وقوعے میں استعمال ہونے والی گولیوں سے چھلنی گاڑی ورکشاپ میں داخل ہوئی۔ اسے ڈرائیور اور مددگار سمیت تحویل میں لے لیا گیا۔ گاڑی کے مختلف حصوں میں فرزند علی کی استعمال کردہ گولیوں کے خول بھی موجود تھے، جو قاتل کے خلاف بڑے ثبوت کا درجہ رکھتے تھے۔ قانون نے ثبوت تو جمع کر لئے مگر قاتل کو نہ پکڑ سکے۔

قاتل شب کے پچھلے پہر بھی محوِ سفر تھا۔ جب نشے کی حالت سے نکلتا، اس کی ذہنی حالت غیر ہو جاتی۔ اس کے مصاحب اسے مزید شراب پلا دیتے۔ اسی حالت میں وہ چھوٹی جاگیر پہنچا۔ کارندے اسے اٹھا کر تہہ خانے کے ایک بڑے کمرے میں لے گئے جو نوری کی جائے قید سے جڑا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں زنداں کا ماحول تھا تو دوسرے میں ضرورت کی تمام اشیاء موجود تھیں۔ ایک مقیم جبراً قید تھا تو دوسرا خود گرفتار۔ دو زندگیوں کے درمیان رتبوں کی دیوار حائل تھی۔ نشہ ٹوٹا تو دلاور نے دی میں پیوستہ کھڑکی کھول دی۔ پیش منظر میں اس کے مقابل نوری کھڑا تھا جس کی خستہ حالی میں بھی جیون کی آس تھی، مگر دلاور کے قلب میں دیا بجھ چکا تھا۔ ''دیر ہے، اندھیر نہیں''۔ کسی نے اونچی آواز میں کہا تو دلاور کھڑکی سے

دور ہٹ گیا مگر کھڑکی کا در بند نہ کر سکا۔

فجر کی لو دھرتی پر پھیل رہی تھی۔ کائنات نیند سے بیدار ہو رہی تھی۔ اذان کی خوبصورت صدا چھوٹی جاگیر کے کیمپ ایریا میں بلند ہوئی اور افراد جوق در جوق مخصوص برآمدے کی طرف نکل پڑے۔ نوری نے تھوڑی دیر تلاوتِ قرآن پاک کی پھر ساتھیوں سے بات چیت کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا، کہا۔

''اصولِ قدرت ہے اور نوشتہ تاریخ بھی کہ نشیب و فراز زندگیوں کا حصہ ہیں اور رہیں گے۔ حالات کبھی ایک سے نہیں رہتے۔ دھرتی پر ظلمت سدا نہیں رہتی۔ تاریکی کے بادل خواہ کتنے گہرے ہوں سورج ضرور نکلتا ہے۔ جبر دائمی نہیں ہو سکتا۔ قومیں ہمیشہ غلام نہیں رہتیں۔ ہواؤں کے رخ اِدھر سے اُدھر پھر جاتے ہیں، امید کا دامن تھام رکھنے میں برکت ہے۔ یہی پروردگار کا پیغام ہے۔ صبر و استقامت کا بدل صرف اللہ کے پاس ہے۔ پیار و محبت پر اتفاق انسانیت کی معراج ہے۔ جس نے انسان سے پیار کیا، وہی مقبول ٹھہرا''۔

اس روز نوری کی آواز میں انوکھا جذبہ ابھر آیا تھا۔ کیمپ کے باسی ہمیشہ اس کی باتوں پر توجہ دیا کرتے تھے۔ اسے عابد اور عالم جانتے تھے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ اسے جو کتاب مل جائے وہ پڑھ ڈالتا تھا اور ہمیشہ مثبت رویوں کا حامل رہتا تھا۔ گفتگو ختم ہوئی تو اس نے صلوٰۃ الفجر کی امامت سنبھالی اور نمازیوں کو سورۃ الرحمٰن کی تلاوت سے بہرہ ور کیا۔ اس نے سلام پھیرا تو دلاور کو قریب پا کر ششدر رہ گیا، جو اس وقت بُری طرح رو رہا تھا۔ اپنے ہاتھوں کی گرفت سے اس نے خالی دامن پھیلا رکھا تھا۔ بولا۔

''یہاں پہنچا ہوں تو اندازہ کیا ہے کہ انصاف مٹ جائے تو جاگیر دلوں کو سنگلاخ کر دیتی ہے، پھر تمام کا تمام انسانی پتلا پتھریلا ہو جاتا ہے''۔ یہ کہہ کر وہ روتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

.......★.......

چوہدری نبی داد کے قتل کا کیس ڈی ایس پی زاہد کے پاس تھا جس پر محکمے کے اعلیٰ حکام بھرپور اعتماد کرتے تھے۔ وہ ایماندار اور محنتی افسر تھا اور اپنے پیشے میں ماہر خیال کیا جاتا تھا۔ وہ اپنا کام شروع کر چکا تھا۔ چوہدری نادر کی جاگیر اور قریبی بستی سے اسے بہت ساری معلومات ملی تھیں جس کے بعد اس نے اپنے جاسوس چھوٹی جاگیر کے گرد پھیلا دیئے تھے۔ وہ قتل کے متعلق کہانیاں جان چکا تھا اور دلاور کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔

ابھی سورج پوری طرح نہیں نکلا تھا کہ چھوٹی جاگیر میں فائرنگ کی آوازیں شروع ہو گئیں معلوم ہوا کہ کیمپ کے چاروں طرف ہوائی فائر کئے جا رہے تھے۔ فائرنگ بہت شدید تھی۔ کیمپ میں افراتفری مچ گئی۔ محنت کش باسی پناہگاہوں کی طرف بھاگے۔ تھوڑی دیر بعد ڈی ایس پی زاہد کی آواز لاؤڈ سپیکر پر گونجی۔ اس نے واضح کیا کہ ''پولیس کی بھاری نفری کیمپ کو ہر طرف سے گھیر چکی ہے۔ جن کارندوں کے پاس بندوقیں ہیں وہ اسلحہ پھینک دیں اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیں۔ اگر کسی شخص یا گروہ نے پولیس پر فائر کیا تو اسے تہس نہس کر دیا جائے گا''۔ اس کا اعلان سنتے ہی ہر طرف چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ باسیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ہر طرف ''اللہ اکبر'' کے نعرے گونجنے لگے۔ چند کارندوں نے بڑے پھاٹک کے قریب جا کر اسلحہ پولیس کے حوالے کر دیا اور اپنی گرفتاریاں دے دیں لیکن جرائم پیشہ افراد نے پولیس پر فائر کھول دیا۔ دونوں اطراف سے شدید فائرنگ ہوئی۔ اسی بیچ دلاور نے اپنے پستول سے خودکشی کر لی۔ بعد ازاں پولیس کمانڈو کیمپ میں داخل ہو گئے اور بچے کھچے جرائم پیشہ افراد پر غلبہ پانے میں کامیاب ہوئے۔ کیمپ کے باسی پولیس کے مدد کرتے رہے۔

چھوٹی جاگیر پر قبضہ پالینے کے بعد پولیس نے کیمپ کے تمام باسیوں کو اپنی تحویل میں لے لیا اور ساتھ واپس اپنے علاقے میں لے آئی۔ باسیوں کے لئے واپسی کے لئے واپسی کا سفر یادگار بن گیا۔

چھوٹی جاگیر کے باسی تقریباً پانچ سو افراد تھے۔ ان میں خواتین اور بچے بھی شامل تھے۔ اکثریت ان محنت کش لوگوں پر مشتمل تھی جنہوں نے کبھی چوہدری خاندان سے قرضے لئے تھے اور ادا نہ کر سکنے کی پاداش میں جبری مشقت کے ادوار کاٹ رہے تھے۔ اقلیت میں دو باسی تھے، جنہوں نے چوہدری نادر سے دشمنی مول لی تھی اور اپنے کیے کی سزا نجی جیل میں بھگت رہے تھے۔ پولیس نے تمام افراد کے بیان قلمبند کیے اور انہیں مختلف مراحل میں رہا کر دیا۔ معاملہ عدالت کے پاس چلا گیا۔

دلاور کی لاش کچھ عرصہ سردخانے میں پڑی رہی۔ اس کی موت پر مختلف زاویوں سے تحقیق ہوتی رہی۔ بعدازاں یہ ثابت ہو گیا کہ اس نے خودکشی کی تھی۔ جان لیوا گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ اس وقت وہ نشے کی حالت میں تھا۔ چوہدری نادر خود اس کی لاش وصول کرنے آیا۔ اس وقت اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور وہ برسوں کا بیمار لگتا تھا۔ لاش کو کندھا دیتے وقت وہ بُری طرح رو پڑا اس دم اسے مولانا صاحب کے وہ الفاظ یاد آ رہے تھے جو انہوں نے آمی اور دلاور کا نکاح پڑھانے سے انکار کرتے ہوئے حویلی میں کہے تھے۔ دلاور کی موت کے بعد چوہدری نادر کی گرفت جاگیر پر کمزور پڑ گئی اور اس کی دھاڑ سے وہ گرج بھی جاتی رہی جس پر لوگوں کے دل دہل جایا کرتے تھے۔

وکلاء نے عدالت میں زور لگایا اور یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ چوہدری نبی داد کا قتل درحقیقت دلاور کے ذہن کی اختراع تھی۔ دونوں کے بیچ دو ایک بار تلخ کلامی بھی ہوئی تھی، جس پر دلاور بہت نالاں تھا۔ بالآخر اس نے بدلہ لے لیا۔

فرزند علی نے فیصلے کے خلاف ہائیکورٹ میں اپیل کر دی۔ اس نے ایک دوسرا مقدمہ بھی چوہدری نادر کے خلاف درج کرا رکھا تھا جس میں الزام عائد کیا گیا تھا کہ اس نے آمی کو پانچ چھ برس قید تنہائی میں رکھا تھا۔ حتیٰ کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھی۔ اس مقدمے کے تحت آمی اور نوری کی شادی بھی زیر بحث آ چکی تھی۔ مختلف وجوہ کی بناء پر یہ مقدمہ عدالت میں لٹکا ہوا تھا۔ بظاہر آمی کے صحت مند ہونے کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ چوہدری نادر کے وکلاء نے نجی جیل کا معاملہ بھی اس کے مرحوم بیٹے کے سر ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ نجی قید سے رہا ہونے والے بیس افراد بھی چوہدری نادر کے خلاف عدالت میں جا چکے تھے۔ یہ مقدمہ بھی زیر التوا تھا۔ نوری کا نام بھی متاثرین کی فہرست میں شامل تھا۔ سماجی اور فلاحی تنظیمیں سابق قیدیوں کی مدد کر رہی تھیں۔

......★......

دوراں بدلتے ہوئے مناظر کا مجموعہ ہے۔ وقت اپنے کئی رنگ دکھاتا ہے۔ کبھی پُر بہار تو کبھی پھیکے۔ یہی بدلتے رنگ اسباق کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہی کامران رہتا ہے جو ان رنگوں میں لکھی تحریروں سے زندگی کا سلیقہ سیکھ لے۔ نوری کا خاندان اب مدت سے پھیکے رنگ دیکھ رہا تھا مگر جانتا تھا کہ یہ دور سدا نہیں رہے گا۔ اس روز موسم بہت سرد تھا، یخ بستہ ہواؤں نے دھرتی پر ڈیرے ڈال لئے تھے۔ سورج کو دبیز بادلوں نے چھپا رکھا تھا۔ برکھا رم جھم برستی تو کبھی طوفانی ہو جاتی، پھر ژالہ باری شروع ہو گئی۔ ہر طرف برفانی گولوں کی تہیں لگنا شروع ہو گئیں۔ قرب و جوار میں زمین کا منظر یکساں دکھائی دینے لگا۔ باہر دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی تو بوڑھی ممتا چونک گئی۔ اپنی عینک کرتے سے صاف کرتے ہوئے بولی۔

"دل کہتا ہے کہ کوئی میرے نوری کی خبر لایا ہے"۔ اس کے چہرے پر حسب معمولی امید کی کرنیں بکھر گئیں۔ "اس طوفانی موسم میں کوئی عام مہمان نہیں ہو سکتا"۔ اس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"آنکھیں روتے روتے گنوا دیں، آنسو تمہارے خشک ہو گئے، پر تمہاری عادت نہ گئی۔ کیوں اپنے آپ کو دھوکے دیتی ہو؟ مرے ہوئے بھلا کب لوٹتے ہیں؟ ماں ہو نا تم نہ سمجھ پاؤ گی، کبھی نہ بھول پاؤ گی اپنے لخت جگر کو"۔ اس کے خاوند نے تبصرہ کیا مگر اندر دل میں وہ بھی تمنا رکھتا کہ کاش تمام افواہیں اور قصے جھوٹے نکلیں اور اس کا بیٹا زندہ ہو۔ کسی روز اچانک آ جائے، ہنستا ہوا۔ کبھی سوچتا کہ ممتا کی آس جھوٹی نہیں ہوتی، ضرور رنگ لائے گی۔ اس خاندان نے بارہا یاس و بیم کے دھوکے کھائے تھے۔ دعائیں مانگیں تو کبھی چوہدری نادر کو بددعائیں دیں مگر ہمت نہ پا سکے کہ کبھی اس کے حضور کھڑے ہو کر درخواست کر سکتے کہ ان پر کرم کیا جائے۔ اب فرعون کی ٹوٹتی قوت دیکھ کر البتہ ان کی دعاؤں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

دونوں بیٹے اُس روز اپنی دُکان پر نہیں گئے تھے۔ ایک تو جمعہ تھا اور پھر موسم بھی ابتر دونوں گھر میں پڑے کھانے پینے کی فرمائشیں کرتے رہے تھے، جو کچن کی ملازمہ نے پوری کر دی تھیں۔ مایا وافر ہو تو جیون کے ڈھنگ بھی بدل جاتے ہیں۔ خوشحالی گھر کے در و دیوار سے ٹپکتی تھی۔ چوہدری نادر نے زمینیں کوڑیوں کے مول ہتھیا لیں تو کیا ہوا؟ عزم اور جذبہ تو اپنی جگہ موجود رہا تھا بلکہ بڑھتا رہا۔

دروازہ دوسری بار بجا۔ "میں نے کہا نا کہ یہ ہوا کا جھونکا نہیں ہو سکتا، باہر ضرور کوئی اپنا آیا ہے، سردی میں کھڑا ہے، دروازہ کھول دو"۔ ماں پورے وثوق سے بات کر رہی تھی۔ دونوں بھائی اولے برداشت کرتے ہوئے بیرونی در کی طرف بڑھے۔ پھر کیا تھا، اگلے ہی لمحے بے اختیار انسانی چیخوں نے در و دیوار کو ہلا دیا۔ بھائی ایک دوسرے کے ساتھ بار بار لپٹ رہے تھے اور اپنے والدین کو پکار رہے تھے۔ پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب نوری ممتا کے سامنے کھڑا تھا، اس کے خوابوں کو حقیقت سے ہمکنار کرتا ہوا۔

"بستی کی طرف گیا تھا، وہاں مولوی صاحب سے ملا، جن کے ہاں میں پڑھا کرتا تھا۔ انہوں نے مجھے آپ لوگوں کا پتہ دیا۔ کہا کہ آپ قریبی قصبے میں آباد ہو چکے ہیں۔ بس، میں سیدھا یہاں چلا آیا"۔ نوری نے بتایا۔ والدین خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ اس روز خاندان کے ساتھ دوسری بار انہونی ہو چکی تھی مگر اس بار نتیجہ یکسر مختلف تھا، مثبت بھی۔

......★......

چند روز بعد نوری نے آبائی علاقہ چھوڑ دیا اور اپنی رہائش کے لئے ایک دوسری بستی کا انتخاب کیا۔ یہ بستی اس کے آبائی گاؤں سے دور تھی مگر وہاں نوری کے روزگار کا بندوبست ہو گیا تھا۔ یہ بندوبست عامر نے کیا تھا، جو نجی جیل میں قید کے دوران اس کا واقف کار بن گیا تھا۔ عامر کبھی چوہدری نادر کا وفادار ڈرائیور ہوا کرتا تھا مگر بعد میں اس نے اپنے مالک کو دھوکہ دیا تھا اور اس کے سربستہ راز بیگم نادر اور دلاور پر آشکار کر دیئے تھے۔ جو بازاری عورتوں کے بارے میں تھے۔ اس طرح وہ زیر عتاب آ گیا تھا۔

عامر کی وساطت سے نوری گاؤں کی اکلوتی مسجد میں مؤذن بن گیا اور اس ناطے اس کی رہائش کا انتظام بھی ہو گیا تھا۔ وہ مسجد ہی میں مقیم رہتا تھا۔ اس طرح وہ اس دینی لائبریری سے بھی استفادہ کرتا رہا جو قدیم دور سے مسجد میں قائم تھی۔ اسے مطالعہ کرنے کا بہت شوق تھا اور حصول تعلیم کو عبادت سمجھا کرتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ عابد تھا اور روحانیت میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ جلد ہی گاؤں

کے لوگ اس کی تکریم کرنے لگے اور اس کا چرچا گرد و نواح کے دیہات میں بھی ہونے لگا۔ جگہ نکلی تو اسے مسجد کا پیش امام اور خطیب چن لیا گیا۔ اس طرح نوری، مولانا نورالدین ہو گیا۔ محنتی تھا، اس ناطے اس نے اپنے پیشے سے انصاف بھی کیا۔ نورالدین آمی کو دل سے نہیں نکال سکا تھا۔ خدا کے حضور کھڑا ہوتا تو کبھی اپنے عشق مجازی کی جہتوں پر تاسف کرتا، مگر سوچتا کہ یہ درد دل بھی کم اثاثہ نہیں پھر لڑکی اسی کی وجہ سے مصائب میں مبتلا ہوئی تھی، جسے مشکلات سے نکالنا بھی اسی کا فرض تھا۔ وہ اپنے تمام فرائض پورے کرنا چاہتا تھا۔

......★......

نورالدین فرزند علی سے کمرۂ عدالت میں ملا تھا، جہاں چوہدری نادر بھی اپنی پیشی بھگتے آیا ہوا تھا۔ بعدازاں فرزند علی کی دعوت پر نورالدین اس کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔

صبح کی روشنی سماء سے ارض کی سمت پھیل رہی تھی اور فضا کی نرمی نکھری نکھری دکھائی دیتی تھی۔ دور کہیں کوئل کی صدا گونج رہی تھی۔ فصلوں میں پانی پھیل رہا تھا۔ سبز پتوں پر شبنمی موتی چمک رہے تھے۔

فرزند علی کی گاڑی نورالدین کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ڈیرے کی سمت چلا تو سوچنے لگا کہ عدو کے دشمن بآسانی باہمی دوست ہو سکتے ہیں مگر اس ناطے کئی الجھنیں بھی اس کے ذہن میں اتر آئی تھیں۔

''کیا رؤسا سے دوستی پائیدار ہو سکتی ہے؟'' یہ اس کی سب سے بڑی الجھن تھی۔

ادھر فرزند علی کی سوچ میں حقائق پسندی غالب تھی، جو وہ نورالدین کا مداح ہو چکا تھا۔ اس نے نورالدین کے دل میں مجازی عشق کی حقیقی تڑپ دیکھی تھی اور یقین رکھتا تھا کہ آمنہ اور نورالدین ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے، مزید یہ کہ ان کے بیچ اخوت کا رشتہ غیر معمولی تھا۔ وہ ان دو کی ہر صورت میں مدد کرنا چاہتا تھا اور انہیں اپنے احباب میں مناسب درجہ دینا چاہتا تھا۔ وہ زمانۂ فردا میں جھانکتا تو نورالدین اسے وہاں سربلند دکھائی دیتا تھا۔ چوہدری نادر اب پسپا ہو چکا تھا۔ وہ زیادہ عرصہ مقدمے سے ملتوی نہیں کرا سکتا تھا، خصوصاً جبکہ وقت کے ساتھ اس پر مقدمات تعداد میں بڑھتے گئے تھے۔

ڈیرے پر فرزند علی نے نورالدین کا پُرتپاک خیرمقدم کیا اور تمام روز اسے اپنی مصروفیات میں ہمرکاب، مصروفیات اس نے خصوصاً نورالدین کے لئے بھی ترتیب دی تھیں۔ جھیل کے کنارے ریسٹ ہاؤس میں اس نے نورالدین کی داستانِ عشق سنی اور اتنا محظوظ ہوا کہ شکار کے دوران ثانیاً اپنی ڈھیر ساری کہانیاں بھی سنا ڈالیں مگر مہمان دوست کے زمرے میں معاملہ جب پیش آئے جور و ستم پر پہنچا تو وہ دکھی ہو گیا۔ وہی شخص تھا جو آمنہ کی بپتا اپنے مہمان دوست کو سنا سکتا تھا، جسے جاننے کے لئے نورالدین وہاں پہنچا تھا۔

......★......

شام ڈھل رہی تھی، سورج کی پھیکی کرنوں نے دھرتی میں افسردگی کا رنگ بکھرا دیا تھا۔ ہسپتال کی فضا میں بھی مہیب اداسی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ تو ماحول نے نورالدین کے دل پر گہرا اثر ڈالا تھا اور کچھ لہو میں موجزن سوچوں کے بھنور اس کے وجود میں قابو کھو رہے تھے۔ عمارت میں ہر نئے کھلتے در کی ضرب گراں وہ اپنے قلب پر محسوس کرتا تھا، جو یوں دھڑکتا کہ گویا پھٹ پڑے گا، پھر آہ کے ساتھ اس کے لبوں پر آمنہ کے لئے دعائیں بکھر جاتیں۔ شاید وہ اس منظر کے لئے تیار نہیں ہونا چاہتا تھا، جو اس کا دل فرطِ غم سے پاش پاش کر سکتا تھا۔ آخر ایک ادھ بھڑے در کے پیچھے اسے اپنی محبت کی خستہ حالی دکھائی دے گئی، جس پر نازاں تمام دھنک رنگ سماج کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ کراہ کر نورالدین نے دیوار کا سہارا لے

لیا، جو اسے اپنے ہاتھوں تلے سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اگلے لمحے کوئی مضبوط شخص اس کا ڈگمگاتا ہوا وجود سہار چکا تھا۔

سنبھلا تو اسے اپنی تمنائیں بھی سیاہ رخ دکھائی دینے لگیں۔ آمنہ سے آنکھیں چار ہوئیں تو اس کا دل کرب سے لرز گیا۔ اس لڑکی کی آنکھیں بالکل ویران تھیں، الم اور خوف سے بھی عاری، ہر جذبے سے، ہر تاثر سے بے بہرہ۔ ان میں کوئی شکوہ بھی موجود نہیں تھا۔ وہاں آس تھی، نہ امید تھی۔ ملن کی کوئی تمنا بھی نہیں تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ ان انکھوں میں نورالدین کی شناخت بھی نہیں تھی۔ اسے آمنہ کی خاموش سسکیاں سنائی دینے لگیں، جن میں جذبوں کی حس دم توڑ چکی تھی۔

''ہمارے مقدر میں کھلنے والے گلوں کے رنگ سدا کالے رہے ہیں''۔ اس نے معالج ڈاکٹر شمس کو مخاطب کیا۔

''ہم سب مل کر محنت کریں گے تو اس لڑکی کو دنیا میں واپس لے آئیں گے''۔ معالج نے شفقت بھرے لہجے میں اسے یقین دلایا۔

آمنہ کا ذہنی عارضہ معمولی نوعیت کا نہیں تھا۔ برسوں کی ایذا رسانی نے اسے یہاں تک پہنچایا تھا۔ معالج اس پر بھرپور توجہ دے رہے تھے لیکن یاس وبیم کے مراحل معمول کا حصہ نظر آتے تھے۔ جو بہتری نمو پاتی، وہ عارضی ثابت ہوتی۔ دیوانگی میں لوٹ جاتی تو احباب کے دل ٹوٹ جاتے۔ بیماری بڑھتی تو وہ ہسپتال میں گھنٹوں محوِ خرام رہتی۔ احباب کو پیچھے بھگاتی لیکن مدعا کچھ نہ ہوتا۔ اس کے لب کھلے ہوتے اور رالیں ٹپکا کرتیں۔ جو بولتی وہ بے ربط ہوتا، جو حرکات کرتی وہ بے معنی دکھتیں۔ اکتا جاتی تو رونے لگتی، کبھی شور مچاتی اور تشدد کا راستہ اپنا لیتی، پھر تھک ہار کر سو جاتی، دوسرے سوتے تو ان کو جگا دیتی۔ طویل عرصہ اسی طور گزر گیا۔ نورالدین کا رابطہ ہسپتال سے قائم رہا۔ اس کے صبر و استقامت کی بڑی وجہ اس کی عبادات رہیں۔ اس نے اپنے رتجگے اور اوراد و وظائف سے مزین کر لئے تھے۔ اچھے اوصاف کی برکات شامل حال تھیں جو احباب کے دل میں امیدوں کے چراغ روشن رہے۔ جہد و محنت میں خلوص موجود ہو تو صبر کا پھل ضرور ملتا ہے۔

......★......

وہ خنک شام بے حد خوبصورت تھی، جب نورالدین ہسپتال کے سبزہ زار پر بیٹھا مریضہ سے ملاقات کا منتظر تھا کہ آمنہ خود ہی اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس روز اس کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی اور آنکھوں میں چمک بھی نظر آتی تھی۔ وہ پُرسکون دکھائی دے رہی تھی اور اپنے رویوں کا مطلب بخوبی سمجھ رہی تھی۔ نورالدین کو وہ کٹھن گزرے دنوں سے مختلف لگی۔ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی، پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اس روز احباب کی صداؤں میں شکر الٰہی کے جذبات رچ گئے۔ نورالدین نے تشکراً اوپر فلک کی اور دیکھا تو چودھویں کا چاند چمک رہا تھا اور فضا میں چاندنی نکھری ہوئی تھی۔ اس کے نصیبوں کے ستارے جگمگا رہے تھے۔ شبنم کی تراوت اسے بھلی لگی۔ آمنہ کو دوبارہ پائے ہوئے اسے ڈیڑھ برس بیت چکا تھا۔ اسے طمینان ہو گیا کہ مریضہ کا علاج شفا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جدید تکنیکی مراحل بھی معالجے کا حصہ بن گئے تھے۔ اگلے مہینوں کے دوران آمنہ کے پیکر میں بہتری کے آثار بڑھ گئے اور کئی مزید مثبت تبدیلیاں وارد ہوئیں۔ اب وہ احباب سے باتیں بھی کر سکتی تھی، گو اس کی گفتگو میں ربط کا فقدان واضح نظر آتا تھا۔

پھر وقت نے دنیا کو ایک دوسرا منظر بھی دکھا دیا۔ ایک صبح حویلی کے مصاحبوں نے دیکھا کہ چوہدری نادر آبائی قبرستان میں کھڑا تھا اور زار و قطار رو رہا تھا۔ بظاہر یہ انہونی بات تھی۔ وہ اپنی بیوی کی قبر پر آیا تھا۔ قبل ازیں

شاذ ہی وہاں آیا ہوگا۔ اسے قبرستان میں آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ شاید اسے اجل کا گمان بھی اچھا نہیں لگتا تھا لیکن اس روز وہ اپنی مرحومہ بیوی کے سرہانے تادیر بیٹھا رہا، اس سے ہم کلام رہا، پھر بے قابو ہو کر اونچی آواز میں رو پڑا۔ ماجرا دیکھ کر ان افراد کے دل بھی پسیج گئے جو کہا کرتے تھے کہ قبروں کے حجر تو کراہ کر چیخ سکتے ہیں، مگر چوہدری نادر کا دل موم نہیں ہوسکتا۔ اب وہ ٹوٹ کر بلند آواز میں گریہ کر رہا تھا۔

''تم سچ کہا کرتی تھیں بانو! میں ہی گمراہ تھا، حقائق جھٹلاتا رہا۔ تم کہتی تھیں خوف خدا کرو انسان کو انسان سمجھو، کسی کو حقیر مت جانو، خلق خدا سے پیار کرو، مگر میں نے تسلیم نہ کیا۔ تم نے مجھے باور کرایا کہ خلق کو آزادانہ جینے کا حق معبود نے دیا ہے، رزاق نے رزق سب کا لکھا دیا ہے، طمع و لالچ چھوڑ دو، جبر مت کرو، مگر میں نے اپنے آپ کو فرعون سمجھا، طاقت کے نشے میں چُور رہا، چھوٹے بڑے کسی کو خاطر میں نہ لایا، بھلائی کے تقاضے کو سرکشی جانا، لوگوں کو اذیتیں دیں، قید میں رکھا، قتل کرائے، خلق کو اتنا تباہ کیا کہ کمزوروں پر قیامتیں ٹوٹ پڑیں، نہ کسی کی منت سنی، نہ واسطوں پر دھیان دیا۔ جتنا جی میں آیا، ظلم کیا، بانو! تم درست کہتی تھیں، اپنا کیا سامنے ضرور آتا ہے، نظام قدرت ظلم کا حساب لیتا ہے۔ زوال ہی کھوٹے عروج کا نصیب ہے، دنیا ٹھیک کہتی ہے، وقت ایک سا نہیں رہتا۔ کاش! میں تمہاری صلاح مان لیتا۔ تمہاری بات پر عمل کرتا تو آج رسوا نہ ہوتا۔ قانون کا گھیرا میرے گرد تنگ ہو چکا ہے۔ مجھے بے کس لوگوں اور مظلوموں کی آہیں اس مقام پر لے آئی ہیں کہ میرے پاس سوائے دکھ، الم اور پچھتاوے کے کچھ نہیں بچا، اے اللہ مجھے معاف کر دینا، میرے اللہ میرے حال پر......'' چوہدری نادر پھر ٹوٹ کر رو پڑا اتنا کہ اس کی زبان لفظوں کی ادائیگی کے قابل نہ رہی۔

......★......

اڑھائی تین برس علاج کے بعد آمنہ اس قابل ہوئی کہ نورالدین کے خاندان میں احتیاطی تدابیر کے تحت رہ سکے۔ اسے ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا لیکن پھر بھی ہر ماہ اسے ہسپتال جانا پڑتا تھا جہاں اس کا ذہنی تجزیہ کیا جاتا اور رویوں کا جائزہ لیا جاتا۔ اسے صبح شام دوائیں بھی کھانی پڑتی تھیں۔ رفتہ رفتہ وہ نورالدین کے ہمرکاب چل پڑی۔

چاند نقرئی کرنیں دھرتی پر برسا رہا تھا، رات گہری ہو چکی تھی، کائنات میں ٹھہراؤ تھا، دریا کی سطح پرشور مدھم تھا، نم آلود ہوا اشجار سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی، شبنم کی تراوت ہواؤں پر حاوی تھی، آبگینے دریا نے بھی بادِ سحر انگیز کی نذر کر دیے تھے۔ رات کے دو مسافر پگڈنڈیوں پر رواں دواں تھے۔ دریا کے کنارے کسی شجر پر کوئی خفتہ کوئل جاگ اٹھی اور درد انگیز نوا میں گیت گانے لگی۔ پتھروں کے بیچ مچلتے جھرنے اپنی صدا میں اسے ہمنوا بنانے لگے۔ کچھ موتی جھرنوں سے حجروں پر ٹوٹ گئے، کچھ نبات میں زندگی رچانے لگے۔ ماحول کی پاکیزگی نے دلوں پر اپنا اثر جگا دیا تھا۔ آمنہ راہوں پر کچھ تھک سی گئی تھی۔ اس نے رخ آبی موتیوں سے مرصع کیا تو اس کا بدن سکون پانے لگا۔ نورالدین نے پانی کی تازگی میں رچا بسا جنگلی پھول اس کے بالوں میں سجا دیا۔ جذبوں میں ہلچل سی مچی۔ بادل کا آوارہ ٹکڑا مہتاب کو آغوش میں چھپایا ہوا گزر گیا۔

''کبھی اسی مقام پر ہم نے عمر بھر ساتھ جینے کا عہد کیا تھا''۔ نورالدین آہستہ سے بولا۔

''آؤ پھر تجدید عہد کریں''۔ اس نے مقصد پر بات کی اور نگاہوں سے لڑکی کا روپ چھو لیا جس میں اس دم نہ تو نار تھی اور نہ ہی وہ جذبوں کے طلسم میں دہک رہی تھی۔ وہ خاموش رہی۔

''ہم نے اپنے میل کا آغاز انہی چٹانوں کے

سائے میں چندا کو گواہ کر کے کیا تھا۔ آج میں دوسری بار اسی چاہت سے آپ کے آنچل میں الفت کے وہی رنگ پھر سجانا چاہتا ہوں''۔ نورالدین نے عہد کیا۔

''جیون میں پھولوں کے رنگ کالے ہوں تو تمنائیں کہاں ثمر بار ہوتی ہیں؟'' آمنہ نے خدشوں کا اظہار کیا۔

''آج بھی ہم یکجا ہیں، قدرت کا کیا یہ انعام کم ہے؟'' نورالدین نے جواب دیا۔

''ایک دوسرے کی آرزو نہ ہوتی تو ہم پُرخار راہوں میں مٹ گئے ہوتے''۔

''شاید ہماری کہانی کی تکمیل ضروری تھی''۔

''محبت کیا ہے؟''

''انسانوں کے بیچ جذباتی کشش''۔

''ہم اپنی مثال لے لیں۔ دل میں ابھرنے والے جذبے بھی تو خالق نے کسی مقصد کے تحت بنائے ہوں گے''۔

''بندھن کا پہلو ممکن تھا، اس لئے وہ بے معنی نہیں سمجھے جاسکتے''۔

''ممکنات کی موجودگی میں جنون کیوں اس طرح ناکام ہو جاتے ہیں؟''

''دوسروں کی خودغرضیاں آڑے آ جاتی ہیں، جنہیں اصول وضوابط کا نام دیا جاتا ہے اور ان کی حفاظت کے لئے زندگیاں تک بھینٹ چڑھا دی جاتی ہیں۔ ہمارا مذہب ذات پات اور نام ونسب کو اہمیت نہیں دیتا''۔

''کیا مذہب اور اخلاقیات کے لحاظ سے ہمارا ایک دوسرے کو پسند کر لینا اور بعد میں بڑوں تک بات پہنچانے کا عمل غلط تھا؟''

''غالباً نہیں''۔

''علم بغاوت بلند کرنے پر کیا ہم قصوروار تھے؟''

''جنوں کے جس دور سے ہم گزر رہے تھے، اس میں ہم اپنے اوپر بھی اختیار کھو چکے تھے''۔ آمنہ تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہی، پھر ایک دوسری الجھن سامنے لے آئی۔

''ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ظاہری شباہت پر پسند کیا تھا۔ کیا مستقل بندھن کی یہی واحد بنیاد ہونی چاہئے؟ جبکہ ضروری نہیں کہ خوبرو لوگوں کے دل بھی خوبصورت ہوں؟ کیا یہ لازم ہے کہ باہمی کشش سے جنم پانے والا تعلق ازدواجی بندھن پر ہی تمام ہو؟''

نورالدین جانتا تھا کہ آمنہ کے ذہن میں خیالوں کا ٹکراؤ اس کے نفسیاتی علاج کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ ماہرین نفسیات اس کی سوچوں کے الجھاؤ دور کرنے کی سعی کر رہے تھے۔

''آمی! جیسا کہ تمام لوگ حسین نہیں ہوتے، اسی طرح ہر شخص حُسن پرست بھی نہیں ہوتا''۔ اس نے دھیمے لہجے میں آمنہ کو سوالوں کا جواب دے دیا، پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''میں نے خود بھی بہت کھوجا ہے، نتیجے پر پہنچنا ذرا مشکل ہے۔ نہیں سمجھ پایا کہ متضاد جنسوں کے بین جنسی کشش اس قدر زیادہ کیسے بڑھ جاتی ہے کہ جیون کی بنیادیں تک ہلا دیتی ہے؟ ان حقائق سے بھی انکار نہیں کہ ایسے دو افراد اگر شادی کے بندھن میں منسلک ہو جائیں تو ان کے باہمی جذبات نہ صرف ماند پڑ جاتے ہیں بلکہ اوقات ان کے بیچ دوریاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں، جو ازدواجی پیچیدگیاں حدوں تک بڑھا دیتی ہیں، پھر اسے عشق کہیں یا محبت شادی کے بعد نمو پاتے نتائج سمجھ سے بالاتر نظر آتے ہیں''۔ نورالدین نے داڑھی کھجاتے ہوئے ابہام میں راہ بنانے کی کوشش کی۔ اس شب دونوں نے بہت ساری باتیں کیں، حتیٰ کہ ستارے ماند پڑ گئے اور صبح کی لو سے دھرتی جگمگانے لگی۔

......★......

نورالدین نے اپنے ایک دوست کی مدد حاصل کی اور جائے روزگار کے نزدیک بستی میں کرائے پر ایک چھوٹا سا مکان حاصل کر لیا، پھر وہ آمنہ کو بھی اپنے ہمراہ لے آیا۔ دونوں اکٹھا رہنے لگے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ علاقے کے کرتا دھرتا افراد سے ملے گا اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کر دے گا۔ وہ نکاح نامہ بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست سے اس بابت کام شروع کرنے کی درخواست کی تھی۔

''میں نورالدین کے اس مذکورہ دوست سے مل چکا ہوں۔ دیگر بھی کئی افراد سے ملا ہوں، فہرست بہت لمبی ہے''۔ بیرسٹر اختر نے کہا۔ اس کی کہانی تکمیل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یکا یک آسماں سرخ ہو گیا۔ رعد نے آسمان پر الاؤ بھڑکا دیا تھا۔ آنکھوں کو خیرہ کرتی چمک تا بہ فلک پھیل گئی۔ پھر شعلے زمین کی طرف لپکے اور فاصلے پر درختوں کا جھنڈ جلاتے چلے گئے۔ گڑگڑاہٹ سے دھرتی لرز اٹھی۔ آسمان پر قہر و غضب طاری تھا۔ پناہ کی کئی صدائیں بادو باراں میں بکھر گئیں۔

''الاماں''۔ ڈی ایس پی سعد کے منہ سے نکلا۔

بادل اس قدر برسے تھے کہ پانی نے زمین پر سیلاب کی صورت دھار لی تھی اور تاحدِ نظر صرف آبِ رواں دکھائی دیتا تھا۔ فلک کا منظر بدستور کالا تھا اور بادل تیز ہواؤں کے دوش پر جھول رہے تھے۔

''نورالدین اور آمنہ نے بے شک عزم و ہمت کی لاثانی داستان رقم کی ہے''۔ ڈی ایس پی سعد نے کہا اور بے چینی میں پہلو بدلا۔ جھرجھری لی۔ جذبات میں سفر نے اس پر تھکن طاری کر دی تھی۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا برتی باراں کے قریب تر چلا گیا۔

''نورالدین کو اندازا نہیں ہوا ہوگا کہ بستی والے اس پر اس قدر رشاکی ہو جائیں گے کہ اس کا محاسبہ کرنے پر تل جائیں گے''۔ وہ بولا۔

''اس ضمن میں چوہدری جابر کا کردار بہت اہم ہے۔ وہ چوہدری نادر کے احباب میں شامل ہے اور اس سے ہمدردی بھی رکھتا ہے۔ اسی نے نورالدین اور آمنہ کے خلاف پرچہ کٹوایا ہے''۔ بیرسٹر اختر نے اسے بتایا۔

''چوہدری نادر نے اسے اس ضمن میں ہدایت کی ہوگی''۔

''نہیں، ایسا نہیں، اسے اب اپنی پڑ چکی ہے۔ چوہدری جابر خود بھی کسی شیطان سے کم نہیں''۔

''نہ جانے مظلوموں کے ساتھ مزید کتنا جبر ہو گا؟''

''آپ خاطر جمع رکھیں، آنے والی عدالتی پیشیوں میں مَیں دیکھ لوں گا''۔

''تو گویا آپ کی تیاری مکمل ہے''۔

''میرا نام اختر ہے، میں ستاروں کی چالیں بھانپ لیتا ہوں''۔

اس شام بیرسٹر اختر ڈی ایس پی سعد سے جدا ہوا تو بادو باراں اور سیلاب کے باعث اسے ٹرک پر بیٹھ کر اپنے گھر جانا پڑا۔ اگلے روز وہ دلدل میں سڑکیں ناپتا رہا۔ جیل میں نورالدین جبکہ ہسپتال میں آمنہ سے ملا اور انہیں صورتِ حال پر دلاسہ دیا۔ اس نے آمنہ کو اشارہ دیا کہ وہ نہیں جانتی، وہ کیا پانے والی ہے۔

......★......

مقدمے کے آغاز پر بیرسٹر اختر نے عدالت میں درخواست کی کہ اس کی مؤکلہ کا طبی معائنہ کرایا جائے، جو کوئی گائناکالوجسٹ کرے۔

''شادی شدہ ہونے کا دعویٰ کرنے والی خاتون کس طرح کنواری ہو سکتی ہے؟'' چوہدری جابر کے وکیل نے مخالفت میں استفسار کیا۔

''یہ مقدمہ حدود آرڈی نینس کے تحت دائر کیا گیا ہے، اس طرح کا معائنہ کیس کی نوعیت بدل سکتا ہے''۔ بیرسٹر اختر نے اصرار کیا۔ اس نے کیس پر مختلف زاویوں سے دلائل دیئے اور ملزمان کی ضمانت کے تحت رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اگلی پیشی پر گائناکالوجیکل رپورٹ دستیاب ہو گئی۔ اسے جب کھولا گیا تو وہاں حاضر ہر شخص حیران رہ گیا۔ معلوم ہوا کہ آمنہ ایک کنواری خاتون تھی۔ عدالت نے دیگر طبی رپورٹوں کا جائزہ بھی لیا، جن کے تحت ثابت ہوا کہ ملزمہ شدید دماغی عارضے کا شکار رہی تھی اور ابھی تک ادویہ استعمال کر رہی تھی۔ پہلی رپورٹ کی وجہ بھی اس کی دماغی علت تھی، جو مریضہ پر محدود دماغی بوجھ کا تقاضا کرتی تھی۔

مقدمہ آگے بڑھا تو بیرسٹر اختر نے عدالت میں ایک پرانا نکاح رجسٹر پیش کر دیا، جس میں ایک تراشیدہ صفحے پر ایسے شواہد واضح تھے جو ثابت کرتے تھے کہ آمنہ اور نورالدین کا نکاح مسجد میں ہوا تھا۔ پھر اس نے چند اسٹیمپ پیپر بھی عدالت کے روبرو پیش کئے جن پر شادی کے گواہان نے دستخط ثبت کئے تھے۔ اس نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ نکاح چونکہ منفرد انداز میں وقوع پذیر ہوا تھا اس لئے لوگوں کے ذہنوں میں واقعہ ابھی تک محفوظ تھا۔ بیرسٹر اختر نے اس وقت کے نکاح خوان کا بیان بھی عدالت کے حوالے کیا۔ بعدازاں اس نے میاں بیوی کی مکمل پتا عدالت کے سامنے رکھی اور ان مقدمات کا ذکر بھی کیا جو چوہدری نادر پر قائم کئے جا چکے تھے اور فیصلوں کی طرف مختلف مراحل میں تھے۔ اس نے عدالت کو باور کرایا کہ چوہدری جابر کی موجودہ مقدمے کی پیروی کرنا اس امر کی عکاسی کرتا تھا کہ جابر شخص اپنے سنگدلانہ ہتھکنڈوں سے باز نہیں آیا تھا کیونکہ اوّل الذکر اس کے احباب میں شامل تھا اور اس سے گہری ہمدردی رکھتا تھا۔

آنے والی اگلی پیشیوں میں بیرسٹر اختر نے اپنے مؤکلین کے حق میں گواہان بھی پیش کر دیئے جس پر عدالت نے اس کا مؤقف تسلیم کرتے ہوئے نورالدین اور آمنہ کو باعزت بری کر دیا۔ اس فیصلے نے انصاف کے تقاضے پورے کر دیئے اور الجھی ہوئی جیون کتھا ہر پہلو سلجھا دی جس کے بعد مظلوم جوڑے کا رخ حیات اس طور تبدیل ہوا کہ تشنہ نصیبوں کو کائنات کے خوش نما پہلو بھی دکھائی دینے لگے۔ وہ وقت کے ہمرکاب آگے چل پڑے، کبھی ان پرندوں کی طرح دکھائی دینے لگتے جنہیں صیاد نے زندگی کی بازی ہار کر رہا تو کر دیا تھا، مگر اس رہائی پر انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ وہ حسب آرزو لمبی اڑانیں بھر سکتے تھے حالانکہ فضا کی بیکرانی ان کے سامنے تھی۔

اس سال بارشیں معمول سے کئی گنا بڑھ گئی تھیں۔ موسم برسات کے دوران پانی آسمان سے مسلسل برستا رہا تھا۔ تمام خطہ ہی موسمی عدمِ توازن کا شکار لگتا تھا۔ دریاؤں کے بطن بھر گئے تو پانی کناروں سے باہر بہنے لگا۔ پھر اس بہاؤ میں شدت بڑھ گئی اور طغیانی کے خدوخال نظر آنے لگے۔ جو لوگ بارشوں کے لئے دعائیں کیا کرتے تھے، اب برکھا کے خاتمے کی منتیں ماننے لگے مگر آبِ رواں تھا کہ عذاب کی صورت دھار گیا، دریاؤں کے گرد پشتے اور حفاظتی بند خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ پانی نشیبی علاقوں سے نکلا تو طول و عرض میں پھیلتا گیا۔ ہر آنے والا نیا سیلابی ریلہ پچھلے آبِ رواں سے زیادہ شدت بھرا ہوتا۔ نبات و جمادات نیست و نابود ہونے لگیں شجر و حجر پانی کے ساتھ بہنے لگے۔ آبادیوں کے بیچ آمدورفت کے راستے ناکارہ ہوئے، پھر مسدود ہوتے گئے۔ کھڑی فصلیں اور باغات تباہ ہو گئے، بستیاں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔

نورالدین اور آمنہ کو آبائی علاقوں کے بارے میں اطلاعات ملی تھیں، مگر ان کی دلچسپیاں وہاں کے

باسیوں کے بارے میں محدود ہو چکی تھیں۔ انہی دنوں چوہدری جابر آمنہ سے ملا اور پیغام دیا کہ چوہدری نادر اس سے ملنا چاہتا تھا، کیونکہ وہ اپنی گرتی ہوئی صحت کی وجہ سے پریشان تھا۔

سیلاب کی تباہ کاریاں چند ہفتے جاری رہیں، پھر آہستہ آہستہ بارشیں تھم گئیں اور بند راستے کھلنے لگے۔ نورالدین اور آمنہ اپنی پرانی بستی پہنچے تو وہاں ہولناک تباہیاں نظر آئیں۔ علاقہ باسیوں سے خالی ہو چکا تھا۔ جاگیر کا رقبہ ابھی تک گہرے پانی میں گھرا ہوا تھا، اتنا کہ آمنہ کو حویلی تک پہنچنے کے لئے کشتی کا سہارا لینا پڑا۔

پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ حویلی کی نچلی منزل پانی میں پوری طرح ڈوبی ہوئی تھی اور بغیر کشتی کے، عمارت کی حدوں میں داخلہ ممکن نہیں تھا۔ حویلی کا زیادہ تر حصہ منہدم ہو چکا تھا۔ ساز و سامان تباہ ہو چکا تھا اور عمارت زندگی کو ترس رہی تھی۔ عذاب تھا، جو بستی پر اتر آیا تھا۔

آمنہ حویلی میں داخل ہوئی تو چوہدری نادر کے دو وفادار خادموں نے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے دیوانِ خاص کی طرف لے گئے جہاں داخلے پر کبھی ذی روح، روح تک کانپ اٹھا کرتے تھے۔ آمنہ کا جی علاقے کی تباہی دیکھ کر دکھی ہو چکا تھا، اب شناسا راستوں پر آگے بڑھی تو دل بے قابو ہو کر دھڑکنے لگا پھر انجانے منظر کا خوف اس کے ذہن پر سوار ہو گیا۔

کمرے میں روشنی مدھم تھی۔ طاق پر جلتے ہوئے چراغ کی لو پھڑ پھڑا رہی تھی۔ ایک کونے میں چوہدری نادر پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا حقہ خاموش ہو چکا تھا۔ آمنہ نے قریب پہنچ کر اسے سلام کیا تو بظاہر بے ضرر سگے چچا نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ مدھم لو میں آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو آمنہ کو ماضی کا فرعون انتہائی کمزور دکھائی دیا، لاغر اور ناتواں۔ اس کا وجود ماندہ پڑ چکا تھا اور وہ بمشکل حرکت کر رہا تھا۔ اس کی آواز نحیف تھی۔ حویلی میں داخل ہوتے وقت آمنہ کے جذبوں میں حقارت کا عنصر عود کر آیا تھا، وہ گھبرا بھی رہی تھی مگر اب اس کی متغیر ذہنی کیفیت میں حُبِ انسانی بھی شامل دکھنے لگی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ تاریخ و تغیر کے پس منظر نے اس کی سوچ اور سمجھ میں ابہام پیدا کر دیا تھا اور وہ ذہنی طور پر قدرے ماؤف سی ہو گئی تھی۔ چوہدری نادر البتہ اپنے مطمع نظر کا ادراک رکھتا تھا، توجہ مرکوز کرتا ہوا گویا ہوا۔

''بیٹی! نسلوں کا ورثہ ان دنوں ملیا میٹ ہو گیا۔ تباہی ایسی آئی کہ کچھ نہ بچ سکا، سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا''۔ اس نے کہا۔ پھر ہاتھوں سے اپنی بے چارگی کی عکاسی کی۔ آمنہ اس کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئی۔

''بربادی ایسی آئی ہے کہ کسی نے سنی تھی، نہ دیکھی، ایسا بھی ہو سکتا تھا، کبھی خیال ہی نہ آیا۔ دیکھ لو، کچھ بھی تو نہیں بچا، سبھی کچھ جاتا رہا۔ میں نے اپنی بربادی لمحہ لمحہ دیکھی''۔ چوہدری نادر نے کہا پھر خاموش ہو گیا۔ بے بسی کے عالم میں زمین کی طرف دیکھتا رہا، آخر قوت جمع کرتے ہوئے بولا۔

''جو دریا، نسلوں سے جاگیر کی آبیاری کر رہا تھا، وہ زرخیز مٹی کی رگوں میں لہو کی طرح تھا، صدیوں اس کا پالنہار پھر اسی دریا نے بپھر کر اسے نگل لیا اور نیست و نابود کر دیا''۔ اشک چوہدری نادر کی آنکھوں میں لرزنے لگے، پھر اس کے زرد گالوں پر بہنے لگے۔

''رب، جو میرے اوپر عنایات کرتے نہیں رکتا تھا، قہار ہوا تو مجھے اپنی پہچان کرا گیا، میں پروردگار کو پہلے نہ جان سکا۔ جب اسے جانا تو سب کچھ لد چکا تھا۔ دیکھو مجھے کہ میں فرعون تھا، آج فرعونیت میں ملعون ہوا''۔

چوہدری نادر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

''بیٹی! میں تم سے معافی نہیں مانگوں گا، کسی سے بھی عفو و درگزر کے لئے نہیں کہوں گا، میں تمام گناہ اپنے

ساتھ لے جاؤں گا۔ سرکشی، ظلم و جبر، استبداد، قتل دھوکے اور ناانصافیاں، سبھی میرے ہمراہ جائیں گے۔ اب کوئی کفارہ میری نجات نہیں بن سکتا۔ دنیا میں جو دوزخ بھڑکایا، آخرت میں خود اس کا ایندھن بن جاؤں گا۔ میرا انجام قریب ہے، میں مر رہا ہوں، خدایا مجھے سکون سے موت عطا کر دے، میرے پالنہار، مجھے اجل سے ہمکنار کر دے''۔ چوہدری نادر نے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیئے اور بُری طرح رو پڑا، پھر اسی عالم میں اس نے آمنہ کا ہاتھ تھام لیا اور بدستور روتا رہا۔

سنبھلا تو اس نے خدام کو صدا لگائی۔ کہا کہ جائداد کے کاغذات اس کے حوالے کر دیں۔ دونوں خادم مقفل الماری کی طرف لپکے اور فائلیں نکال کر چوہدری نادر کو تھما دیں لیکن اگلے ہی لمحے کاغذات اس کے ناتواں، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بستر پر بکھر گئے جنہیں سنبھالنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ آمنہ نے غور کیا تو اسے احساس ہوا کہ چوہدری نادر مر رہا تھا۔ یکا یک اس کے ذہن میں خیال عود کر آیا کہ شاید وہ خودکشی کے آخری مراحل میں تھا؟ اسے یاد آیا کہ اس کا چچا مختلف قسم کے زہر اپنی الماریوں میں محفوظ رکھا کرتا تھا اور ان جانوروں پر استعمال کیا کرتا تھا جو اس کی فصلیں برباد کر دیا کرتے تھے۔

''مجھے یقین ہے کہ آپ نے زہر خورانی کی ہے؟'' آمنہ بے ساختہ چیخ پڑی۔ چوہدری نادر نے اس کی طرف دیکھا مگر خاموش رہا۔

''ہمت کر کے جاگیر دوبارہ بسا لینا، باغ دریا برد ہو گئے ہیں اگر دریا انہیں اگل دے تو دوبارہ اگا لینا۔ حویلی پانی میں ڈوب چکی ہے، دیگر عمارتیں بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں علاقے میں شاید ہی کوئی عمارت بچی ہو۔ قریبی بستی، جہاں سے ہمیں افرادی قوت ملا کرتی تھی، اجڑ چکی ہے۔ تمہیں عزم و ہمت سے کام لینا ہو گا۔ جاگیر کے چپے چپے پر انتھک محنت کرنا ہو گی۔ باپ دادا کے ورثے کو خونِ جگر سے آباد کرنا ہو گا اور اسے نئی جہتیں دینا ہوں گی۔ کام آسان نہیں لیکن تم باہمت ہو، کر سکتی ہو''۔ چوہدری نادر تھوڑی دیر کے لئے رکا، پھر بولا۔

''نظام بدل دینا، مَیں جانتا ہوں تم وہ نہیں کرو گی جو میں کرتا رہا''۔ بعدازاں اس نے خدام سے کہا کہ وہ فائلیں آمنہ کے حوالے کر دیں۔ ''خاندان کا کوئی بھی شخص تم سے جائداد میں حصہ نہیں مانگ سکتا، سن لو میں تمام حسابات بے باق کر چکا ہوں''۔ اس نے بمشکل بات مکمل کی۔

''میں آپ کو ہسپتال لے جانا چاہتی ہوں''۔ آمنہ نے بھرائی ہوئی آواز میں اسے رائے دی۔

''اب فائدہ نہیں ہو گا، صرف بدنامی ہو گی۔ میری لاش خدام برف خانے میں رکھوا دیں گے۔ دریا نے اپنا پانی سنبھال لیا تو یہ مجھے دفن بھی کر دیں گے۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے۔ میری موت کا چرچا نہ کرنا، صرف چند لوگوں کو مطلع کرنا اور اجل کی نوعیت سربستہ راز ہی رہنے دینا۔ میں جانتا ہوں، مجھے رونے والا کوئی نہیں ہو گا اور ہاں، مجھے اس ویران قبر میں دفن کروا دینا جو میرے آباؤ اجداد نے بنوائی تھی اور کسی کام نہ آئی۔ میں سمجھتا ہوں میرا جسم اسی قبر کی امانت تھا اور وہ قبر میری موت کا انتظار کر رہی تھی۔ مقامِ عبرت ہے کہ میں اسی قبر میں سما جانا چاہتا ہوں، جس کے پہلو میں بیٹھ کر میں مخالفین کے قتل کے احکام دیا کرتا تھا اور منفی منصوبوں کو حتمی صورت دیا کرتا تھا۔ سچ ہے کہ طاقت میں اندھا، جو دوسروں کے خاندان اجاڑ دیتا ہے، آخر میں خاندان سمیت اجڑ جاتا ہے''۔ چوہدری نادر نے کہا اور ہچکی لی۔ اس کی جسمانی حالت تیزی سے خراب ہونے لگی، پھر جلد ہی اس کا سانس اکھڑ گیا۔

□☀□

جگ بیتی

جب بات کھلی

وہ دلیر مگر اُلٹی کھوپڑی کا آدمی تھا۔ اس نے محض ایک غلطی کی وجہ سے خود کو اور اپنی محبوب بیوی کو اتنی بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

☆ حمید اختر چودھری

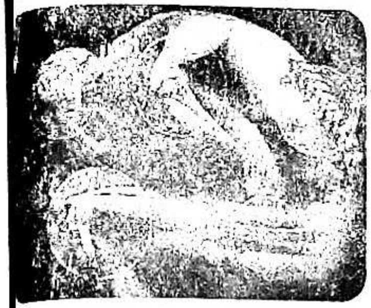

مال کنگنی

ہر گھر کی ضرورت

مساج آئل

سردیوں میں تیز بہدف گرمیوں میں عمل تبدیلی پٹھوں اور تمام قسم کی دردوں کا یقینی علاج

کمر، گردن، کولہے کا درد	ہڈیوں کا گھسنا، گھنٹھیا	رعشہ، سر کا کانپنا، سر درد۔
شیاٹیکا (لنگڑی) کا درد	جوڑوں کی سوزش، درد	پرانی کھانسی، سینے کی جکڑن
گھٹنوں، کندھوں، ایڑھی کا درد	ٹوٹی ہڈی، ایکسیڈنٹ کا درد	پاؤں، ایڑھی کا پھٹنا
گردن، کمر کے مہروں کا درد	درد کا ٹانگ میں اترنا	اعصاب (پٹھوں کا کھچاؤ)
ڈسک سلپ، فالج، لقوہ	موچ، اکڑاؤ، سوجن	فروزن شولڈر

2nd فلور صادق پلازہ 26 پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور
0323-4454249 0323-4329344 0306-6821300

یہ حقیقی زندگی کا ایک سچا ڈرامہ ہے۔ یہ ہمارے گاؤں سے تقریباً تین سومیل دور کے ایک چھوٹے سے شہر سے شروع ہوا تھا۔ ایسے چھوٹے شہر کو آپ عموماً قصبہ لکھا کرتے ہیں۔ میں نے پورا واقعہ اس کہانی کے کرداروں سے سنا تھا۔ اس کا آغاز بارہ تیرہ سال پہلے ہوا تھا بلکہ آپ یوں کہہ لیں کہ انیس بیس سال پہلے کا یہ واقعہ ہے۔

واقعہ اس طرح ہوا تھا کہ اس قصبے میں ایک آدمی نے وہیں کے ایک آدمی کو اتنا زیادہ زخمی کر دیا تھا کہ اس کا زندہ رہ جانا ایک معجزہ تھا۔ معلوم نہیں وہ آدمی کس طرح بچ گیا تھا۔ اس کے بچ جانے سے یہ کیس دفعہ 302 کی بجائے دفعہ 307 بن گیا۔ ملزم کا نام نواب خان فرض کر لیں۔ میں صحیح نام ظاہر نہیں کر سکتا۔ نواب خان جوان آدمی تھا۔ وہ پیدائش طور پر باغی طبیعت کا مالک تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ لڑکپن میں اس کی ماں مر گئی تھی اور اس کا باپ بڑی اکھڑ طبیعت کا تھا۔ وہ خوشحال آدمی تھا۔ ان لوگوں کی کوئی زیادہ رشتہ داری نہیں تھی۔ ان کا پیشہ کاشتکاری بھی تھا اور سرکاری ملازمت بھی۔ نواب کا باپ سرکاری ملازم تھا۔ انہوں نے زمینیں بٹائی پر دی ہوئی تھیں۔ زمینیں قصبے سے ذرا دور تھیں اور مزارعے زمینوں سے اور آگے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ نواب خان زمینوں کی نگرانی کرتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ مزارعوں کے گاؤں میں بھی کبھی کبھی جایا کرتا تھا۔

اس کی عمر تیئس چوبیس سال ہو گئی تو باپ نے اس کی شادی ایک جگہ پکی کر دی۔ نواب خان نے کسی گاؤں کی ایک لڑکی کے ساتھ عشق محبت کا کھیل شروع کیا ہوا تھا۔ ادھر باپ نے شادی کا دن بھی مقرر کر دیا۔ نواب خان نے کہا کہ جو لڑکی اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اس کو گاؤں سے باہر آ کر ملتی ہے اس کے ساتھ وہ بے وفائی نہیں کرے گا۔ اس نے باپ کو بتایا کہ فلاں گاؤں میں فلاں آدمی کے گھر جائے اور اس کی لڑکی کا رشتہ مانگے۔ لڑکی کا باپ انکار نہیں کرے گا۔

باپ محلے میں اپنی بے عزتی کس طرح برداشت کر لیتا؟ ویسے بھی وہ سخت اکھڑ آدمی تھا۔ اس نے نواب خان کو کہا کہ وہ اس کو گلی میں مرغا بنا کر جوتے مارے گا۔

"ابا جی!" نواب خان نے کہا۔ "میری رگوں میں آپ ہی کا خون ہے۔ مرغا بنائیں چاہے بکرا بنائیں، شادی وہیں ہو گی جہاں میں زبان دے چکا ہوں"۔

"دُر ہی ہٹا"۔ باپ نے کہا۔ "جن کے ساتھ میں نے چار آدمیوں کی موجودگی میں دن بھی مقرر کر دیا، ان کو میں کیسے منہ دکھاؤں گا؟"

"ان کو میں منہ دکھاؤں گا"۔ نواب خان نے کہا۔ "میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ نے شادی کا جو دن مقرر کیا ہے میری شادی اسی دن ہو گی"۔

اس نے کر کے بھی دکھا دیا۔ ایک رات وہ گھر سے غائب ہو گیا۔ آدھی رات کے بہت دیر بعد واپس آیا۔ اس کے ساتھ ایک بڑی خوبصورت دیہاتی لڑکی تھی۔ اگلا دن وہ دن تھا جو اس کے باپ نے شادی کے لئے مقرر کیا تھا۔ لڑکی والوں نے شادی کی تیاری نہیں کی تھی کیونکہ نواب خان نے ان کو کہہ دیا تھا کہ وہ ان کی لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔ اس پر ہنگامہ ہو گیا تھا۔ نواب خان کا باپ رو پڑا تھا اور گھر میں بیٹھ گیا تھا۔ نواب خان کو وہ بُرا بھلا کہتا تھا لیکن نواب خان کو پروا ہی نہیں تھی۔

"میری بات غور سے سن لو"۔ نواب خان نے لڑکی والوں کے طعنے اور بک بک سن کر ان کو کہا۔ "میں اپنے باپ کی بے عزتی برداشت نہیں کروں گا۔ زبانیں

بند کر لو۔ میں تم سب کے لئے اکیلا کافی ہوں"۔

تب وہ لوگ چپ ہوئے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ نواب خان لڑاکا جوان ہے اور یہ صرف اس کی عزت کرتا ہے جو اس کی عزت کرتا ہے اور جو اس کو للکارتا ہے اس کو وہ دوسری طرح جواب دیتا ہے۔

نواب خان کسی گاؤں سے لڑکی کو نکال کر لے آیا۔ اس نے باپ کو کہا کہ مولوی صاحب کو بلاؤ اور نکاح پڑھاؤ۔ باپ مجبور ہو گیا۔ باپ کے ایک دوست نے اس کو مشورہ دیا کہ پہلے عدالت میں لڑکی کا بیان لکھوا لو کہ یہ اپنی مرضی سے آئی ہے۔ نواب خان کا باپ خود بھی تعلیم یافتہ آدمی تھا۔ قصبے میں ہی مجسٹریٹ موجود تھا۔ اس کے سامنے لڑکی نے بیان لکھوا دیا اور اس پر دستخط بھی کر دیئے۔ گاؤں کی لڑکیاں دستخط کرنے کے قابل نہیں ہوا کرتی تھیں لیکن پاکستان کی عمر بیس بائیس چودہ سال ہو چکی تھی۔ دیہات میں بھی پرائمری اور مڈل سکول لڑکیوں کے لئے کھل گئے تھے۔ اس لڑکی نے پرائمری پاس کر لی تھی۔

اسی دن اس کا نکاح نواب خان سے پڑھا دیا گیا۔ ان دونوں کے لئے تو یہ بڑی خوشیوں والی تقریب تھی لیکن نواب خان کے باپ نے اس کو اپنی اتنی بے عزتی سمجھا کہ اس کے دل پر اثر ہو گیا۔ وہ جتنا اکھڑ آدمی تھا اتنا ہی مردہ ہو گیا۔ ایک سال بعد وہ دل کے دورے سے انتقال کر گیا۔

اس وقت پاکستان بھی جوان ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی اخلاق بوڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ پاکستانی نوجوان اخلاقی طور پر آزاد ہو گئے تھے۔ یہ قصبہ جو کبھی دیہاتی سا ہوتا تھا، اب شہر بن گیا تھا۔ سائیکلوں کی جگہ سکوٹر آ گئے تھے۔ فلمی گانے ٹرانسسٹروں کے ذریعے گلیوں میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ نواب خان کی بیوی نجمہ (اصلی نام کچھ اور تھا) دیہات کی لڑکی تھی پردہ نہیں کرتی تھی۔ نوجوانوں نے تاک جھانک شروع کر دی۔ ایک دفعہ تو اس لڑکی نے خود ہی ایک لڑکے کی مرمت کر دی پھر دو لڑکوں کا دماغ نواب خان نے درست کیا۔ بات ان لڑکوں کے باپوں اور بھائیوں تک پہنچی تو معاملہ تھانے تک چلا گیا۔ تھانیدار نے لڑکوں کو ڈرایا دھمکایا پھر نواب خان کو سمجھایا کہ وہ قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کرے۔ اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

جن کی بیٹی کو نواب خان نے نامنظور کر دیا تھا وہ چاردیواری کی دنیا کی سیاست کے ماہر تھے۔ انہوں نے نواب خان اور اس کی بیوی کے خلاف باقاعدہ دشمنی رکھ لی۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی کو ذلیل اور رسوا کرنا ہو تو کیسے کیسے ڈھنگ اور طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ شاید اسی کو سرد جنگ کہتے ہیں۔ عورتیں اس کی ماہر ہوتی ہیں۔ انہوں نے ڈھکے چھپے انداز میں نواب خان اور اس کی بیوی کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔

انہوں نے یہاں تک کیا کہ کسی طرح معلوم کر لیا کہ لڑکی کون سے گاؤں سے آئی ہے۔ انہوں نے وہاں خبر پہنچائی کہ ان کی لڑکی نواب خان کے گھر میں ہے۔ یہ بات نواب خان کو کسی طرح معلوم ہو گئی لیکن لڑکی والوں نے کوئی ہل جل نہ کی۔ اس وقت تک نجمہ کا پہلا بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ وہ اگر کوئی کارروائی کرتے بھی تو کیا کر سکتے تھے۔ نجمہ کو اغوا تو نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے وارثوں کو پتہ لگ گیا ہو گا کہ نجمہ نے مجسٹریٹ کو بیان دے دیا ہے۔

نجمہ کا پہلا بچہ پیدا ہوا جو بیٹا تھا۔

دشمنوں نے پراپیگنڈہ جاری رکھا۔ یہ عام قسم کا پراپیگنڈہ نہیں تھا۔ ان لوگوں میں کوئی ایسا دماغ موجود تھا جو بڑے استادی طریقے سے یہ کام کر رہا تھا۔ مثال کے طور پر نواب خان کے کانوں تک ایسی آوازیں پہنچیے

لگیں جیسے اس کی بیوی نجمہ اس سے اکتا گئی ہے اور وہ اپنے ماں باپ کے گھر کچھ دنوں کے لئے جانا چاہتی ہے۔ نواب خان نے اس سے پوچھا تو نجمہ نے حیران ہو کر کہا کہ اس نے ایسی بات کبھی سوچی بھی نہیں۔

پھر نواب خان کو باہر سے اس طرح اشارے ملنے لگے جیسے نجمہ کسی اور کو چاہتی ہے۔ نواب خان نے یہ بات بھی نجمہ سے پوچھی۔ نجمہ پریشان ہو گئی اور وہ ذرا غصے سے بولی۔ اس کا غصہ نواب خان کو اچھا نہ لگا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اتنا وقت گزر گیا کہ ان کا پہلا بچہ چار سال کا ہو گیا اور نجمہ ایک اور بچے کی ماں بننے والی ہو گئی۔

ان چار سالوں میں نواب خان کے ذہن میں یہ وہم بیٹھ گیا تھا کہ نجمہ کے دل میں وہ محبت کم ہو گئی ہے جس محبت نے اس کو اپنے ماں باپ اور اپنے گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مشکل یہ بنی کہ نواب خان کے دو دوست دشمنوں کے درپردہ پراپیگنڈے سے متاثر ہو گئے۔ وہ اس کے وفادار دوست تھے۔ انہوں نے بھی نواب خان کو کہا کہ عورت ذات کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ جو لڑکی اتنی دلیری سے اس کے پیچھے گھر سے نکل آئی تھی وہ بے وفائی کر سکتی ہے۔

دوستوں کی یہ بات نواب خان کے دل میں بیٹھ گئی۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ نجمہ اب اس کے ساتھ پہلے کی طرح چونچلے اور شوخیاں نہیں کرتی تھی۔ اس کی وجہ صاف ظاہر تھی جس کو نواب خان نہیں سمجھا۔ وجہ یہ تھی کہ اب اس کے دو بچے تھے۔ ایک دودھ پیتا تھا، اس کی توجہ بچوں کی طرف ہو گئی تھی جیسے ہر ماں کی ہو جاتی ہے۔

ایک روز نواب خان کے ایک دوست نے اس کو بتایا کہ فلاں آدمی نجمہ کے خلاف باتیں کر رہا تھا۔ اس کو جو باتیں بتائی گئیں وہ کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ نواب خان میں تو برداشت کی عادت ہی نہیں تھی۔ اس نے اس آدمی کے گھر جا کر اس کو باہر بلایا اور اس پر حملہ کر دیا۔ وہ اپنے ساتھ چاقو لے کر گیا تھا اور اس کا ارادہ یہی تھا کہ اس آدمی کو وہ قتل کر دے گا۔ اس نے زیادہ تر چاقو پیٹ میں ہی مارے۔ نواب خان وہاں سے بھاگا نہیں۔ وہ للکارتا رہا کہ میں یہاں کھڑا ہوں۔ جاؤ اور پولیس کو بلا لاؤ۔

کوئی آدمی قریب نہیں آتا تھا کہ زخمی کو اٹھا لے۔ دو بوڑھے معزز آدمی آگے بڑھے۔ نواب خان نے اُن کا احترام کیا اور پرے ہٹ گیا لیکن وہیں کھڑا رہا۔ زخمی کو ہسپتال لے گئے۔ قصبے کے سرکاری ڈاکٹر نے کہا کہ اسے فوراً شہر لے جاؤ۔ ڈاکٹر نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہاں تک یہ زندہ نہیں رہے گا۔ پولیس آئی اور نواب خان کو چاقو سمیت پکڑ کر لے گئی۔

نجمہ اور اپنے دو بچوں کا نواب خان کو یہ غم نہیں تھا کہ وہ روٹی کہاں سے کھائیں گے۔ مکان اس کا اپنا تھا اور کھیتوں سے سارے سال کے لئے دانے بھی آ جاتے تھے اور کیش بھی مل جاتا تھا۔ گھر میں ایک بھینس تھی جو دودھ، مکھن اور گھی پورا کر دیتی تھی۔ نواب خان نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کے جرم کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کو عمر قید یا سزائے موت ہو گئی تو اس کی بیوی اور بچوں کا کیا بنے گا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ نواب خان نرالا ہی آدمی تھا۔ اس کو ابنارمل کہنا بھی غلط نہیں۔

جس آدمی کو اس نے اپنی طرف سے قتل کر دیا تھا اس کو شہر کے ڈاکٹروں نے بچا لیا۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے پیٹ میں چاقوؤں کے زخم کتنے گہرے تھے اور اس کو ڈاکٹروں نے کس طرح بچا لیا تھا۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی زندگی کے دن ابھی باقی تھے۔ وہ زندہ رہا۔

پاکستان میں جس رفتار سے مقدموں کا فیصلہ ہوتا ہے وہ آپ جانتے ہیں۔ دو سال اور تین چار مہینوں بعد نواب خان کو چھ سال سزائے قید سنائی گئی۔ مقدمے کے دوران اس کی ضمانت نہیں ہوئی تھی۔ سیشن جج نے فیصلے میں یہ بھی لکھا کہ وہ جتنی مدت جیل میں گزار چکا ہے وہ سزا میں شامل ہے۔ اس طرح نواب خان نے چار سال جیل میں گزارنے تھے۔

جتنا عرصہ وہ اپنے قصبے کی قریبی جیل میں رہا اس کی بیوی مہینے میں ایک بار اس کی ملاقات کے لئے جاتی رہی۔ ایک سال بعد اس کو پنجاب کی ایک اور جیل میں بھیج دیا گیا۔ یہ شہر دور تھا۔ اس نے بیوی کو ملاقات کے لئے آنے سے منع کر دیا۔ دو بچوں کو ساتھ لے کر بس یا ریل گاڑی پر اتنی دور جانا اکیلی عورت کے لئے مشکل تھا، پھر بھی نجمہ تیسرے چوتھے مہینے چلی جاتی تھی۔

نجمہ اکیلی رہ گئی۔ اس کے اپنے والدین نے اس کو دل سے اتار دیا تھا اور اپنے محلے میں نواب خان کے جو رشتہ دار تھے وہ اس سے روٹھے ہوئے تھے۔ ایک خطرہ یہ تھا کہ دشمن نجمہ کا جینا حرام کر دیں گے۔ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ محلے کے نوجوان چھیڑ خانی کریں گے لیکن دشمن بھی خاموش رہے اور کسی نے چھیڑ خانی بھی نہ کی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی پر قاتلانہ حملے کی سوچ کر نواب خان سے سب ڈر گئے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ نواب خان چار سال بعد آ جائے گا اور وہ ویسا ہی انتقام لے گا۔

سزائے قید میں جیل کا سپرنٹنڈنٹ کچھ تخفیف کرنے کا اختیار رکھتا ہے جس کو جیل کی زبان میں معافی کہتے ہیں۔ نواب خان کبھی کبھار نجمہ کو خط لکھا کرتا تھا۔ اس نے ساڑھے تین سال بعد آخری خط لکھا جس میں اس نے نجمہ کو اطلاع دی کہ وہ فلاں تاریخ کو رہا ہو رہا ہے۔ رہائی میں ایک مہینہ باقی تھا۔ نجمہ بہت خوش تھی۔ مصیبت اور جدائی ختم ہو رہی تھی۔ اس وقت نواب خان ایک اور جیل میں تھا جو زیادہ دور کے شہر میں نہیں تھی۔

پندرہ سولہ دن گزر گئے تو ایک آدمی نجمہ کے گھر آیا۔ وہ قصبے سے تھوڑا ہی دور ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔

''میں جیل سے رہا ہو کر آ رہا ہوں''۔ اس آدمی نے نجمہ کو بتایا۔ ''نواب خان جیل میں میرا دوست بن گیا تھا۔ وہ پرسوں رہا ہو کر آ رہا ہے...... میں یہاں گاڑی سے اترا ہوں اپنے گاؤں جا رہا تھا تو خیال آ گیا کہ نواب خان یہیں کا رہنے والا ہیں میں نے ایک آدمی سے پوچھا تو اس نے مجھ کو اس کا گھر بتا دیا۔ میں نے یہ بہتر سمجھا کہ آپ کو بتاتا جاؤں کہ نواب خان پرسوں آ رہا ہے''۔

اس نے خط لکھا تھا کہ وہ ایک مہینے بعد رہا ہو رہا ہے''۔ نجمہ نے کہا۔ ''ابھی تو آدھا مہینہ گزرا ہے''۔

''اس نے ٹھیک لکھا تھا''۔ اس آدمی نے کہا۔ ''معافیاں جو اس کو ملی ہیں ان کے حساب سے اس نے رہائی کی تاریخ ٹھیک لکھی تھی لیکن دو روز گزرے سپرنٹنڈنٹ دورے پر آیا تو نواب خان نے عرض کی کہ اس کی سزا چند دن رہتی ہے، اس کو یہ دن معافی دی جائے۔ سپرنٹنڈنٹ نے اس کو معافی لکھ دی۔ اس حساب سے وہ پرسوں شام کو گھر آ جائے گا۔ اس کی رہائی کی تاریخ لکھی گئی ہے''۔

نجمہ نے اپنے خاوند کے اس دوست کی خاطر تواضع کی اور وہ چلا گیا۔ نجمہ کی خوشی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا بڑا بیٹا دس سال کا اور چھوٹا چھ سال کا ہو گیا تھا۔ دونوں بچے خوشی سے ناچتے کودتے پھرتے تھے کہ ابو آ رہا ہے۔

نجمہ نے سر اٹھا کر امام صاحب کو دیکھا۔ وہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئی کہ امام صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''کیا بات ہے مولوی صاحب؟''

''ناظر میرا بیٹا ہے''۔ امام صاحب نے نجمہ کے چھوٹے بیٹے کا نام لے کر کہا۔ ''یہ ہمارا بیٹا ہے...... تم مجھے نہیں پہچان سکو گی۔ میں نے تمہیں دس دن پہلے پہچان لیا تھا''۔

نجمہ نے امام صاحب کو غور سے دیکھا۔ ان کی داڑھی گھنی تھی جو چہرے کے زیادہ حصے پر پھیلی ہوئی تھی۔

''نواب خان؟'' نجمہ نے سرگوشی کی۔

''ہاں''۔ امام صاحب نے جواب دیا۔ ''نواب خان...... لیکن یہاں میں نواب خان نہیں ہوں۔ میں نے اپنا نام بدل لیا تھا''۔

نجمہ کو تو غشی آنے لگی تھی۔ خوشی کا یہ دھکا اس کی برداشت سے باہر تھا اس کا خاوند زندہ تھا اور اس کے ساتھ یہ صدمہ کہ خاوند اس کو چھوڑ کر چلا کیوں گیا تھا؟

''تم نے یہ کیا کیا ہے؟'' نجمہ نے پوچھا۔ ''میرا کچھ خیال نہ کیا۔ تم نے اپنے بچوں کا بھی خیال نہ کیا''۔

''ایک بات بتاؤ نجمہ!'' امام صاحب نے کہا۔ ''تم اس رات کہاں چلی گئی تھی؟''

امام صاحب نے نجمہ کو وہ رات یاد دلائی۔

''اس رات میں بچوں کو ساتھ لے کر تمہاری راہ دیکھنے چلی گئی تھی''۔ نجمہ نے کہا۔ ''تم نے اس رات آنا تھا''۔

''تمہیں کیسے پتہ لگا تھا کہ میں نے اس رات آنا ہے؟'' امام صاحب نے پوچھا۔ ''میں نے خط میں اس سے آگے کی تاریخ لکھی تھی...... میری بات سن لو نجمہ! تم نہیں جانتیں کہ میں نے یہ تیرہ چودہ سال کس طرح گزارے ہیں۔ تم خدا کے گھر میں بیٹھی ہو۔ یہاں تم نے جھوٹ بولا تو کوڑھی ہو کر مرو گی''۔

''ایسی بات ہے تو درمیان میں قرآن شریف رکھ لو''۔ نجمہ نے کہا۔ ''جس اللہ نے میری اور میرے بچوں کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور جس اللہ نے مجھ کو وہ خاوند زندہ دے دیا ہے جس کو مرا ہوا سمجھتی تھی اس اللہ کے دربار میں بیٹھ کر جھوٹ نہیں بولوں گی...... لیکن پہلے تم بات کرو کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ یہ تو تمہارے ساتھ شادی کر کے مجھ کو پتہ لگا تھا کہ تمہاری کھوپڑی الٹی ہے۔ تمہارے مغز میں جو سوچ آ جاتی ہے تم سمجھ لیتے ہو کہ یہی سچ ہے باقی سب جھوٹ ہے''۔

''اس رات تم نے مرغی اور کوفتے کس لئے پکائے تھے؟'' امام نے پوچھا۔ ''اور دوسرے کمرے میں اتنا خوبصورت بستر کس کے لئے بچھایا تھا؟''

''تمہارے ساتھ ایک قیدی تھا''۔ نجمہ نے کہا۔ ''وہ رہا ہو کر آیا تو اپنے گاؤں کو جاتے ہمارے گھر میں آ گیا۔ اس نے بتایا کہ تمہیں قید کے باقی دنوں کی معافی مل گئی ہے اور تم پرسوں شام کی گاڑی سے آ رہے ہو۔ میرے لئے اور بچوں کے لئے تو یہ قیدی عید کا چاند تھا جو عید کی خبر دے گیا تھا۔ تمہارے آنے کے دن تو میں کھانے ہی پکاتی رہی۔ میں بچوں کے کمرے میں سویا کرتی تھی۔ اس رات میں نے دوسرے کمرے میں ٹرنک سے نیا پلنگ پوش نکال کر بچھایا اور اس کمرے میں اگر بتیاں بھی جلائی تھیں۔ جب گاڑی کا وقت قریب آیا تو میں اتنی بے تاب ہوئی کہ بچوں کو ساتھ لے کر گلی کے سرے تک چلی گئی''۔

امام صاحب نے اپنے لاپتہ ہونے کا جو قصہ سنایا وہ اپنے لفظوں میں سناؤں گا۔ چونکہ میں اس کنبے کے ہر فرد سے ملا ہوں اور ہر ایک نے اپنی بات پوری سنائی ہے اس لئے میں آپ کو یہ بھی بتا سکوں گا کہ یہ کیوں ہوا اور وہ کیوں ہوا۔ نواب خان کو میں امام صاحب ہی لکھوں گا کیونکہ وہ امام صاحب ہیں اور میں ہی نہیں گاؤں کے سارے لوگ ان کا احترام کرتے ہیں۔

انہوں نے نجمہ کو سنایا کہ وہ اسی دن رہا ہوئے تھے جس دن کی اطلاع ان کا ایک قیدی دوست نجمہ کو دے گیا تھا۔ اس قیدی نے امام صاحب کو نہیں بتایا تھا کہ وہ ان کے گھر جائے گا۔ امام صاحب نے سوچا تھا کہ وہ اچانک گھر پہنچیں گے تو نجمہ اور بچے بہت حیران ہوں گے اور ان کو خوشی بھی بہت ہو گی۔ وہ اپنے گھر پہنچے تو دروازے کی باہر والی کنڈی لگی ہوئی تھی۔

وہ دوسری گلی کی طرف سے آئے تھے۔ نجمہ ان کے انتظار میں دوسری طرف چلی گئی۔ امام صاحب کنڈی کھول کر اندر چلے گئے۔ برآمدے اور ایک کمرے کی بتیاں روشن تھیں۔ باورچی خانے کا بلب بھی جل رہا تھا۔ امام صاحب نے ایک دیگچے کا ڈھکنا اٹھایا تو اس میں مرغی کا سالن تھا۔ دوسرے دیگچے میں کوفتے اور تیسرے میں کسٹرڈ تھا۔ انہوں نے کمروں میں پھر کر دیکھا۔ ایک کمرے میں پلنگ پر نیا پلنگ پوش دیکھا۔ اگر بتیاں جلتی دیکھیں۔ یہ کمرہ اس طرح سجا سجایا ہوا تھا کہ اس طرح امام صاحب کی موجودگی میں اور بچوں کی پیدائش سے پہلے بھی نجمہ نے کبھی نہیں سجایا تھا۔

امام صاحب کے بارے میں بتا چکا ہوں کہ دشمنوں کے پروپیگنڈے نے ان کو نجمہ کے بارے میں وہمی بنا دیا تھا۔ انہوں نے مجھ کو اپنے بارے میں یہ بات بے تکلفی سے سنائی تھی۔ جیل میں ان کو بعض قیدیوں نے بتایا تھا کہ جس کو لمبی قید مل جائے اس کی بیوی اتنا لمبا عرصہ پاکدامن نہیں رہ سکتی۔ امام صاحب جب نواب خان ہوتے تھے تو ان کا مزاج ایسا تھا کہ جو بات دماغ میں آ گئی اسی کو برحق نان لیتے تھے جیل میں ان کا دماغ اور زیادہ خراب ہو گیا تھا۔

انہوں نے جیل سے آ کر اپنی بیوی کو گھر سے غیر حاضر پایا اور دعوت کا انتظام دیکھا اور کمروں کی سجاوٹ دیکھی تو ان کو یقین ہو گیا کہ نجمہ نے گھر میں عیش موج بنائی ہوئی ہے۔ امام صاحب کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ نجمہ کو ان کے آنے کی اطلاع مل چکی ہے کہ وہ فلاں دن آ رہے ہیں۔ وہ اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ گھر سے نکلے، دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا کر جدھر سے آئے تھے ادھر ہی چلے گئے۔ رات ابھی ابھی شروع ہوئی تھی لیکن سردیوں کی وجہ سے لوگ گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے اس لئے ان کو محلے کے کسی آدمی نے آتے اور جاتے نہ دیکھا۔

وہ کہتے ہیں کہ ان کے ہوش اور حواس صحیح تھے لیکن میں نہیں مانتا۔ وہ اپنے شہر سے چلے گئیں یہ ایک اور کہانی ہے کہ وہ کہاں کہاں گئے۔ وہ اوپر کی طرف اٹک تک اور نیچے کی طرف رحیم یار خان تک گئے۔ تین چار مہینے آزاد کشمیر میں میرپور کے علاقے میں بھی گزارے۔ ملنگوں کے ساتھ چرس بھی پیتے رہے۔ وہ سکون کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ آخر انہیں ایک مسجد کے مولوی صاحب سے سکون ملا۔ ان کی انہوں نے بہت خدمت کی اور ایسا فیض حاصل کیا کہ انہی جیسے مولوی بن گئے اور وہ سکون حاصل کر لیا جس کی تلاش میں وہ پانچ چھ سال بھٹکتے رہے تھے۔ اللہ کی ذات باری نے ان کو یہ انعام دیا کہ ان کو پورے کا پورا کنبہ دے دیا۔ اس نے محض ایک غلط فہمی کی وجہ اپنی اور نجمہ کی زندگی کے اتنے سارے سنہرے سال ضائع کر دیتے تھے۔

◆☆◆

ہومیوپیتھی واحد طریقۂ علاج ہے

جو

مرض کا علاج نہیں کرتا بلکہ مرض کی وجوہات کو ختم کرتا ہے۔ علامات کو وقتی طور پر دباتا نہیں، مرض کو ہمیشہ کے لئے ختم کرتا ہے۔ ہومیوپیتھی واحد طریقۂ تشخیص ہے جو بتاتا ہے کہ جسمانی مرض کا باعث جسمانی ہے یا نفسیاتی۔ باعث جسمانی ہو یا نفسیاتی، ہومیوپیتھی کے سوا کوئی آپ کی مدد نہیں کرسکتا۔

کوئی مرض لاعلاج نہیں

خواہ وہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کے تمام امراض خصوصاً پرانے (کرانک) اور بگڑے ہوئے امراض، معذور بچوں کے علاج کے لئے دستِ شفاء ''حکایت'' سے رجوع کریں۔

رابطہ کے لئے

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ) • 0321-7612717 / 0312-6625066

عارف محمود 0323-4329344

بالمشافہ ملاقات کے لئے پہلے وقت لیں۔

دستِ شفاء حکایت 26 پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور

جنرل نیازی کا خط

جنرل نیازی بنام جسٹس حمود الرحمٰن

کمیشن نے اپنی رپورٹ ان لوگوں کی گواہی پر تیار کی اور نتیجے اخذ کئے جن کو نااہلی، بزدلی یا کسی اور گمناؤنے قصور کی وجہ سے مشرقی پاکستان سے نکال دیا گیا تھا۔ ہمیں تو بعد میں خانہ پُری اور دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ تمام فیصلے پہلے ہی ہو چکے تھے۔

☆ ملک محمد ساجد گل اعوان

سقوطِ مشرقی پاکستان اسلامی تاریخ کا ایسا المناک باب ہے جسے صدیوں بھلایا نہ جاسکے گا۔ ستم یہ ہوا کہ نااہل سیاستدانوں نے اپنے کالے کرتوتوں کی سیاہی افواج پاکستان کے منہ پر ملنے اور بدنام کرنے کی شرمناک کوشش کی جو ناکام رہی۔ 23 دسمبر 1971ء مسٹر بھٹو نے جسٹس حمود الرحمٰن کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا۔ کمیشن نے ان حالات کی تحقیق کرنا تھی جن میں ایسٹرن کمان کے کمانڈر نے سرنڈر کیا اور مسلح افواج نے ہتھیار ڈالے۔

کمیشن نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ اور سفارشات نومبر 1974ء میں مسٹر بھٹو کو پیش کر دی۔ اس رپورٹ کی چار کاپیاں تھیں جن میں سے تین کاپیاں مسٹر بھٹو نے ضائع کر دیں۔ یہ ایک ایسی رپورٹ تھی جس میں ملزمان کو گواہوں پر جرح کرنے کا موقع نہ دیا گیا اور کمیشن کئی اہم دستاویزات کئی بار اصرار کے باوجود حکومت سے طلب نہ کر سکا۔ اس رپورٹ کی بھلا کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ کمیشن اس ذلت کا سبب بننے والے عوامل اور کرداروں کی نشاندہی کرتا مگر بھٹو حکومت نے سارا زور اس بات پر صرف کر دیا کہ یہ شکست سیاسی نہیں بلکہ فوجی تھی۔

اس ضمن میں جنرل نیازی نے 8 جولائی 1979ء میں جسٹس حمود الرحمٰن کو ایک خط لکھا جو یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

باسم سبحانہ

08-07-1979

جناب حمود الرحمٰن صاحب السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بفضل خدا بخیریت ہوں گے۔ جج صاحب! روزنامہ ''نوائے وقت'' کے 6 جولائی کے شمارے میں آپ کا بیان شائع ہوا جس میں آپ نے یہ انکشاف

فرمایا کہ کمیشن نے جس کے آپ سربراہ تھے، جنرل یحییٰ اور مجھ پر (جنرل نیازی) مقدمہ چلانے کی سفارش کی تھی۔ کمیشن کی رپورٹ چونکہ اب تک منظرِ عام پر نہیں آئی اس لئے آپ کے اس بیان کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کمیشن کی مفصل رپورٹ فی الحال ایک سربستہ راز ہے۔ اس لئے آپ کے لئے مناسب نہیں تھا کہ آپ صرف اتنا ہی انکشاف کرتے کہ جنرل یحییٰ اور جنرل نیازی کے خلاف مقدمہ چلانے کی سفارش کمیشن نے کی تھی۔ ایسے انکشاف کے لئے کوئی موقع محل بھی نہ تھا۔

آپ سیاستدان نہیں بلکہ گورنمنٹ کے ملازم ہیں اگر کسی استقبالیہ میں آپ سے ایسا استفسار کیا بھی گیا تھا تو آپ کے لئے ضروری نہیں تھا کہ آپ اس کا جواب دیتے۔ کمیشن کی رپورٹ عوام کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے آپ کے اس بیان کے نتیجے میں ہمارے خلاف ہمہ قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اگر کمیشن کی رپورٹ کا پورا متن نہیں تو کم از کم اس کا وہ حصہ جس بنیاد پر مقدمہ چلانے کی سفارش کی گئی تھی۔ عوام کے سامنے رکھنا چاہئے تھا کیونکہ آپ نے بھٹو کے دور میں ایک کمیشن کے سربراہ کی حیثیت سے خان عبدالولی خان کے خلاف جو سفارشات مرتب کی تھیں وہ بھی سب جانتے ہیں اور جو اس کا حشر ہوا وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ اس کے متعلق جو عالمی رائے تھی وہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

میں آپ سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا مشرقی پاکستان کا سقوط سیاسی شکست تھا یا فوجی شکست کا نتیجہ تھا۔ اس کے متعلق بھی عوام کو آگاہ کرنا ضروری ہے اور اگر سیاسی شکست تھی تو اس کے عوامل کیا تھے اور اس کے لئے کون کون ذمہ دار تھا۔ کمیشن نے جو اظہار رائے اپنی رپورٹ میں اس کے متعلق کیا اس کا منظرِ عام پر آنا ضروری ہے۔ اگر کمیشن اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سقوط ڈھاکہ فوجی شکست کا نتیجہ تھا تو کیا اس کے لئے صرف میں اور جنرل یحییٰ ہی ذمہ دار تھے یا اور لوگ بھی اس کے ذمہ دار قرار دیئے گئے؟ ابتدائی مراحل میں مجھے کمیشن کے سامنے پیش ہونے کا موقع اس لئے نہ ملا کہ میں ہندوستان میں بطور جنگی قیدی قید تھا اور کمیشن نے اپنی رپورٹ ان لوگوں کی گواہی پر تیار کی اور نتیجے اخذ کئے جن کو نااہلی، بزدلی یا کسی اور گھناؤنے قصور کی وجہ سے مشرقی پاکستان سے نکال دیا گیا تھا۔ ہمیں تو بعد میں خانہ پُری اور دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ تمام فیصلے پہلے ہی ہو چکے تھے۔

جج صاحب! اب چند سوالات ہیں براہ کرم ان کا جواب ضرور دیں۔ ان کے پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہوگا۔

1- میرے اور یحییٰ کی بابت تو اپنی رائے کا اظہار فرمایا آپ کی رپورٹ میں جنرل ٹکا خان، ایڈمرل احسن، جنرل یعقوب، جنرل پیرزادہ، جنرل فرمان، جنرل گل حسن، جنرل عمر، ائر مارشل رحیم خان، ایڈمرل مظفر بھٹو، مجیب الرحمٰن اور ایم ایم احمد کی بابت کیا لکھا ہے؟

2- کیا سانحہ مشرقی پاکستان فوری حادثے کے طور پر عمل میں آیا تھا یا ایک سوچے سمجھے منصوبے اور سازش کے تحت ہوا۔ ان میں کون کون ملوث تھے؟

3- یحییٰ خان کا ذکر آپ نے بطور سالارِ اعلیٰ کے کیا ہے یا بطور سربراہ مملکت و سول انتظامیہ کے اور یہ کہ کمیشن کی سفارشات کے باوجود مقدمات کیوں نہ چلائے گئے۔ برعکس اس کے یحییٰ خان دو پنشن لے رہا ہے۔ ایک جنرل کی اور ایک صدر کی۔ خدارا! قوم کو یہ بھی بتلا دو کہ آیا وہ ان کا حقدار ہے کہ نہیں؟

4- آپ کا یعنی کمیشن کا کام حکومت کو واقعات کی رپورٹ پیش کرنی تھی۔ یا عدالت کی طرح سزا کا فیصلہ سنانا تھا اور جبکہ آپ کی رپورٹ کو حکومت نے باقاعدہ طور پر تسلیم ہی نہیں کیا تھا تو کیا آپ اس کے مندرجات ظاہر کرنا درست سمجھتے ہیں بالکل ناواجب ہے۔

5- آیا یہ بات بطور کمیشن کے سربراہ کے کہی ہے یا بطور ایک پاکستانی یا بطور مفاد پرست شخص کے اور کیا یہ بیان آپ بطور گورنمنٹ ملازم کے دینے میں حق بجانب تھے؟

6- سقوط مشرقی پاکستان ایک قومی المیہ تھا، کمیشن کو جو کام سونپا گیا تھا وہ اس المیہ کے تمام پہلو جاننے کے لئے کافی تھا اور اگر ناکافی تھا (جو کہ کافی ناکافی تھا) تو کیا آپ نے اس متعلق اظہار کیا تھا؟

7- کیا اس رپورٹ میں آپ نے اور دیگر ممبران نے آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کیا یا آپ سے رپورٹ لکھوائی گئی اور اس میں رد و بدل کیا گیا؟

8- جب رپورٹ کی اصلی کاپی آپ سے بھٹو نے لی تھی تو کیا آپ نے قوم کو بروقت آگاہ کیا کہ میری کاپی بھٹو لے گیا اور رپورٹ میں رد و بدل ہو رہا ہے؟ اس بابت آپ چپ کیوں رہے؟ سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے وہ کاپی دینے سے انکار کیوں نہ کیا؟ کیا یہ کاپی آپ سے آپ کو ڈرا دھمکا کر لی گئی یا آپ نے ذاتی مفاد حاصل کرنے کے لئے دے دی اور چپ رہے۔ یا کوئی اور مصلحت پیش نظر تھی؟

9- بھٹو نے اپنی کرسی بچانے کے لئے انتخابات میں دھاندلی کرانے کے لئے اپنے مقصد کے لئے موزوں آدمیوں کو سرکاری عہدوں کے لئے منتخب کیا تھا۔ کیا آپ کا انتخاب اسی تعریف میں نہیں آتا؟ کیا کمیشن میں بہت سے فالتو آدمی نہ تھے۔ جن کو وہاں نہیں ہونا چاہئے تھا۔ کیا ان کی موجودگی میں آپ رپورٹ خفیہ رکھ سکتے تھے اور آزادانہ طور پر نتیجے اخذ کر سکتے تھے؟

10- 7 جولائی کے ”نوائے وقت“ میں جنرل ٹکا خان نے کہا ہے کہ سقوط مشرقی پاکستان میں جو لوگ ملوث ہیں ان کو بے نقاب کیا جائے؟ اس کے اس دلیرانہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمیشن نے بھٹو اور ٹکا کو سقوط مشرقی پاکستان کا ذمہ دار انہیں ٹھہرایا اس لئے آپ کے کمیشن کی رپورٹ کی اہمیت اور سچائی کا اندازہ

قسمت

* ہر آدمی اپنی قسمت کا خود معمار ہے۔ (سالسٹ)
* قسمت اپنے چاہنے والوں کو بے وقوف بناتی ہے۔ (بیکن)
* قسمت اور محبت جواں ہمتوں پر مہربان ہوتی ہے۔ (اووڈ)
* قسمت کے پیالے سے اپنا حصہ کھینچنا پڑتا ہے۔ (ہومر)
* قسمت انسان کی زندگی پر حکومت کرتی ہے، نہ کہ عقل۔ (سسرو)
* ہم اپنی قسمت خود بناتے ہیں اور اُسے مقدر کی کارستانی کہتے ہیں۔ (الرائے)
* انسانی زندگی دلائل سے زیادہ قسمت کی محتاج ہے۔ (ہومر)
* ہم نہیں جانتے کہ بُری قسمت والوں کے لئے کون سی چیز اچھی ہے۔ (روسو)

مرسلہ: عبیرہ شہزادی- لاہور

ہو سکتا ہے۔

11- میں آپ کو ایک چھوٹا سا مشورہ دیتا ہوں اگر اس پر عمل کریں گے تو آپ کا اور ملک دونوں کا فائدہ ہے۔ آپ گورنمنٹ کے ملازم ہیں نہ کہ سیاستدان۔ آپ سیاسی معاملوں میں رائے زنی نہ کریں تو بہتر ہوگا۔ آپ نے کہا ہے کہ اسلامی نظام صدارتی نظام کے زیادہ قریب ہے۔ اس پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ پھر اس کو متنازعہ مسئلہ نہ بنائیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ بات آپ نے خود کہی ہے یا کسی کے کہنے پر۔ دونوں صورتوں میں غلط بات ہے۔

جناب حمودالرحمٰن ! خدا کا شکر اور پاکستان کو دعائیں دو کہ آپ کے ماضی اور مستقبل کے ارادوں کو جانتے ہوئے آپ کو ذمہ دار جگہوں پر نوازا جاتا ہے۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اللہ کے کاموں میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ظالم، غدار، سازشی، خوشامدی اور ابن الوقت ان سب کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے۔ جس طرح ان کا عروج حیرت ناک ہوتا ہے اسی طرح ان کا زوال بھی عبرتناک ہوتا ہے۔ بھٹو نے اور ٹکا خان نے اور ان کے حواریوں نے اس ملک کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور افواج پاکستان کو جان بوجھ کر ذلیل کرایا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ ان کو کیسے معاف کیا جا سکتا ہے؟ ان سے حساب چکانا ہے۔ ٹکا خان کے بیان سے اور آپ کے ارشادات کے مطابق ٹکا خان بذات خود اور بھٹو بے گناہ ہے۔ اس سے ہی آپ کی رپورٹ کی اہمیت کا اور غیر جانبداری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے؟

12- آخر میں اتنی اور گزارش ہے کہ چونکہ آپ نے کمیشن کی رپورٹ کو ظاہر کرنا شروع کر دیا ہے تو ایک دو اور باتوں پر بھی روشنی ڈالیں:۔

المیہ مشرقی پاکستان کا جب بھی ذکر آتا ہے تو مشرقی محاذ کی محدود جنگ اور اس کے کمانڈر کو موردِ الزام ٹھہرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیا آپ کے کمیشن کی رپورٹ میں مغربی محاذ پر فوج کی کارکردگی کا بھی جائزہ لیا گیا؟

اس جنگ کے دوران میرے پاس تین نامکمل ڈویژن فوج 14 پرانے ہوائی جہاز، بحریہ کی 4 گن بوٹوں کے علاوہ پاکستان کی عسکری قوت مغربی محاذ پر تھی۔ سالار اعلیٰ کے علاوہ تینوں فوجوں کے سربراہ اور ان کے علاوہ درجنوں کے حساب سے جرنیل، ائر مارشلز اور ایڈمرلز موجود تھے۔ 6 کروڑ محب وطن عوام تھے۔ پیچھے افغانستان اور ایران کے مسلم ممالک تھے۔ گورنمنٹ پوری طرح کام کر رہی تھی۔ سارے قابل سیاستدان موجود تھے۔ سارے ملک کے لئے پالیسی یہاں تیار ہوتی تھی۔ یہاں پر فیصلے ہوتے تھے۔ یہاں سے احکام جاری ہوتے تھے۔ کیا ان لوگوں کا اس المیہ میں کوئی حصہ نہیں، کیا یہاں کے سب لوگ بری الذمہ ہیں؟ کیا یہاں پر کوئی ایسا منصوبہ نہیں تھا جس سے وہ مغربی محاذ پر دباؤ ڈال کر بھرپور کارروائی کر کے مشرقی پاکستان کو بچا سکتے تھیں مشرقی پاکستان صرف ایک بازو تھا۔ باقی ماندہ جسم بمع سر یہاں تھا اور چینی مقولے کے مطابق ”Fish Rots from Head“ مشرقی محاذ کے ساتھ ساتھ اگر مغربی محاذ کی وضاحت کی جاتی رہے تو بہتر طور پر حقائق سامنے آئیں گے۔ آخر میں یہ بھی بتا دیں کہ تمام بنگالی چلے گئے آپ بھی جانے والے تھے پھر رک کیوں گئے؟

”یا ممکن باپیل باناں دوستی
یا بنا کن خانہ در خورد پیل“

منتظر جواب

امیر عبداللہ خان نیازی
سابقہ جنرل آفیسر کمانڈنگ ایسٹرن کمانڈ
1- شامی روڈ لاہور چھاؤنی۔ فون: 370637

انتخاب

صدیوں پار

اسے یوں لگا جیسے بیت المکرّم کی چھت پر مینار کی جگہ موہن داس کھڑا ہے۔ وہی موہن داس جو پلٹن میدان میں کھڑا ہو کر اتنے زور سے ”جے بنگلہ“ کے نعرے لگا رہا تھا کہ عصر کی اذان کی آواز ڈوب گئی تھی

مسعود مفتی کے حساس قلم سے لہو رُلاتی تحریر

☆ مسعود مفتی — انتخاب: دستگیر شہزاد

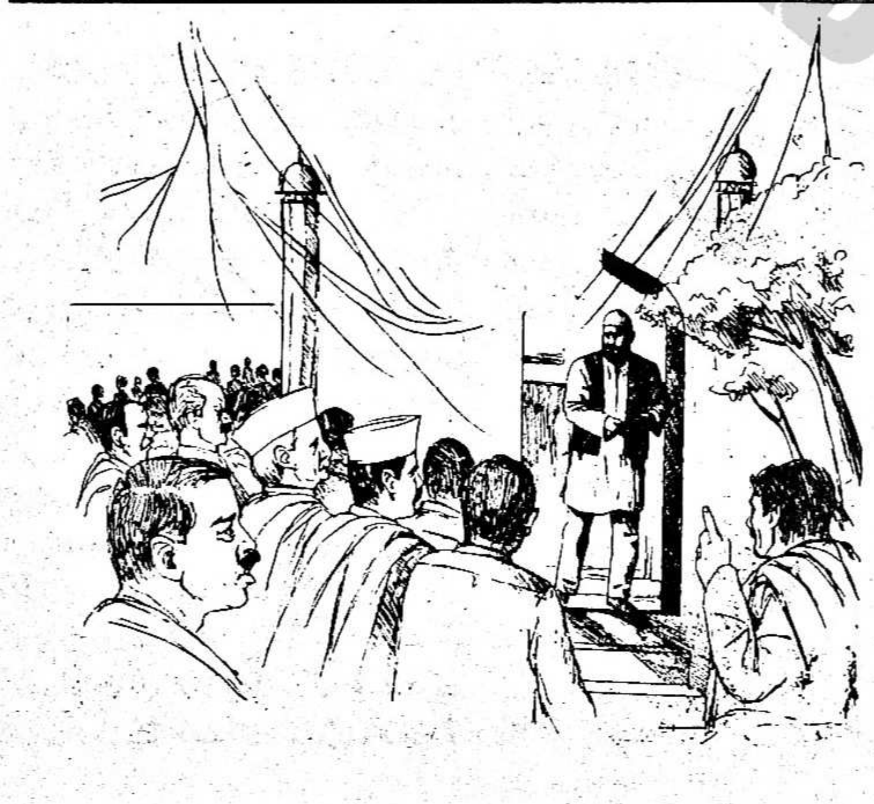

آنکھ ایک ہی ہوتی ہے مگر کبھی مسکراہٹ سے دمک اٹھتی ہے اور کبھی کرب سے بجھ جاتی ہے......
دونوں کتنی متضاد کیفیتیں مگر پھر بھی کتنی قریب کہ ایک ہی عضو کی گود میں ساتھ ساتھ پڑی رہتی ہیں۔

وہ شاعر نہیں تھا کہ اسے یہ خیال سوجھا تھا بلکہ سیدھا سادہ ایکسپورٹ امپورٹ کا تاجر تھا جس نے اپنی زندگی کے انتالیس برسوں میں اتنی دھوپ چھاؤں دیکھی تھی کہ اسے آنکھ کی دونوں کیفیتوں سے اکثر پالا پڑ چکا تھا۔ اس لئے جب اس نے ڈھاکہ میں اپنے دفتر کی کھڑکی میں سے اردگرد نگاہ دوڑائی تو جناح ایونیو، سٹیڈیم اور بیت المکرّم کا علاقہ دیکھ کر اسے پھر آنکھ والا خیال آ گیا۔ جو پہلے بھی کئی دفعہ اس کے ذہن میں کبھی کبھی سر اٹھاتا تھا...... نہ معلوم اس نے یہ خیال کہاں پڑھا تھا مگر برسوں سے یہ دماغ میں کسی چمگادڑ کی طرح گھسا بیٹھا تھا۔ جو کبھی کبھی تاریکی میں نکل کر ایک دو بے چین سی اڑانیں لگاتا اور پھر کسی کونے کھدرے میں چھپ جاتا...... اور وہ بعض اوقات سوچنے لگتا کہ ایسی آنکھ کا بالآخر کیا بنتا ہے جس میں کرب اور مسکراہٹ ہر وقت گتھم گتھا ہوتے رہتے ہوں۔

ابھی ابھی یہ سوچ اس طرح ابھری کہ وہ دفتر میں کام کرتے کرتے تھک گیا تو کھڑکی میں سے منہ نکال کر تازہ ہوا سے سرور لینے لگا۔ اس کا دفتر جناح ایونیو کے کونے والی بلڈنگ میں اوپر والی منزل پر تھا۔ جس کی کھڑکی سے سٹیڈیم، پلٹن میدان اور بیت المکرّم اس طرح ساتھ ساتھ نظر آتے تھے جیسے سکھیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سکول جاتی ہیں۔ جناح ایونیو پر کاروں، رکشاؤں اور پیدل چلنے والوں کا ہجوم کسی برادری کی شادی کی طرح پُررونق تھا اور سٹیڈیم کے گرد گھومنے والی گول مارکیٹ بھی جوبن پر تھی۔ کسل مٹانے کو ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ دیکھا تو بیت المکرّم کی شاندار مسجد بھی اپنے عظیم الجثہ بھاری ڈیزائن میں پھیلتی اٹھتی نظر آئی۔ چند سو گز ہی تو دور تھی یہ مسجد جس کی عالی شان سیڑھیوں پر لوگ اتر چڑھ رہے تھے اور فقیروں کے غول سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں بعض اوقات ان کی آواز بھی اس کے کان تک آ جاتی تھی۔ مسجد کے نیچے والی مارکیٹ جو کسی شرمیلی کے حال کی طرح اندر ہی اندر پھیلتی چلی گئی تھی، گاہکوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ بے فکرے نوجوان، نمکین رنگ کی دبلی عورتیں جو جلد کی مرطوب سی سیاہی کے باوجود گوری حسینوں سے زیادہ جاذب تھیں۔ چیزوں کی طلب میں ڈوبے ہوئے بچے اور برسات کی مکھیوں کی طرح چمٹنے والے فقیر...... ایسا لگتا تھا کہ مسجد کے زیر سایہ زندگی نہایت امن اور چین سے رواں دواں ہے...... جیسے مسکراتی ہوئی آنکھ۔

انگڑائی میں ہی جمائی لیتے ہوئے اس نے سامنے منہ موڑا تو پلٹن میدان نظر پڑا جس میں کسی جلسے کی تیاریاں تھیں۔ یہ میدان بھی بالکل قریب تھا اور اسے جلسہ سننے کے لئے کبھی دفتر سے اٹھنا نہیں پڑا۔ بلکہ اندر ہی سے گردن لمبی کر کے سب کچھ دیکھ سن لیتا۔ کاروباری لوگ اپنے وقت کا بڑا خیال رکھتے ہیں اس لئے وہ اکثر خوش ہوتا کہ بیت المکرّم اور پلٹن میدان بالکل قریب قریب ہیں۔ جیسے ہی بیت المکرّم میں جماعت کھڑی ہوتی۔ وہ لپا جھپ جا کر نماز پڑھتا اور اسی طرح وقت ضائع کئے بغیر پلٹن میدان کا جلسہ سن لیتا۔ جگہیں قریب ہوں تو مزے رہتے ہیں۔ اسی قربت کی وجہ سے اسے آنکھ والا خیال آیا تھا۔ کیونکہ پلٹن میدان بالکل دوسری (کرب والی) کیفیت پیش کر رہا تھا جس سے وہ چند روز قبل دوچار ہوا تھا۔

وہ یوں ہوا کہ ایک دن جب بیت المکرّم کے لاؤڈ سپیکر پر عصر کی اذان گونج رہی تھی تو پلٹن میدان

کے جلسے سے ”جے بنگلہ“ کا نعرہ اس زور سے گونجا کہ اذان کی آواز اس میں ڈوب گئی۔ لکھتے لکھتے اس کا ہاتھ جھٹکے سے رک گیا۔ اس نے چونک کر باہر جھانکا۔ گردن لمبی کر کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بیت المکرّم اور پلٹن میدان بالکل قریب قریب تھے۔ ایک میں اذان ہو رہی تھی اور دوسرے میں ”جے بنگلہ“ کے نعرے لگ رہے تھے۔ یہ کوئی اچنبھے والی بات نہ تھی۔ نعرے لگتے ہی رہتے تھے مگر جب اس نے دیکھا کہ جلسہ گاہ میں موہن داس اور اس کے دونوں لڑکے بھی اتنے زور سے ”جے بنگلہ“ کا نعرہ لگا رہے تھے کہ اذان کی آواز دب رہی تھی تو اسے یوں لگا سکھیوں کے ہاتھ ایک دوسرے سے چھوٹ گئے ہیں اور بیت المکرّم اور پلٹن میدان ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں، بہت دور، حالانکہ علاقہ ایک ہی تھا۔ ایک ہی آنکھ کی طرح۔

جب وہ دفتر میں واپس جا کر کرسی پر بیٹھا تو اس کے دماغ سے سب کام محو ہو چکا تھا کیونکہ اس گونجدار نعرے سے اس کے ذہن پر لپٹی ہوئی چوبیس سال کی گرد ایک دم بھک سے اڑ گئی اور بجلی کے کوندے کی طرح وہ منظر لپک سا گیا۔ جب کئی ہندوؤں نے 1947ء میں ”جے ہند“ کا نعرہ لگاتے ہوئے ان پر حملہ کیا تھا۔ کرسی پر بیٹھا تو ”جے ہند“ کے نعرے کی بازگشت دفتر کے ہر گوشے سے نکل کر اس پر جھپٹی۔ آنکھوں کے سامنے خون رنگ ترمرے ناچنے لگے۔ سارے جسم کے پٹھوں میں پچکاریاں سی چل گئیں اور وہ سارے مناظر ابھر آئے جنہوں نے اسے راتوں کو جگایا تھا اور خوابوں میں ڈرایا تھا۔

*

وہ 1947ء میں پندرہ برس کا لڑکا تھا۔ جو بہار کے چھوٹے سے قصبے میں اپنے والدین اور خاندان سمیت رہ رہا تھا۔ آٹھ دس مکانوں کی کٹڑی تھی جس میں چچا ماموں قسم کے سبھی لوگ سمائے ہوئے تھے۔ مل ملا کر پینتیس کے قریب نفوس تھے پرانی اینٹیں، پرانے درخت اور پرانی گلیاں بتاتی تھیں کہ یہ کنبے برسوں سے یہیں ہیں۔ بڑے دادا اپنے بچپن کے قصے سناتے ہوئے اس بانسوں کے جھنڈ کا ذکر کیا کرتے جس کے اندر جا کر بچے اب بھی کھیلتے تھے۔ وہ یہ بھی بتاتے تھے کہ ساتھ والا تالاب کب بنا اور اس کی بجائے ایک تالاب فلاں جگہ ہوتا تھا۔ جہاں آج کل چھوٹی بٹیا کا گھر بنا ہے۔ کیلوں کے درختوں نے کون کون سی جگہ بدلی ہیں اور موجودہ درختوں میں سے کون کون سا ان کی بھی ہوش سے پہلے کا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتے تھے کہ پہلے اس ساری گلی کے مکانات مسلمانوں کی ملکیت تھے۔ مگر کس طرح لالہ گردھاری لال اور اس کے بھائیوں نے آہستہ آہستہ سب خرید لئے۔ پھر انہوں نے اصول بنا لیا کہ جب بھی کوئی مکان خالی ہوتا تو مسلمان کرایہ دار کبھی نہ بساتے۔ ہوتے ہوتے یہ حال ہو گیا کہ ان کے کنبے کے علاوہ وہ ساری گلی ہندوؤں سے آباد ہو گئی جو ان کے مکانات خریدنے کے بھی کافی مشتاق تھے مگر انہوں نے ایک نہ مانی۔

جب بستی کے ہمسائے آتے تو وہ بھی پرانے وقتوں کا ذکر اس طرح کرتے جس سے اندازہ ہوتا کہ اس بستی کے بسنے والے جنم جنم کے ساتھی ہیں اور نیلی یکساں فضا میں اڑنے والے پنچھی کے غول کی طرح اکٹھے ہی دکھ سکھ سہتے ہیں۔ ان کے گھر آنے والوں میں بابو پرشوتم داس بھی تھے اور تایا رمنا مل بھی تھے اور مہاجن بجیا ناتھ بھی تھے جو اسے کھانے کی چیزیں بھی دیتے تھے اور ان کی شادی غمی میں بھی شریک ہوتے تھے۔

مگر پھر ایک دم جیسے بھونچال آ گیا......
1947ء میں سب رشتے اتھل پتھل ہو گئے...... ان

لوگوں نے یا تو آنا جانا ہی چھوڑ دیا اور اگر آتے بھی تو دبی دبی گھٹی گھٹی باتیں کرتے۔ نہ گرمجوشی نہ اپنائیت، پھر جب ایک شام ''جے ہند'' کے بنعرے لگاتا ہوا ایک گروہ ان کی کنڑی پر حملہ آور ہوا تو اس گروہ میں اسے تایا رمنامل اور بابو پرشوتم داس بھی نظر آئے۔ مگر آج ان کے چہروں پر غیض و غضب تھا۔ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ ان کی آستینیں خون آلود تھیں اور ہاتھوں میں رام داؤ، بلم اور بندوقیں تھیں۔

اور پھر بابو پرشوتم داس نے بڑے دادا کو اسی چبوترے پر دو ٹکڑے کر دیا جہاں ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیا کرتا تھا۔ اس سے آگے کی تفصیلات اسے یاد نہیں کیونکہ سارا ہجوم کنڑی کے اندر ''جے ہند'' کے نعرے لگاتا گھس گیا تھا اور چیخ و پکار میں اسے کہیں خون نظر آیا۔ کہیں چھوٹی بہن کی لال چوڑیوں والی بانہہ ہوا میں اڑتی نظر آئی اور کہیں باپ کا سر فٹ بال کی طرح لڑھکتا نظر آیا۔

اتنا البتہ یاد تھا کہ جس مدن کے ساتھ وہ خود فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔ اس نے رام داؤ سے اس پر حملہ کیا اور جب وہ کشتی لڑ رہے تھے تو پیچھے سے کسی زوردار ضرب سے اس کا سر تیورا گیا۔

اسے ہوش آیا تو رات پڑ چکی تھی۔ ہلکی پھیکی چاندنی میں اسے کنڑی کے بعض حصے ملبے کا ڈھیر نظر آئے۔ جہاں اب آگ کا زور ختم ہو گیا تھا اور چھوٹی موٹی چیزیں سلگ رہی تھیں۔ اسی راکھ میں دو ادھ سڑی لاشیں بھی نظر آئیں جس جگہ وہ پڑا تھا، اس کی پشت پر کسی حصے میں آگ ابھی روشن تھی۔ اسی کی روشنی میں وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان ادھ جلی لاشوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ اتنے میں کسی کے سسکنے کی آواز آئی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

اتنے برس گزر جانے کے باوجود وہ اس نظارے کو نہیں بھولا جو اس نے اٹھ کر دیکھا۔ شعلوں کی ہلکی روشنی، جس میں بعض سائے اور بھی بھیانک ہو گئے تھے۔ دروازے اور کھڑکیاں ٹوٹی ہوئیں، سامان بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر روندا ہوا۔ لاشیں دائیں بائیں بکھری ہوئیں۔ کوئی جسم دالان میں چت پڑا ہوا، کوئی گچھا مچھا ہو کر نالی کے اوپر گرا ہوا، کوئی لاش دہلیز کے آر پار گری ہوئی، کوئی کھڑکی میں سے آدھی لٹکی ہوئی، ایک جگہ گرد اور خون میں لتھڑا ہوا سر لڑھک کر ایک برتن میں اٹکا ہوا، ایک سڈول سا بازو، جوتے سمیت ایک پنڈلی۔

وہ اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔

یہ امی ہے۔ اس نے ماں کے ماتھے پر ہاتھ لگایا تو سر ایک طرف کو لڑھک گیا اور ادھر کھلی آنکھیں آسمان کو تکنے لگیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ چنگھاڑ کر روئے مگر نہ معلوم اس کے آنسو کہاں چلے گئے تھے اور گلے میں خشک خشک گولے پھنس رہے تھے۔

یہ دادا بھائی ہیں......

ابا......

بے بی......

تایا......

ماموں......

وہ نیم پاگل ہو کر کبھی شعلوں کو دیکھتا۔ کبھی آسمان کو کبھی دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ لیتا۔ مگر ''جے ہند'' کے نعرے اس کے دل و دماغ میں گونجنے لگتے اور وہ چاروں طرف وحشت ناک چہروں کے ہیولے دیکھ کر گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا۔

اتنے میں اس کا بڑا بھائی نمودار ہوا جو حملے کے وقت کہیں چھپ گیا تھا اور اب پھر آ گیا تھا۔ وہ دوڑ کر اس کے گلے لگ گیا اور پھر دونوں پھپک پھپک کر رو دیئے۔ ذرا سنبھلے تو دونوں نے مل کر سارا جائزہ لیا۔

بعض عزیز بے ہوش تھے۔ مرے نہیں تھے، ان میں سے کچھ کو خود ہوش آ گیا اور بعض کو پانی وغیرہ پلا کر ہوش دلایا۔

آدھی رات ہوئی تو دس آدمیوں کا قافلہ پاکستان کی طرف چل دیا۔ گم صم، خاموش، جسم بریدہ اور ذہن دریدہ، سسکتے ہوئے، سہمے ہوئے، ہوا اور پتوں کی سرسراہٹ سے بھی بدکتے ہوئے۔ تھوڑی امید اور زیادہ مایوسی کے درمیان لٹکتے ہوئے۔ مشرقی پاکستان کی سرحد یہاں سے دس میل دور تھی۔ سرحدی گاؤں کا بھی انہیں پتہ تھا۔ جہاں وہ اکثر جایا کرتے تھے۔ پاکستان بنے چند روز ہوئے تھے مگر وہ پھر بھی ان کے لئے دارالامان تھا۔ کلمہ طیبہ پڑھنے والوں کو پناہ گاہ تھا اور ہندوستان کے مسلمانوں کی آخری امید ہے۔

چلتے چلتے سب نے حساب لگا لیا تھا کہ خاندان کے چھبیس افراد مارے گئے تھے مگر کسی میں باآواز بلند دوسروں کو بتانے کا حوصلہ نہ تھا۔

کوئی تیز تھے، کوئی سُست۔ کہیں گرے، اٹھے، پھر گرے پھر اٹھے، رک گئے، چل پڑے، پھر رک گئے، قدم بہ قدم، آہستہ آہستہ چیونٹی کی چال، وہ بڑھتے گئے اور کئی جگہ اس کے کانوں میں ''جے ہند'' کے نعرے کی بازگشت آتی رہی۔ اتنے میں دور بہت دور ہلکی ہلکی آواز ابھری۔

''اللہ اکبر......اللہ اکبر''۔

وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

''بھیا! ہم پہنچنے والے ہیں، سرحدی گاؤں کی مسجد میں صبح کی اذان ہو رہی ہے''۔ اور سب کے چہرے اندھیرے میں بھی دمکنے لگے۔

پھر قرب و جوار اندھیرے کے غلاف سے دھیرے دھیرے نکلنے لگے۔ پہلے انہوں نے ایک دوسرے کے سوگوار چہروں کو دیکھا پھر اردگرد کے شبنم آلود پتوں کی اداس خاموشی کو، اجنبی فضا کو سونگھا جو رات ہی رات میں بادِ سموم سے بھر گئی تھی اور تھوڑی دیر بعد جب افق کا دھندلکا چھٹا تو دور مسجد کا مینار آسمان کی سرخی کے بیچوں بیچ کھڑا ان کو روشنی کے مینار کی طرح راہ دکھا رہا تھا۔ وہ ان کی منزل تھی اور انہیں بہرحال وہاں پہنچنا تھا۔

پھوپھی ذرا ادھیڑ عمر تھی، اس کا بازو بھی زخمی تھا اور اپنے دو لڑکے بھی اپنے سامنے کٹوا کر آئی تھی۔ جسمانی طور پر نزار اور ذہنی طور پر مفلوج وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دل چھوڑ دیتی۔ زمین پر گر کر بچوں کے نام پکارنے لگتی اور باقی لوگوں سے کہتی کہ وہ اسے چھوڑ کر چلے جائیں۔

یہ اسے تسلی دیتا۔ ''بس پھوپو! وہ سامنے مسجد کا مینار نظر آ رہا ہے، اب تو بہت قریب ہے۔ وہ دیکھو اب تو اس کے جھرنے اور نقش بھی نظر آنے لگے ہیں...... بس ذرا ہمت کر لو، تھوڑی سی ہمت''۔ اور وہ پھر گرتی پڑتی چلنے لگتی۔ تھوڑی دیر بعد کوئی دوسرا ہمت ہار جاتا تو یہ پھر مسجد کے مینار کی طرف توجہ دلاتا اور قافلہ لنگڑاتا ہوا روانہ ہو جاتا۔

ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر بسنے والے گاؤں کی مسجد کا یہ مینار ان کے لئے مقناطیس کا کام کر رہا تھا۔ اس میں امن اور آشتی کی گارنٹی تھی۔ اس کی نوک خدائی رحمت کی چوب تھی، اس کے سائے میں ایمان تھا، زندگی تھی، بقا تھی، وہ سب کچھ تھا جس کی ان کو تمنا تھی۔

اور جب وہ سب گرتے پڑتے اس مینار کے پاس پہنچے تو اس نے جھک کر پاکستان کی زمین کو چوما اور سب لوگ تھکاوٹ سے چُور ہو کر مسجد کی دیواروں سے لگ کر ایسے ڈھیر ہوئے جیسے بیمار بچہ ماں کی گود میں دبک جاتا ہے۔ مسجد کو دیکھ کر اسے گہری اور بھرپور

اپنائیت کا احساس ہوا۔

تیس برس پر لگا کر اڑ گئے۔

یہ لوگ میمن سنگھ میں آباد ہوئے۔ آہستہ آہستہ ان کے باقی عزیز بھی ہندوستان کے مختلف حصوں سے آ گئے۔ نئی جگہ اصلی وطن بن گئی۔ اس کی مٹی انہیں کھینچنے لگی، اس کی گلیاں ان کے اعصاب پر چھا گئیں۔ اس کے پنچھی پکھیرو ان کے گھروں کی منڈیروں پر بیٹھ کر ان کے احساسات سے باتیں کرنے لگے۔ اس کے درختوں تلے کھیل کھیل کر ان کے بچے جوان ہوئے۔ اس کی برساتوں میں ان کے من کے جھروکوں میں رنگ برنگے آنچل لہرائے۔ پھر اس کی گلیوں میں سہروں والے گھبرو جیالے ڈولیاں لائے۔ کنبے بنے، بن کر پھیلے اور ایک دفعہ پھر چالیس پچاس رشتے دار ایک دوسرے کے قریب قریب شانتی پاڑا میں آباد ہو گئے جو میمن سنگھ کی نئی بستی تھی۔

اس کا اپنا کاروبار شروع میں ڈھاکہ میں چل گیا تھا۔ پہلے دکان تھی، بعد میں کاروبار پھیلنے لگا تو اس نے امپورٹ ایکسپورٹ کی فرم بنا ڈالی جس کا دفتر جناح ایونیو میں تھا۔ مگر بیوی بچے اور باقی عزیز شانتی پاڑا میں ہی تھے۔ پھوپھی کے پاس یہ خود بھی اکثر جایا کرتا تھا۔

مگر ان تیس برسوں میں اور بھی بہت کچھ ہوا۔ گرتے پڑتے خانماں برباد زخمی قافلے نے جو مینار اداس جھٹ پٹے میں اپنی آنسو بھری آنکھوں سے امید امن اور آشتی کا مظہر بنے دیکھا تھا۔ وہ اس کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ اسے مسجد کے مینار سے ایک نفسیاتی سا لگاؤ ہو گیا تھا۔ وہ کسی بھی سفر پر جاتا، گاڑی یا موٹر میں جاتے ہوئے اگر اسے افق میں کوئی مینار جھانکتا نظر آ جاتا تو وہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتا اور اسے اپنی ذات اور اپنے گرد و پیش کے متعلق اطمینان سا ہونے لگتا۔ مینار جو پہلے اس کی من کی روشنی تھا، آہستہ آہستہ اس کے ذہن کی کمزوری بنتا گیا۔ 1947ء کے حادثے کے بعد وہ مذہبی تو ویسے ہی بہت بن گیا تھا مگر ہر مشہور مسجد کی زیارت کرنے کا تو ایسے جنون سا ہو گیا تھا۔

چنانچہ جب کاروبار کے سلسلہ میں اسے باہر کے ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوتا تو اپنے سو پروگرام چھوڑ کر بھی وہ وہاں کی مسجد میں نماز پڑھنے جاتا اور وہاں نماز سے زیادہ تسکین اسے نیلے آسمان میں کھبے ہوئے بلند و بالا مینار کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ کئی سفر تو اس نے محض اس وجہ سے لمبے کر دیئے تھے کہ تھوڑا چکر لگانے سے وہ دو ایک نئی مسجدیں اور ان کے مینار دیکھ سکتا تھا۔ اسی شوق میں اس نے ایسی ایسی جگہ دیکھ لی تھی جہاں عام زائرین نہیں جایا کرتے تھے۔

مکہ مکرمہ میں بیت اللہ سے متصل حضرت ارقم کا مکان گو مسجد نہ تھا مگر چونکہ شروع شروع میں حلقہ بگوش اسلام صحابہ کرام یہیں چھپ کر نماز ادا کیا کرتے تھے اس لئے وہ اسے مسجد ہی کہتا تھا اور چونکہ حضرت عمرؓ نے اس مختصر سے گھر میں اسلام قبول کیا اور پھر اعلانیہ تبلیغ پر اتر آئے۔ اس لئے وہ اسے ان کی اذان کہتا تھا، وہ دو تین دفعہ یہ گھر دیکھنے گیا۔

پھر وہ مدینہ منورہ سے چار میل دور مسجد قبا بھی دیکھنے گیا جو اسلام کی اوّلین مسجد ہے۔ اس کے ساتھی نے بتایا کہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کے بعد رسول اکرم اور ان کے ساتھی مدینہ کی طرف آ رہے تھے تو ایک منزل پہلے قبا کی بستی میں مہمان ٹھہرے اور اس چند روز کے قیام میں انہوں نے یہ مسجد بنا ڈالی۔ یہ سن کر وہ کئی گھنٹے کھڑا ہو کر اس کے مینار کو دیکھتا رہا جہاں سے پہلے پہل اذان بلند ہوئی ہو گی اور چہار طرف پھیلی ہو گی۔ اس کے کان میں وہ اذان گونجنے لگی۔ جو 1947ء کی تاریک رات میں ان کے خانماں برباد قافلے نے سنی تھی۔

مدینہ منورہ میں اس نے مسجد قبلتین دیکھی۔

جس میں دوسری صدی ہجری میں عین نماز میں حکم ہوا تھا کہ آئندہ سے قبلہ اوّل مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی بجائے خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں۔ اس مسجد کے مینار کا نچلا دھڑ چوکور تھا۔ اوپر گنبد لمبوترا اور بیضوی تھا اور اس پر لمبی نوک آسمان کے سینے میں کھبتی جاتی تھی۔ اس مینار کی پُرشکوہ بلندی کو وہ نہ صرف قریب سے دیکھتا رہا بلکہ واپس جاتے ہوئے رک رک کر پلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔

اسی طرح وہ مسجد اقصیٰ کے میناروں پر فریفتہ ہوتا رہا۔ مکہ معظمہ کے میناروں پر سر دھنتا رہا۔ وادیٔ منا میں مسجد خیف کے میناروں میں کھویا رہا۔ غرض اسے جہاں مینار نظر آیا وہ اسے اسلام کی پختگی کا مظہر سمجھ کر اس کے نظارے میں جذب ہو جاتا اور اس کے دل میں عجب سے ولولے اٹھنے لگتے۔

مگر ایک مینار ایسا تھا جسے دیکھ کر وہ بجھ گیا تھا اور اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ وہ بھی مسجد کا ہی مینار تھا، وہ بھی فضا میں ابھر کر آسمان کو چومتا تھا۔ اس نے بھی اسلام کی عظمت کو سر بلند ہو کر دیکھا تھا مگر یہ مینار اس کے اندرونی غرور کو لوریاں نہ دے سکا۔ اسے ولولہ نہ دے سکا۔ اس کے اندر سرور کی لہریں نہ دوڑا سکا بلکہ اس مینار نے اس پر لرزہ طاری کر دیا۔ دکھ دیا، ہیبت اور خوف سے لاد دیا۔ جسم میں رعشہ برپا کر دیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری کر دیا۔

یہ مینار قرطبہ کی مسجد کا مینار تھا۔ جو سپین کی اجنبی وادی میں اسلام کی قبر پر کتبہ بن کر کھڑا تھا۔

یہ مینار دیکھتے ہوئے وہ یہ معمہ نہ حل کر سکا کہ سات سو سال تک سپین پر مسلمانوں کی حکومت کے بعد یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہاں سے مسلمانوں کا نام و نشان بھی مٹ جائے...... اور پھر خیالات کا دھارا اس کے

RTM: 71114
N.B.S
FANS
سب اچھا لگا مگر
بات ان سے بنی
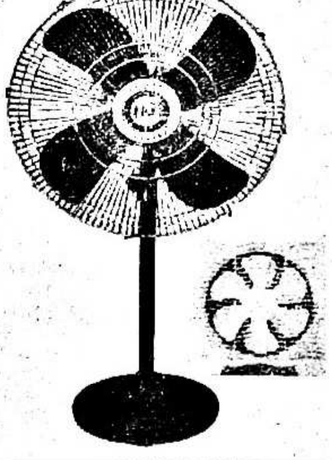
U.I INDUSTRY
184-C, Small Industries State
Gujrat PAKISTAN.
PH:+92 53 3535901-2, 3523494-5
Fax: 053-3513307
E-mail: nbsfans@gmail.com

ذہن میں بہنے لگا..... غیر مربوط اور بے جوڑ خیالات۔

اسی مسجد میں کھڑے ہو کر علامہ اقبالؒ کے جنون نے خدا کی خدائی سے گلہ کیا تھا اور ماضی کی خاموش اذانوں کی سرسراہٹ سنی تھی اور دعا مانگی تھی۔ پھر نسیم حجازی کے تاریخی ناول ''شاہین'' کے صفحات کے صفحات اس کے دماغ میں پھڑ پھڑانے لگے۔ کس طرح ہسپانیہ کی اسلامی سلطنت میں چند غدار مسلمانوں نے غیروں سے مل کر سازشیں کیں۔ بھائی نے بھائی کو مارا، ملک کو کھوکھلا کیا اور بالآخر مسلمانوں کو تاریخ عالم کے سب سے بڑے قتل کا شکار ہونا پڑا.....

.....قتل عام سے اس کے ذہن میں وہ سارے قصے ابھرنے لگے۔ جو سکول کے زمانے میں اس نے سنے تھے۔ معلوم نہیں درست تھے یا نہیں مگر ان کا ماسٹر تو بڑے یقین سے بتایا کرتا تھا کہ فرسٹ اپریل فول سپین میں مسلمانوں کے قتل عام کی یاد کے طور پر منایا جاتا ہے۔ جب غیر مسلم سپین میں مسلمان بچوں اور عورتوں کو چکمے دے کر قتل کرتے تھے اور پھر ان کے معصوم خون پر سب مل کر قہقہے لگایا کرتے تھے۔

یہ خیال آتے ہی اس کا ذہن 1947ء میں جا اٹکا اور وہ رات ہمک کر آگے آ گئی۔ جو اسے اکثر تڑپاتی رہی تھی، اسے یوں لگا جیسے مسجد قرطبہ کا صحن اس پرانے گھر کا صحن ہے جہاں ادھ موئی آگ اور پھیکی چاندنی میں وہ اپنے گھر والوں کی لاشیں دیکھ رہا ہے۔

یہ امی ہے، اس نے ماتھے پر ہاتھ لگایا تو سر ایک طرف لڑھک گیا۔

یہ دادا بھائی ہیں، ابا، بے بی، تایا، ماموں، چھبیس لاشیں..... چھبیس اپنوں کی لاشیں۔ ایسے ہی خیالات کا تانا بانا اس کے ذہن میں بنتا رہا، آنسو اس کے گالوں پر بہتے رہے اور ان آنسوؤں کی لہروں میں مسجد قرطبہ کا مینار لہراتا رہا۔

اتنے میں ظہر کی اذان ابھری، مسجد قرطبہ کے مؤذن کی آواز، اس کی آنکھیں غیر ارادی طور پر باہر آبادی کی طرف اٹھیں اور اس کا دل بیٹھنے لگا۔ کیونکہ اذان کی آواز سے باہر کی زندگی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ نہ کوئی جوتا گھسیٹتا ہوا مسجد کی طرف لپکا تھا، نہ کسی نے دکان کے تھڑے پر چادر بچھا کر نماز شروع کی تھی، نہ کسی راہگیر کے ہونٹ ہلے یا ہاتھ دعا کے لئے اٹھے۔ وہاں اذان تو تھی مگر وہ مسجد کے اندر ہی تھی، باہر ان اثرات میں سے کوئی بھی نہ تھا جو پاکستان میں نظر آتے ہیں اور اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔

اس رات وہ سونے سے پہلے کتنی ہی دیر تک روتا رہا تھا اور ہسپانیہ کی سرزمین پر خالص پاکستانی خلوص کے آنسو گراتا رہا تھا۔

دن گزرتے گئے، وہ دنیا گھومتا رہا، مسجدیں دیکھتا رہا، ان کے مینار دیکھتا رہا جو اس کے لئے نفسیاتی اثر رکھتے تھے، اس کے لئے جذباتی آسودگی مہیا کرتے تھے۔ مینار جو ایک تواریخی کنجی کی طرح ماضی کے تالے کھول کر صدیوں پار کے مناظر کھول دیتے تھے۔ انہی میناروں سے اس نے تیرہ صدیوں پہلے کے مہاجروں کے دل میں ایمان اور امید کی جھلک دیکھی تھی۔ انہی میناروں کے کنگوروں سے لٹک لٹک کر اس نے صدیوں پہلے مسلمانوں کی عظمت کا تماشہ کیا۔ یہی مینار اسے صدیوں پھیلی ہوئی روحانی برداری کا فرد ثابت کرتے تھے اور وقت کے چوڑے چکلے سمندر پر صدیوں کی تند تیز لہروں میں اسے اپنی بقا کا تسلسل نظر آتا تھا۔

اس لئے جب اسے پتہ چلا کہ اس کے دفتر کے سامنے بیت المکرم کی تعمیر شروع ہو گئی ہے تو وہ ان دنوں بہت مطمئن تھا، بہت ہی مطمئن جیسے بچے کے لئے اس کا پنگوڑا بن رہا ہو یا ماں کی آغوش وا ہو رہی ہو۔ اس نے بڑھ چڑھ کر چندہ دیا اور گھنٹوں دفتر کی

کھڑکی میں کھڑا ہو کر اس کی عالی شان عمارت کو وجود میں آتے دیکھتا رہتا۔

بیت المکرم کا منصوبہ بڑا وسیع تھا۔ پہلے نیچے مارکیٹ بنی پھر اوپر اور ساتھ مسجد والا حصہ بننے لگا۔ کچھ کام مکمل ہو گیا تو نماز کے لئے انتظام کر دیا گیا۔ جب وہ پہلی دفعہ نماز پڑھنے وہاں گیا تو ہر چیز دیکھ کر اس کا دل اچھلنے لگا تھا۔ وسیع و عریض سیڑھیاں چڑھ کر جب اوپر جانے لگا تو یوں لگا جیسے کسی عزیز کے محل میں داخل ہو رہا ہو کہ مرعوب ہونے کے ساتھ ساتھ اپنائیت اور فخر بھی رگ و پے میں موجزن ہیں۔ وضو کرنے والی جگہ اتنی کشادہ، ماڈرن اور صاف ستھری، جوتے رکھنے کا اتنا اچھا انتظام، مسجد کا صحن اتنا کشادہ اور وسیع کہ خدا کی بڑائی دل میں بیٹھنے لگے۔ پھر ایک ہی امام کے پیچھے تین منزلوں میں نمازی بغیر کسی مکبر کے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اتنی وسعت اور کشادگی، درمیان میں کھڑے ہو کر اس نے نگاہ اٹھائی تو تین منزل اوپر گول دیوار پر کلمہ لکھا ہوا نظر آیا اور پوری بلڈنگ کی کشادگی، وسعت اور خوبصورتی اس کے دل و دماغ پر عظمت کا پیکر بن کر چھا گئی اور اس کی آنکھیں بے اختیار بھر آئیں۔

پھر جب نامکمل تیسری منزل سے اس نے باہر جھانکا تو ڈھاکہ کے مکان ایسے ڈبوں کی مانند لگے جنہیں سادگی اور خلوص میں رنگے ہوئے بچوں نے کھیل کھیل میں سجا کے رکھ دیا ہے اور اب بیت المکرم میں چھپ گئے ہیں جو اس سادگی اور خلوص کا مظہر بن گیا تھا۔

اس کے بعد وہ ہمیشہ بیت المکرم میں نماز پڑھنے لگا اور وہاں کی پُرسکون فضا اس کی شخصیت کا حصہ سی بن گئی۔ باوجود اس کے کہ بیت المکرم سے باہر زمانہ قیامت کی چال چلنے لگا تھا اور مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات سمندر کی مہیب لہروں کی طرح پیچ و تاب

غصہ

ایک شخص کو غصہ بہت آتا تھا۔ اس کو ایک عالم نے مشورہ دیا کہ جب بھی اُسے غصہ آئے، وہ جنگل میں جا کر ایک درخت میں ایک کیل گاڑ دے۔ وہ اسی طرح کرتا رہا اور ایک دن اس کا غصہ ختم ہو گیا۔ اس نے خوشی خوشی عالم کو بتایا۔ عالم اسے درخت کے پاس لے گیا اور کہا جتنے کیل تم نے گاڑے ہیں وہ نکال لو۔ کیل نکالنے کے بعد درخت میں سوراخ باقی رہ گئے۔

عالم نے کہا۔ ''یہ وہ سوراخ ہیں جو تم اپنے غصے سے لوگوں کے دلوں میں کرتے تھے''۔

☆.....نسیم سکینہ

کھانے لگے تھے۔ اب اس کی سوچیں گہری ہونے لگی تھیں۔ بیت المکرم سے نکل کر جب وہ اپنے دفتر میں بیٹھتا تو سوچ میں ڈوب جاتا کیونکہ پلٹن میدان گو بیت المکرم کے بہت قریب تھا مگر اسے وہاں دوسرا رنگ نظر آنے لگا تھا۔ بیت المکرم میں وہ جس کے ساتھ چاہتا کھڑا ہو کر نماز پڑھ سکتا تھا۔ کبھی ایک تسبیح کے دانے لگتے تھے مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اسے پلٹن میدان کے جلسوں میں نوکیلی اور کٹیلی نظروں سے واسطہ پڑنے لگا تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہ پلٹن میدان میں ایک نئی تعمیر دیکھنے لگا، نفرت کے میناروں کی، اینٹ گارے کے نہیں بلکہ جذبات اور جوش کے اور پھر ان کی تعمیر اتنی تیز ہو گئی کہ ان کی اونچائی بیت المکرم کی چھت سے بھی اوپر نکل گئی۔

پھر 1971ء آ گیا، بجلیاں برساتا اور چنگھاڑتا ہوا۔

پلٹن میدان میں دن رات جلسے ہوتے، نعروں کا شور، گالیوں کی گھن گرج، غنڈوں کے ہنگامے اور

جب الیکشن کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن نے پلٹن میدان میں تقریریں شروع کیں تو وہ اپنی جگہ پر بیٹھے تقریر سنتا رہتا اور کانپتا رہتا۔ ''جے بنگلہ'' کا نعرہ اتنے زور سے لگتا کہ اس کے ذہن سے تیئس برس کی دھول جھکڑ بن کر اڑ جاتی اور وہ ''جے ہند'' کی بازگشت میں گم ہو جاتا۔ پھر آدھی رات جھانکتی...... چاند اور شعلوں کی پھیکی روشنی سوگوار انداز میں آنکھ کھولتی وہ گھر والوں کی لاشیں پہچانتا اور اس کے منہ سے نکل جاتا۔ ''چھبیس......چھبیس''۔

پھر مارچ 1971ء کا مہینہ آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح گزر گیا اور اس جھکڑ میں وہ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا جس کی تمنا لے کر وہ اپنے دس عزیزوں کے ہمراہ 1947ء میں گرتا پڑتا یہاں پہنچا تھا اور بعد میں جو کچھ اس امید پر بنایا گیا تھا...... ڈھاکہ میں دکانیں بند تھیں اور نفرت کا بازار گرم تھا۔ وہ اپنے گھر میں گھسا رہتا اور اپنے عزیز و اقارب کی خیریت کے لئے دعائیں مانگا کرتا۔ 1947ء کا ہنگامہ اس نے ایک لڑکے کی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر اب 1971ء میں وہ لڑکوں اور لڑکیوں کا باپ بن کر دعائیں مانگتا تھا۔

پچیس مارچ کو پاک فوج نے پہلے تو ڈھاکہ میں بغاوت کو دبایا اور پھر دارالخلافے سے چاروں طرف پھیل کر باغیوں کا صفایا کرنا شروع کیا۔ اس افراتفری میں اس کے لئے میمن سنگھ جانا ممکن نہ تھا۔ تاوقتیکہ فوج وہاں پہنچ جاتی اور بیچ کے سارے راستے صاف ہو جاتے مگر چونکہ میمن سنگھ کا علاقہ شمالی سرحد کے قریب تھا۔ اس لئے وہاں پہنچنے میں کئی دن لگے۔

اکیس اپریل کو جب فوج وہاں پہنچی تو پانی سر سے گزر چکا تھا اور شانکی پاڑا، ریلوے کالونی اور بہاری کالونی میں چار دن پہلے قتل عام ہو چکا تھا مگر وہ ڈھاکہ میں دکان کی حفاظت کرتا رہا اور اسے کچھ علم نہ تھا۔

دو ہفتے بعد وہ جمعہ پڑھنے کے لئے بیت المکرم کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ اسے میمن سنگھ کا ایک آدمی مل گیا جو اسے تلاش کر رہا تھا، اس نے اسے سیڑھیوں پر ہی روک لیا۔ پھر اس نے رک رک کر، ضبط کر کے، آنکھیں نیچی کر کے سارا قصہ سنایا۔

اس کے خاندن کے سارے افراد مارے گئے تھے۔ اس کے ذہن میں کوندا لپکا، چالیس لوگ، وہ ان دنوں ہر وقت سب کا شمار کرتا رہتا تھا اور پھر دوسرا شرارہ لپکا۔ پہلے سے کئی گنا شدید 1947ء میں چھبیس اور اب چالیس؟

پھر وہ بالکل شل ہو گیا، ایک آنسو بھی نہ ابھرا۔

اس کا ساتھی باتیں بتاتا رہا کہ اس طرح ستائیس مارچ سے لے کر اکیس اپریل تک میمن سنگھ کا علاقہ مکمل طور پر باغیوں کے ہاتھ میں رہا جس میں ہندوستانی فوج اور شہری کھلم کھلا آتے جاتے تھے۔ کئی لوگ ہندوستان کی باقاعدہ فوج کے انتظار میں گھاٹ تک کئی چکر لگاتے تھے۔ پھولوں کے ہار لے کر جب انہیں سترہ اپریل کو پتہ چلا کہ پاک فوج قریب آ گئی ہے تو بھاگنے سے پہلے انہوں نے قتلِ عام کیا۔

اس نے بتایا کہ سترہ اپریل کو سہ پہر کے وقت موسلا دھار بارش میں انہوں نے شانکی پاڑا کا محاصرہ کر لیا اور چھ گھنٹے تک لوگوں کو اطمینان سے قتل کرتے رہے۔

وہ بظاہر کچھ بھی نہ سن رہا تھا مگر ایک دم پوچھ بیٹھا۔

''مارنے والے ہندو تھے کیا؟'' کیونکہ شہر میمن سنگھ کی آبادی کا چوتھائی حصہ ہندوؤں کا تھا، کوئی بیس ہزار کے لگ بھگ۔

''ہندو بہت کم تھے، زیادہ تر تو مسلمان تھے''۔

''مسلمان!'' وہ کانپ کر بڑبڑایا اور پھر اس نے بڑے ہی دھیمے اور سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''عورتوں کو تو کچھ نہیں کہا؟''

اس کا ساتھی کافی دیر گم صم رہا، یہ اندر ہی اندر دہلتا رہا، پھر اس کے ساتھی کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں میں سے ابھری۔

''پہلے مردوں اور بچوں کو مارا پھر عورتوں سے کہا کہ ان کی قبریں کھودو، وہ کھود چکیں تو...... تو...... میمن سنگھ جیل کے دروازے کھول کر جنس کے بھوکے قیدیوں کو ان پر چھوڑ دیا گیا۔ شکاری کتوں کی طرح اور پھر بعد میں ان عورتوں کو بھی قتل......'' اور اس کی آواز بھرا گئی۔

وہ بالکل شل تھا مگر پھر اس کے ہونوں سے موہوم سی آواز نکلی۔ ''مسلمان تھے، مسلمان تھے''۔

پھر بڑی بے بسی سے سر اٹھا کر اس نے بیت المکرم کی عمارت کو دیکھا۔ 1947ء میں جب اس نے ایک مسجد کے مینار کو دیکھا تھا تو وہ ہر لحظہ قریب ہو رہا تھا مگر آج اسے یوں لگا جیسے بیت المکرم کی عمارت دور ہی دور ہوتی جا رہی ہے اور اس کا فاصلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے، بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

پھر وہ تھوڑی دیر سر نہوڑائے کھڑا رہا۔ اس کے چاروں طرف لوگ سیڑھیاں چڑھ کر جمعہ پڑھنے جا رہے تھے۔ وہ اچانک مڑا۔

''کہاں جاؤ گے''۔ اس کے ساتھی نے حیرت سے پوچھا۔

اس نے خالی خولی نظروں سے بیت المکرم کی عمارت کو دیکھا اور مایوسی سے دونوں خالی ہاتھ ہوا میں ہلا کر بولا۔

''خدا معلوم''۔

اور پھر اسی دم اس پر ایک عجیب انکشاف ہوا، آج اس نے پہلی دفعہ نوٹ کیا کہ بیت المکرم کی عظیم الشان بلڈنگ کے ڈیزائن میں مینار کوئی نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ابھی اور توسیع ہونی ہے اور مینار بھی بالآخر بن جائے گا۔ مگر پھر بھی مینار نہ ہونے سے اس کا دل بیٹھنے لگا اس لمحے اسے مینار کے سائے کی جتنی ضرورت تھی، اتنی کبھی نہ تھی۔ مینار نہ ہونے سے اس کے قدموں تلے سے زمین کھسکنے لگی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا بیت المکرم کی سیڑھیاں اترنے لگا جو اسے ایک دم سے اجنبی لگنے لگ گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔

اتنے میں بیت المکرم کے اندر سے اذان کی آواز گونجی، اذان کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں مینار کا تصور ابھرا کیونکہ اس نے دنیا بھر میں گھومتے ہوئے میناروں سے اذانیں سنی تھیں۔ تب غیر ارادی طور پر اس نے ٹھٹک کر واپس نگاہ دوڑائی۔

مینار اب بھی کوئی نہ تھا مگر اسے یوں لگا جیسے بیت المکرم کی چھت پر مینار کی جگہ موہن داس کھڑا ہے۔ وہی موہن داس جو پلٹن میدان میں کھڑا ہو کر اتنے زور سے ''جے بنگلہ'' کے نعرے لگا رہا تھا کہ عصر کی اذان کی آواز ڈوب گئی تھی اور پھر یہ موہن داس بڑھتا گیا، بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ اس کا چیختا چنگھاڑتا نعرے لگاتا چہرہ آسمان کی بلندی میں کھبنے لگا۔

اس نے گھبرا کر منہ موڑا مگر پیچھے سے ساتھی نے آواز دی۔

''جمعہ نہیں پڑھو گے؟''

وہ ٹھٹکا، رکا، مڑا مگر معاً اسے یوں لگا کہ یہ بیت المکرم کے مؤذن کی آواز نہیں بلکہ قرطبہ کے مؤذن کی آواز ہے اور یہ آج نہیں بلکہ صدیوں بعد کا کل ہے۔

ساتھی کو جواب دیئے بغیر وہ پلٹن میدان سے پہلو بچاتا تیزی سے اپنے دفتر کی طرف چل دیا۔

★□★

تاریخ کے جھروکوں سے

پچاس سال کا باپ سو سال کا بیٹا

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیز علیہ السلام کو دوبارہ زندہ کیا تو آپؑ کی عمر پچاس سال ہی تھی اور اُنؑ کا بیٹا سو سال کا ہو چکا تھا۔

☆ حکیم مختار احمد ناز
0336-5938583

انسان جب اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین سے رُوگردانی کرنے لگ جائیں زر و دولت ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بن جائے، حلال و حرام کی تمیز ختم ہو جائے۔ اللہ اور اس کے رسولوں کے بتائے ہوئے راستہ سے انحراف کرنے لگے تو یہی باتیں انسان کی پستی اور اقوام کی تباہی کا باعث بنتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوموں پر عذاب نازل ہوتے ہیں۔ قرآن مجید فرقان حمید میں جو متعدد اقوام اور امتوں کی تباہی کے قصے بیان ہوئے ہیں وہ محض قصے کہانیوں تک محدود نہیں بلکہ ان میں عبرت حاصل کرنے کا درس ملتا ہے اور یہ بات بالکل صحیح ہے کہ جیسے عوام ہوں گے اللہ تعالیٰ ان پر ویسے ہی حاکم مسلط کر دے گا۔

اقوام عالم میں سب سے بگڑی ہوئی قوم بنی اسرائیل کی تھی جس پر طرح طرح کے عذاب نازل ہوتے رہے۔ کبھی تو وہ احکام الٰہی کو مان لیتے کبھی مکر جاتے، طرح طرح کے حیلے بہانے بناتے۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن پر ایک ایسا ظالم و جابر حکمران مسلط کیا جس نے ان کو تہ تیغ کر دیا، ان کی بستیوں کی بستیاں اجاڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ارمیاؑ کو وحی فرمائی کہ اس قوم بنی اسرائیل کو بتاؤ کہ میں نے تمہیں کیا کیا نعمت عطا نہیں فرمائی مگر تم نے میری مسلسل نافرمانی کی، میرے قوائد کو تم نے بدل کر رکھ دیا اور میری نعمتوں کا احسان ماننے کی بجائے تم نے کفر کیا۔ پس میں اب اُن کو ایسا آزماؤں گا کہ بڑے بڑے دانا بھی حیران

رہ جائیں گے۔

میں اپنی اس مخلوق میں سے ایک ایسے بندے کو جس کی ولادت بھی بہت بُرے طریقے سے ہوئی ہے اور اس کا کھانا پینا بھی بہت بُرا اور ذلیل ہوگا وہ جبراً قہراً اُن کے اوپر غلبہ حاصل کرے گا اور جو بھی اس کے سامنے آئے گا وہ اسے قتل کر دے گا اور عورتوں کو قیدی بنائے گا، ان کے گھروں کو تباہ و برباد کر دے گا اور ایک لمبے عرصے تک اس کی حکومت رہے گی۔ حضرت ارمیاؑ نے یہ خبر بنی اسرائیل کے نیک لوگوں تک پہنچائی تو انہوں نے عرض کی۔ آپ اللہ تعالیٰ کے حضور رجوع فرمائیں اور عرض کریں کہ ظالموں جابروں اور رُوگردانی کرنے والوں کے ساتھ تو یہ برتاؤ ضرور ہونا چاہئے لیکن فقیر مسکین اور ضعیف اور نیک لوگوں کا قصور کیا ہوگا۔ حضرت ارمیاؑ نے اللہ کے حضور یہ گزارشات عرض کیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ تم خاموش رہو اور اس معاملے میں مکمل سکوت اختیار کرو۔ فقراء اور اپنے تئیں نیک بننے والوں کو کہہ دو کہ تم نے برائی ہوتی دیکھی ہے تو کیا اس کو روکا ہے، کیا مظلوموں کا ساتھ دیا ہے؟ اُن کو کہہ دو کہ ظلم و ستم تمہارے سامنے ہو رہا ہے لیکن تم نے اس کو روکنے کے لئے کیا سدِباب کیا ہے؟ا حضرت ارمیاؑ نے عرض کی۔ اے میرے پروردگار مجھے یہ تو بتا دیجئے کہ وہ شخص کون ہے تاکہ میں اس کے پاس جاؤں اور اس سے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے امان حاصل کر لوں۔

حکم رب العزت ہوا کہ فلاں فلاں شہر کے محلے میں جاؤ وہاں تم ایک لڑکے کو دیکھو گے، جو ایک بہت ہی پرانی بیماری میں مبتلا ہوگا اور ولادت کی رُو سے بھی وہ بہت خبیث ہوگا۔ جسمانی لحاظ سے بہت کمزور اور غذا بھی اس کی انتہائی بدتر ہوگی۔ یہ وہ شخص ہے جس کو میں ان پر مسلط کرنے والا ہوں۔ حضرت ارمیاؑ اس شہر کے اس محلے میں پہنچے تو ایک گھر کے صحن میں ایک ٹوٹے پھوٹے تختے پر انتہائی کمزور اور لاغر لڑکے کو دیکھا اور اس کے پالنے والی کو بھی دیکھا کہ مٹی کے ایک ٹھیکرے میں روٹی کے ٹکڑے ڈال رکھے تھے اور اس کے اوپر مادہ سؤر کا دودھ ڈال رہی ہے۔ اس کے بعد وہ لڑکے کے قریب کر کے اس کے منہ میں ڈال دیتی ہے اور وہ کھا رہا ہے۔ حضرت ارمیاؑ یہ تمام نشانیاں دیکھ کر پہچان گئے کہ یہ وہی لڑکا ہے جس کی حالت خدا تعالیٰ نے بیان کی ہے۔ چنانچہ آپؑ اُس کے قریب آئے اور دریافت کیا کہ تیرا نام کیا ہے۔ اس نے عرض کی (بخت نصر) آپؑ نے اس کو پہچان لیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کا علاج شروع کیا اور وہ بالکل تندرست ہو گیا۔

آپ نے دریافت فرمایا کہ تُو مجھے پہچانتا ہے اس نے عرض کی کہ پہچانتا تو نہیں ہوں لیکن یہ ظاہر ہے کہ آپ بڑے برگزیدہ اور نیک ہیں تو آپؑ نے فرمایا کہ میں بنی اسرائیل میں سے ایک نبی ہوں۔ ارمیا میرا نام ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرے متعلق خبر دی ہے کہ وہ تجھ کو بنی اسرائیل پر مسلط کرے گا اور تُو اُن کو قتل کرے گا اور تُو ان سے بُرے سے بُرا سلوک کرے گا۔ یہ باتیں سن کر وہ لڑکا حیران رہ گیا۔ حضرت ارمیاؑ نے فرمایا کہ تو اپنی طرف سے ایک نوشتہ میرے لئے امن کا لکھ دے چنانچہ بخت نصر نے آنحضرت کو نوشتہ امان لکھ دیا۔

اب بخت نصر اچھا بھلا ہو گیا اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا اور انہیں فروخت کرتا پھر اس نے بنی اسرائیل سے لڑنے کے لئے لوگوں کو ترغیب دینی شروع کی۔ بنی اسرائیل کا صدر مقام اس وقت بیت المقدس تھا اس کے بلانے پر لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ مظلوم افراد پہلے ہی بنی اسرائیل کے ظلم و ستم سے تنگ تھے اور ان سے نالاں تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے بہت بڑا لشکر تیار کر لیا اور لشکر کو اکٹھا کر کے بیت المقدس کی طرف بڑھنے لگا۔ جب حضرت ارمیاؑ کو خبر ہوئی تو آپؑ اس سے

اپنی امان کا نوشتہ یاد کرانے کے لئے اس کے لشکر کی طرف چل دیئے نوشتہ حضرت کے پاس تھا۔ اس کے لشکر اور حواریوں کی کثرت سے آپ کو اس تک پہنچنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ حضرت ارمیاؑ نے ایک لکڑی کے سرے پر سفید کپڑے کا پرچم لگا کر ساتھ ہی نوشتہ باندھ دیا۔ لشکر نے رستہ چھوڑا اور آپ بخت نصر تک پہنچ گئے۔ بخت نصر نے آپ کو پہچان لیا اور امان دے دی۔ حضرت وہیں سے واپس آ گئے اور بخت نصر کا لشکر آگے بڑھتا گیا۔

اسی دوران ایک ٹیلے کے درمیان بخت نصر کی نظر پڑی تو دیکھا کہ وہاں سے تازہ خون نکل رہا ہے اور جوں جوں اس پر مٹی ڈالی جاتی خون زیادہ جوش مار کر نکلتا تھا۔ بخت نصر نے لوگوں سے پوچھا یہ کیا ہے اور یہ خون کیوں نکل رہا ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ اللہ کے ایک نبی حضرت یحییٰؑ بن زکریاؑ کا خون ہے جسے بنی اسرائیل کے بادشاہ نے بے دردی سے قتل کروا دیا تھا یہ ان ہی کا خون ہے۔ بخت نصر نے کہا کہ میں بھی اس وقت تک بنی اسرائیل کو قتل کئے جاؤں گا جب تک یہ خون رکے گا نہیں۔ بخت نصر کو لوگوں نے بتایا کہ بنی اسرائیل کا ظالم بادشاہ بنی اسرائیل کی عورتوں سے بدکاری کرتا تھا اور جب کبھی حضرت یحییٰؑ کے پاس سے گزرتا تو حضرت اسے سخت تنبیہ کرتے لیکن اس نے کوئی پروانہ کی الٹا دل میں عہد کر لیا کہ ضرور یحییٰؑ کو قتل کروں گا چنانچہ اس نے حکم دیا کہ یحییٰؑ کا سر لایا جائے۔

صاحب تذکرۃ الانبیاء اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ جب حضرتؑ کا سر اقدس تشت میں رکھ کر سامنے لایا گیا تو حضرت کے سر مبارک سے آواز آئی کہ اے شخص اللہ سے ڈر یہ فعل تیرے لئے جائز نہیں ہے۔ پھر اس تشت سے خون گرا اور زمین پر بہہ نکلا بادشاہ نے سر اقدس کو فوراً زمین میں دفن کرنے کا حکم دیا لیکن پھر بھی وہ خون ابلتا رہا

تین اقوام

1- جو قوم تسخیر فطرت کرتی ہے اور زندگی اللہ کی بتائی ہوئی مستقل اقدار کے مطابق بسر کرتی ہے اسے جماعت مومنین کہا جاتا ہے۔ ان کا حال بھی روشن اور مستقبل بھی تابناک۔

2- جو قوم تسخیر فطرت تو کرتی ہے لیکن اللہ کی اقدار کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتی اس کا حال (دنیا) خوش حال لیکن آخرت میں حصہ ندارد، جیسے اقوام مغرب۔

3- جو قوم نہ تسخیر فطرت کرتی ہے، نہ وحی پہ عمل ان کا حال و مستقبل تاریک ہوتا ہے جیسے ''ہم''۔

☆......خادم حسین مجاہد

تا آنکہ بخت نصر نے ظہور کیا جاتا ہے کہ اس بادشاہ اور بخت نصر کے درمیان ایک زمانہ گزر چکا تھا۔

بخت نصر اب اُن کے قتل پر تل گیا اور مردوں عورتوں اور بچوں حتیٰ کہ ان کے جانوروں تک کو قتل کرتا گیا۔ وہ گاؤں گاؤں جاتا یہاں تک کہ اس نے سب کو فنا و برباد کر دیا لیکن حضرت یحییٰؑ کے سر اقدس سے خون ابلنا بند نہ ہوا۔ بخت نصر نے پوچھا کہ کوئی اور بچا ہے تو اس کو حاضر کیا جائے چنانچہ ایک گاؤں سے ایک انتہائی بوڑھی عورت کو پیش کیا گیا۔ بخت نصر نے اس کی عمر پوچھی تو حیران رہ گیا اور پوچھا کہ تُو نے اس بادشاہ کا زمانہ دیکھا ہے جس نے حضرت یحییٰؑ کو قتل کروایا تھا تو بڑھیا نے کہا کہ میں اس وقت عالم شباب میں تھی اور بادشاہ کی خاص منظور نظر تھی اور میرے ہی مشورے سے اُن کو بادشاہ نے قتل کروایا تھا۔ یہ سننا تھا کہ بخت نصر نے اپنے ہاتھوں سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا اور حضرت یحییٰؑ کا ابلتا ہوا خون بند ہو گیا۔

اس کے بعد بخت نصر بابل میں آیا اور ایک عالی شان محل تعمیر کروایا اور حضرت دانیالؑ جو لوگوں کو تبلیغ

کرتے پھرتے تھے ان کو گرفتار کروا کر محل کے قریب ایک ویران خشک کنویں میں ڈلوا دیا اور ایک شیر کو کنویں میں ڈال دیا گیا۔ شیر کنویں سے مٹی چاٹتا تھا اور حضرت کے لئے دسترخوان اترتا تھا۔ ایک لمبا عرصہ گزر جانے کے بعد بنی اسرائیل سے ایک نبی کو حکم ہوا کہ فلاں مقام پر ایک کنواں ہے اس کنویں میں میرا پیغمبر دانیال قید ہے تم کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے جاؤ اور کہنا کہ آپ کا پروردگار تم کو سلام کہتا ہے۔ نبی چاہ بابل پر آئے اور آواز دی کہ میں فلاں نبی ہوں اللہ تعالیٰ کے حکم سے آیا ہوں اور آپ کے لئے پھل کھانا اور دودھ لایا ہوں اور اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتا ہے اور پھر ڈول میں اشیاء رکھ کر نیچے پہنچا دیں۔

پھر حضرت دانیال نے اپنے رب العزت کے حضور مناجات کی۔ فرمایا:

ترجمہ: سب تعریفیں اس اللہ کے لئے زیبا ہیں جو ہر اس شخص کی کفایت کرتا ہے جو اس پر بھروسہ کرے۔ سب تعریفیں اس اللہ کے لئے زیبا ہیں جو یاد کرنے والوں کو ترک نہیں کرتا۔ سب تعریفیں اس اللہ کے لئے زیبا ہیں جو مانگنے والے کو ناامید نہیں کرتا اور جو نیکی کا بدلہ نیک ہی دیتا ہے جو صبر کے وقت نجات دیتا ہے۔ سب تعریفیں اس اللہ کے لئے زیبا ہیں جو اس وقت بھی ہماری امیدگاہ ہوتا ہے جب ہم اپنی بداعمالیوں کے سبب بدگمان ہو چکے ہوتے ہیں۔

یہ دعا و مناجات حضرت دانیالؑ کی طرف منسوب اور مشہور دعا ہے، بنی اسرائیل میں جب ظالمین کا قلع قمع ہو گیا اور وہ اپنے انجام کو پہنچ گئے تو ایک رات سوتے میں بخت نصر کو خواب دکھائی دیا کہ اس کا سر لوہے کا، اس کے دونوں ہاتھ تانبے کے اور اس کا سینہ سونے کا ہو گیا ہے تو اس نے منجموں اور خواب کی تعبیر بتانے والوں کو بلوایا اور ان کو اپنا خواب بتایا اور کہا کہ اس خواب کی تعبیر بتاؤ۔

سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔ بخت نصر نے کہا کہ ان سب کو لے جا کر قتل کر دو۔ اتنے عرصہ سے یہ وظیفے تنخواہیں اور مراعات مفت میں لیتے رہے ہیں۔

وہاں موجود ایک مصاحب نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔ بخت نصر نے کہا۔ ہاں بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟ تو اس نے عرض کی کہ ایک آدمی ہے جو تمہارے خواب کی تعبیر بتا سکتا ہے اور وہ کنویں میں قید ہے۔ وہ کوئی برگزیدہ بندہ ہے جس کو آج تک کنویں میں شیر نے کچھ بھی نہیں کہا، وہ زندہ و سلامت ہے۔ بخت نصر کو یاد آ گیا کہ واقعی میں نے ایک عرصہ قبل انہیں کنویں میں شیر کے ہمراہ قید کر دیا تھا۔ فوراً آدمی بھیجے اور حضرت دانیالؑ کو نکلوا کر محل میں پہنچا دیا گیا۔ اب بخت نصر نے آپ سے پوچھا کہ بتایئے میں نے خواب کیا دیکھا ہے تو آپ نے فرمایا۔ اے بخت نصر! تُو نے خواب میں دیکھا ہے کہ تیرا سر ہاتھ اور سینہ فلاں فلاں چیز کے ہو گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ اب اس کی تعبیر بتایئے۔ فرمایا کہ تیری سلطنت ختم ہو گئی ہے اور تُو تین دن کے بعد قتل کر دیا جائے گا اور تجھ کو فارس کا ایک لڑکا قتل کرے گا۔ اس نے کہا۔ میرے گرداگرد سات فصیلیں بہت بلند اور مضبوط ہیں اور ان کے ہر دروازے پر چاک و چوبند محافظ بھاری تعداد میں موجود ہیں اور ہر دروازے پر تانبے کی ایک بطخ بھی بنوا کر رکھوائی گئی ہے جو بھی اجنبی اندر داخل ہوتا ہے تو بطخیں چلانا شروع کر دیتی ہیں جب تک کہ وہ آدمی گرفتار نہ ہو جائے۔ اس پر حضرت دانیالؑ نے فرمایا کہ جو کچھ میں کہہ چکا ہوں وہ ہو کر رہے گا۔ موت کے خطرے کے پیش نظر بخت نصر نے محل کے تمام اطراف مزید مسلح سپاہی کھڑے کر دیئے اور شاہی فرمان جاری کیا کہ جو بھی سامنے آئے اس کو قتل کر دو، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔

حضرت دانیالؑ کو فرمایا کہ تم تین دن تک ادھر میرے پاس ہی ٹھہرے رہو گے اگر میں بچ گیا تو تمہیں قتل کرا دوں گا۔ چنانچہ تیسرے دن شام کو بخت نصر کے دل پر ایک غم سا طاری ہو گیا۔ وہ باہر نکلا اور اس لڑکے سے ملا جو اہل فارس سے تھا اور اس کے بیٹے کی خدمتگاری کرتا تھا لیکن بادشاہ کو معلوم نہ تھا کہ یہ اہل فارس سے ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے اپنی تلوار لڑکے کو دی اور کہا۔ اے لڑکے یہ تلوار لو اور آج مخلوق خدا میں سے جو تمہارے سامنے آئے اسے قتل کر دو اور اگر میں بھی آ جاؤں تو مجھے بھی قتل کر دینا۔ چنانچہ لڑکے نے فوراً شدت کا وار کیا اور بخت نصر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

بخت نصر ہی کے دور کا واقعہ جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی حضرت عزیرؑ کے متعلق ملتا ہے کہ بخت نصر کے دور میں ہی حضرت دانیالؑ کو کنویں میں ڈلوایا گیا۔ حضرت ارمیاً دور جنگلوں میں چلے گئے اور حضرت عزیرؑ بھی دور چلے گئے اور بخت نصر کی حکومت ختم ہونے کے بعد واپس آئے اور تبلیغ میں دوبارہ مصروف ہو گئے۔ ایک دفعہ گدھے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ ایک آبادی کے قریب سے گزرے جو اپنی خستہ حالی بیان کر رہی تھی، مکان گر چکے تھے، کوئی گھر سلامت نہ تھا نہ کوئی انسان اور نہ ہی کوئی جانور نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا صدیاں پہلے یہ غیر آباد ہوئی ہے۔ حالانکہ کچھ سال قبل حضرت اس بستی کو آباد دیکھ چکے تھے۔ دل میں خیال آیا کہ اب یہ بستی دوبارہ کس طرح آباد ہو گی۔ نہ کوئی مکان نہ ہی کوئی مکین، نہ اس کے آباد ہونے کے کوئی آثار نظر آتے ہیں۔ یہی خیالات دل میں لئے ہوئے آگے کو چل دیئے۔ تھوڑا ستانے کے لئے گدھے سے اترے، اسے ایک درخت سے باندھا، اپنا دسترخوان بھی الگ درخت کے ساتھ لٹکا دیا اور آپ سایہ میں لیٹ گئے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح قبض کر لی۔

اسی طرح سو سال تک آپ پڑے رہے۔ سو سال بعد دوبارہ روح واپس لوٹائی گئی اور آپ اٹھ بیٹھے۔ عصر کا وقت تھا جب آپ سونے کے لئے لیٹے تو دوپہر تھی آواز قدرت آئی۔ اے عزیرؑ! تم کتنا عرصہ سوئے رہے۔ عرض کی کہ دن کا کچھ حصہ فرمایا۔ اپنے گدھے کی طرف دیکھو جب ادھر دیکھا تو اس کی ہڈیاں بھی بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ حکم رب العزت ہوا ان ہڈیوں کو اکٹھا کرو۔ آپؑ نے تمام ہڈیاں اکٹھی کیں تو آنِ واحد میں آپ کے گدھے کی ہڈیوں پر گوشت چڑھا اور پھر کھال چڑھی اور وہ زندہ ہو گیا تو آپ کی زبان سے نکلا۔ ان اللہ علیٰ کل شئ قدیر اپنے دسترخوان کو کھولا تو کھانا اور شیرہ تر و تازہ تھا۔

ارشاد قدرت ہوا اے عزیرؑ! ہم اسی طرح اجڑی ہوئی بستیوں کو بساتے ہیں اور بستی ہوئی بستیاں اجاڑ دیتے ہیں۔ تفاسیر میں ملتا ہے کہ حضرت عزیرؑ جب گھر سے چلے تھے تو اس وقت اُن کی عمر پچاس سال تھی اور چند دن قبل ہی ان کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ جب آپ دوبارہ زندہ کئے گئے تو آپ کی عمر پچاس سال ہی تھی اور بیٹا سو سال کا ہو چکا تھا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھی۔

روایت میں آتا ہے کہ جب آپ پلٹ کر واپس آئے اور لوگوں کو بتایا کہ میں عزیز نبی ہوں تو انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور لوگ کہنے لگے کہ وہ سو سال قبل گھر سے نکل گئے تھے۔ کوئی پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے۔ تب حضرت عزیرؑ نے لوگوں کو توریت سنائی کیونکہ سوائے آپؑ کے کسی نے توریت حفظ نہیں کی تھی کچھ اور نشانیاں دکھلائیں تو لوگوں کو یقین آ گیا کہ یہ حضرت عزیرؑ ہی ہیں۔ چنانچہ لوگوں کے جم غفیر کے ساتھ اپنے گھر پہنچے اور سو سالہ بیٹے نے پچاس سالہ باپ کا استقبال کیا۔

(ماخوذ: قرآن مجید مترجم قصص الانبیاء، تاریخ قدیم)

+

علم و تحقیق

جادو، جنات اور عامل

روایات ○ مفروضے ○ حقائق

یہ تحقیقی مضمون ان شاء اللہ جوگیوں، سادھوؤں، پروفیسروں، بنگالی بابوں، جھوٹے پیروں، شاہ صاحبوں اور تعویذ گنڈا کرنے والے نام نہاد صوفیوں سے آپ کو نجات دلا دے گا۔

☆ محمد افضل رحمانی 0314-4652230

(دوسرا حصہ)

چند قابل توجہ باتیں

میرے پاس جادو اور آسیب وغیرہ کے جتنے مریض آتے ہیں ان میں ساٹھ فیصد ایسے ہوتے ہیں جنہیں نہ جادو کے اثرات ہوتے ہیں نہ وہ آسیب زدہ ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں کوئی طبی مرض ہوتا ہے لیکن جب وہ اپنی حالت بتاتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا و جہاں کی تمام روحانی اور جسمانی بیماریاں انہیں لگی ہوئی ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ جب انہیں کوئی طبی یا روحانی بیماری نہیں ہوتی تو پھر وہ ایسا کیوں سمجھتے ہیں؟ تو جناب اس کا واحد سبب دین سے دوری ہوتی ہے۔ وہ نہ نماز پڑھتے ہیں، نہ کبھی قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہیں، حتیٰ کہ کھانا کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد کی مسنون دعائیں بھی انہیں یاد نہیں ہوتیں۔ پاخانہ پھرنے کی دعا اور پاخانے سے فارغ ہونے کی دعا بھی نہیں پڑھتے۔ فحش فلمیں اور ڈرامے رات گئے

تک دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ رات کو دیر سے سوتے اور صبح دیر سے اٹھتے ہیں۔ گھر میں کتے پالتے یا مختلف فنکاروں کی دیدہ زیب فوٹو لٹکاتے ہیں۔ حاسد اور سڑی ہوتے ہیں، اذان کو غور سے نہیں سنتے اور نہ مؤذن کا جواب دیتے ہیں۔ سونے سے پہلے مسنون اور مخصوص دعائیں نہیں پڑھتے۔ پیشاب کی چھینٹوں سے نہیں بچتے۔ مسنون غسل جنابت کے مسنون طریقے سے واقف نہیں ہوتے۔ نظر کی حفاظت نہیں کرتے جس کی وجہ سے شہوانی خیالات ان پر غالب آ جاتے ہیں اور پھر شہوانی خیالات کی بھرمار سے دماغ کی رطوبتیں خشک ہونے لگتی ہیں نتیجتاً جریان واحترام اور سیلان الرحم جیسی موذی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے اعضائے رئیسہ کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ معدہ کمزور ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اعصابی نظام میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ تبخیر معدہ سے مراق اور مراق سے جنون اور مالیخولیا کے مریض بن جاتے ہیں۔ قوت ارادی اور قوت فیصلہ سے محروم ہو جاتے ہیں۔ پھر وہم، نسیان اور بے خوابی کا شکار ہو کر زندگی کو بوجھ تصور کرتے ہیں۔

میں ایسے لوگوں کو سب سے پہلے نماز کی تلقین کرتا ہوں اور کم از کم پانچ صد مرتبہ لاحول و لا قوۃ الا باللہ پڑھنے کی تلقین کرتا ہوں اور بطور دوائی خمیرہ گاؤزبان عنبری کھانے کی تاکید کرتا ہوں۔ اگلے مرحلے میں مسنون دعائیں یاد کرنے کا کہتا ہوں کیونکہ مسنون دعائیں ہمیں خیر و برکت کی طرف لے جاتی ہیں۔ حدیث شریف میں ہے جو شخص کھانا کھانے سے پہلے اللہ کا نام نہیں لیتا تو شیطان اس کھانے کو اپنے لئے حلال سمجھتا ہے۔ جو شخص پاخانہ پھرنے کی دعا نہیں پڑھتا اس پر آسیب مسلط ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جو شخص رات کو دیر سے سوتا ہے اور صبح دیر سے اٹھتا ہے وہ قبل از وقت بڑھاپے کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس گھر میں شوقیہ کتا پالا جائے یا گھر میں فوٹو لٹکائی جائے اس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ جو پیشاب کی چھینٹوں سے نہیں بچتا اس پر عذاب قبر مسلط ہو جائے گا۔ مسنون طریقے سے غسل جنابت نہ کرنے والا کبھی پاک نہیں ہوگا اور ہمیشہ حالت ناپاکی میں ہی رہے گا جس کی نحوست پورے گھر پر چھائی رہے گی۔ جس گھر میں قرآن حکیم کی تلاوت نہ کی جائے بالآخر وہ خبیث جنات کا مسکن بن جاتا ہے۔

آسیب اور جادو کو گھر سے بھگانے کے لئے سورہ بقرہ کی تلاوت مجرب اور اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ خدا کے فضل وکرم سے بے شمار لوگوں کو محض اپنی روزمرہ زندگی میں تھوڑی سی اسلامی تہذیب لانے سے کئی بیماریوں سے نجات مل گئی اور وہ نارمل زندگی گزارنے کے قابل ہو گئے۔ آپ بھی اگر اپنی روزمرہ زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بتائے ہوئے عملیات پر عمل کریں گے تو ان شاء اللہ چند دنوں میں اپنے خیالات اور حالات میں حیرت انگیز حد تک تبدیلی محسوس کریں گے۔ میں ہر اس شخص کو جو فاقہ زدہ ہے اور غربت کا رونا روتا ہے صرف ایک عمل بتا دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ نماز کی پابندی کرے اور حتی الوسع رسول اللہؐ کے بتائے ہوئے عملیات پر عمل کرے اور مسنون دعائیں یاد کرے اور رات کو یا کسی بھی وقت سورہ واقعہ کی تلاوت کرے، ان شاء اللہ اس کی زندگی سے غربت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

استخارہ، صدقہ اور عامل

استخارے کے بارے میں میرا مفصل مضمون ''حکایت'' کے کسی شمارے میں آ چکا ہے۔ اس میں میں نے تفصیل بیان کر دی ہے کہ استخارہ کیسے کیا جاتا ہے۔

آج جو عامل حضرات استخارہ کرتے پھرتے ہیں میں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ استخارہ ایک ایسا عمل ہے جو خود کرنا چاہئے ان نام نہاد استخارہ کرنے والوں سے بچیں۔ میرا پاکستان کے تمام عاملوں اور پیروں کو چیلنج ہے کہ وہ کسی ایک روایت سے ثابت کریں کہ رسول اللہؐ نے کبھی کسی کے لئے استخارہ کیا ہو حالانکہ استخارہ کرنے کا طریقہ اور تاکید خود رسول اللہؐ نے صحابہؓ کو فرمائی اور صحابہ حضورؐ کے اس بتائے ہوئے عمل پر استخارہ کیا کرتے تھے لیکن کبھی بھی کسی صحابیؓ نے سرکار دو عالمؐ سے اپنے لئے استخارہ کرنے کی درخواست نہیں کی تھی۔ آج کل اس مجرب عمل کو جو رسول اللہؐ نے امت کو سکھایا عاملوں اور پیروں نے مذاق بنا کے رکھ دیا ہے اور باقاعدہ ہدیے وصول کر کے استخارے کرتے پھرتے ہیں۔ اس طرح صدقے کے ساتھ بھی کئی قسم کی لایعنی پابندیاں اور مختلف قسم کے طریقے لوگوں کو بتائے جاتے ہیں اور ان کے مخصوص اوزان مقرر کر رکھے ہیں، مختلف کاموں میں مختلف صدقے، کہیں سوا گز کالا کپڑا تو، کہیں سوا کلو کالے ماش، کبھی قبرستان میں پھینک آؤ اور کبھی بہتے پانی میں بہاؤ، سر کا صدقہ کسی جانور کا سر مقرر کر رکھا ہے۔ کہیں لال صدقہ ہے، کہیں کالا صدقہ، عجیب قسم کی پابندیاں مثلاً اپنے قد کے برابر کا بے رنگ کا کپڑا لے کر خیرات کرو جسم کی نحوست دور کرنے کے لئے مجرب تھے۔

یاد رہے کہ شریعت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی پابندی نہیں۔ شریعت میں بعض چیزیں فرض میں بعض واجب اور بعض نفل، فرائض کو زکوٰۃ وعشر شامل ہے۔ اگر صاحب نصاب ہے تو سو میں سے اڑھائی روپے زکوٰۃ اور اگر زمین بارانی ہے تو دس منوں میں ایک من اور اگر پانی والی ہے تو بیس منوں میں ایک من عُشر ادا کرنا ضروری ہے۔ صدقاتِ نافلہ کی کوئی حد نہیں جتنا چاہیں خرچ کریں بلکہ دل کھول کر صدقہ کریں۔ مت پڑیں ان فضولیات میں کہ عامل آپ کو صدقہ کی قسم بھی بتلائے اور مقدار بھی۔ خدارا! سوچئے آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ دین سے اس قدر بیگانہ ہیں کہ جو آپ کو بہکائے آپ اسی کے بہکاوے میں آ جائیں گے۔

احساسِ کمتری

یہ ایک بہت ہی نامراد روحانی بیماری ہے جو انسان کی بہترین صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔ جو شخص اس بیماری میں مبتلا ہو جائے اس کا آخری رزلٹ یہ نکلتا ہے کہ وہ معاشرے سے کٹ جاتا ہے، تنہائی پسند ہو جاتا ہے، اللہ کی نعمتوں کا ناشکرا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ مایوس اور ناامید ہو کر انتہائی بدمزگی اور مجبوری کی زندگی گزارتا ہے۔ اگر میں احساسِ کمتری کی آسان سی تعریف کروں تو وہ یوں ہے کہ انسان اس بیماری میں اپنے آپ کو دوسروں سے حقیر اور محروم سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور پھر اس بات کو اپنے ذہن پر مسلط کر لیتا ہے کہ میں تو لوگوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ نہ میرے پاس حسن ہے نہ جوانی ہے، نہ دولت ہے، خوبصورت بیوی اور اچھے مکان سے بھی محروم ہوں۔ فلاں شخص کتنا خوبصورت ہے، اس کے پاس کوٹھی اور کار بھی ہے، اس کی بیوی خوبصورت اور سلیقہ شعار ہے وغیرہ۔

ایک سچا واقعہ

رمضان المبارک کے مہینے میں ایک لڑکا میرے پاس آیا۔ میں نے آنے کا مقصد پوچھا تو کہنے لگا کہ میرا بہنوئی سخت بیمار ہے، آپ میرے ساتھ چلیں اور اسے دیکھیں۔ میں نے اسے صاف جواب دے دیا

کہ میں رمضان مین بالکل کہیں نہیں جاتا لیکن اس نے بہت ضد کی اور بہنوئی کی خراب حالت کا کچھ اس انداز سے ذکر کیا کہ میں اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔ جب ہم متعلقہ قصبے میں پہنچے تو جس گھر میں ہم گئے اسے گھر کہنا تو ٹھیک نہیں تقریباً ایک ایکڑ کے رقبے میں پھیلی ہوئی وسیع وعریض انتہائی شاندار کوٹھی تھی، چند نوکروں کے علاوہ کوٹھی کے مکینوں میں صرف میاں بیوی ہی رہتے تھے۔ ان کی صرف ایک اولاد تھی اور وہ لڑکا تھا جو قریبی شہر میں پڑھتا تھا اور وہیں سکول کے ہاسٹل میں رہتا تھا۔ ابتدائی اور رسمی باتوں سے پتہ چلا کہ موصوف علاقے کے بڑے زمیندار ہیں اور تقریباً اسی ایکڑ زمین کے مالک ہیں۔ ان کی زمینیں شہر کے قریب تک چلی گئی تھیں جس کی وجہ سے ان کی قیمت انتہائی زیادہ ہو گئی تھی، کوٹھی سے ذرا دور چوہدری صاحب کا اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ چند بھینسیں رکھی ہوئی تھیں جن کی حفاظت اور چارے وغیرہ کے لئے ملازم رکھا ہوا تھا۔

جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت ان کی زمین کا ٹھیکہ پچیس ہزار روپے فی ایکڑ تھا آج کل پچاس ساٹھ ہزار سے کم نہیں ہوگا یعنی آج کل ان کی زمین کا ٹھیکہ پچاس لاکھ سالانہ کے قریب بنتا ہے اس کے علاوہ بھٹے کی آمدن بھی تھی اور کھانے والے صرف تین فرد تھے۔ ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ افطاری کا ٹائم ہو گیا کئی قسم کے پھل، دودھ اور کولڈ ڈرنک سے روزہ افطار کیا، نماز پڑھی اور پھر چائے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ نماز تراویح کے بعد کھانا کھایا جو قریبی شہر کے بہترین ہوٹل سے سپیشل منگوایا گیا تھا۔ پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اب چوہدری صاحب کی بیگم بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔ میرے ہمسفر کو ہدایت کی گئی کہ تم جا کر سو جاؤ۔ چوہدری صاحب کی عمر بیگم سے کم از کم دگنی ضرور ہو گی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ ان کی دوسری شادی ہے۔ پہلی بیوی کو طلاق دے دی گئی کیونکہ اس سے اولاد نہیں ہوئی تھی لیکن میرے خیال میں چوہدری صاحب نے طلاق خود نہیں دی تھی بلکہ ان سے طلاق لی گئی تھی۔ موجودہ بیگم بھی صرف ایک بچہ ہی پیدا کر سکی اب وہ بچہ دس بارہ سال کا ہو گیا تھا۔ چوہدری صاحب کی میڈیکل رپورٹس سے پتہ چلا کہ موصوف مردانہ بانجھ پن کا شکار ہیں۔ بیگم صاحبہ انتہائی خوبصورت اور ضرورت سے زیادہ چالاک تھیں۔ یہاں میں ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں نہیں لکھوں گا کیونکہ چادر اور چاردیواری کی دنیا کے واقعات نرالے قسم کے ہی ہوتے ہیں۔ چوہدری صاحب کے کچھ حالات تو بیگم نے سنائے اور کچھ چوہدری صاحب نے خود سنائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ چوہدری صاحب کو نیند بالکل نہیں آتی تھی، صحت دن بدن کمزور ہو رہی تھی، ذہن پر انجانا خوف مسلط ہو گیا تھا، کمرے میں بہت کم سوتے تھے انہیں یہ وہم ہو گیا تھا کہ کہیں مکان میرے اوپر نہ گر جائے۔ بیٹھے بیٹھے باہر کو بھاگ نکلتے تھے کہ زلزلہ آ گیا ہے۔ حالانکہ ان کا دماغ چکر کھا جاتا تھا اور وہ سمجھتے کہ زلزلہ ہے۔ ہر وقت پیٹ پر ہاتھ پھیرتے رہتے بلکہ بعض دفعہ پیٹ کو سہلانے لگتے، بعض دفعہ سالن کھانے سے انکار کر دیتے کہ اس میں چھپکلی نہ گر گئی ہو پھر اپنی نگرانی میں سالن تیار کراتے۔ اس رات بھی انہوں نے ہوٹل کا کھانا نہیں کھایا تھا صرف سلاد سے روٹی کھائی تھی۔ بلب کی طرف دیکھتے اور کہتے یہ ابھی پھٹ جائے گا وغیرہ۔

ساری صورت حال سامنے آنے پر جو بات میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ موصوف نفسیاتی مریض ہیں لیکن نفسیاتی مرض کی کوئی نہ کوئی وجوہات تو ہوتی ہی ہیں۔ لہٰذا اب مجھے ان وجوہات کو تلاش کرنا تھا۔ سب سے پہلی جو بات میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ موصوف کی ازدواجی زندگی میں کوئی نہ کوئی خلا موجود ہے لہٰذا میں نے ان کی بیگم سے علیحدگی میں نے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن مجھے ان کی زندگی میں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی۔ جب میں نے بیگم صاحبہ سے میڈیکل رپورٹوں کا ذکر کیا تو ذرا سا گھما پھرا کر انہوں نے اقرار کر لیا کہ بچہ ان کی ناجائز اولاد ہے اور ایسا کرنا میری مجبوری تھی کیونکہ مین سونے کا انڈہ دینے والی مرغی سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔

"چوہدری صاحب کو رپورٹوں سے پتہ تو چل گیا ہو گا اس کے باوجود انہوں نے بچے کو کیسے قبول کر لیا؟" میں نے سوال کیا۔

"دراصل میں نے ڈاکٹر صاحب سے بات کی تھی اور انہوں نے چوہدری صاحب کو یقین دلا دیا تھا کہ میڈیسن کھانے کے بعد تمہاری رپورٹ ٹھیک ہو گئی ہے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔ "انہوں نے خود ہی رپورٹ تیار کروائی اور چوہدری صاحب سے کہا کہ جس سے جی چاہتا ہے رپورٹ چیک کرا لو۔ چنانچہ چوہدری صاحب نے کئی ڈاکٹروں کو دکھائی تو سب نے رپورٹ او کے کر دی۔ اس کے بدلے ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کافی رقم بھی لی اور بچہ بھی انہی کا ہے"۔

صبح میں نے انہیں کچھ عملیات لکھ کر بھی دیئے اور زبانی بھی بتائے، رمضان کے بعد میں دوبارہ ان کی کوٹھی گیا تو کوٹھی کے باہر کالے رنگ کی لمبی لمبی کاریں کھڑی تھیں اور کمروں میں کافی مہمان نظر آ رہے تھے۔ ملازم نے مجھے ایک کمرے میں بٹھایا جو شاید چوہدری صاحب کا اسلحہ خانہ تھا کیونکہ وہاں کافی تعداد میں آتشیں اسلحہ موجود تھا۔ میں نے ملازم سے پوچھا کیا آج یہاں کوئی فنکشن وغیرہ تھا۔ کہنے لگا۔ جی جو چاہے سمجھ لیں، دراصل آج لندن سے چوہدری صاحب کے تینوں ہم زلف اور ان کے بچے آئے ہوئے ہیں۔

کچھ دیر بعد مجھے اندر بلا لیا گیا۔ اندر کا ماحول دیکھ کر میں سمجھا کہ کسی اور سیارے پر پہنچ گیا ہوں۔ عورتوں کے جسم پر ناکافی لباس، بات بات پر قہقہے، مکس اردو جس میں انگریزی کے الفاظ زیادہ تھے، ننگی پنڈلیاں، علیحدہ علیحدہ ہیئر سٹائل، چھوٹے بچے بلبغ انگلش میں باتیں کرتے تو مائیں بجائے اردو کے انگلش بولنا شروع کر دیتیں۔ مجال ہے جو کسی بچے کے ساتھ اردو یا پنجابی میں بات کی جاتی۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ ہمارے بچے کہیں اردو اور پنجابی سیکھ کر ہماری انسلٹ کا باعث نہ بنیں۔ سچی بات کروں گا میں نے جو محسوس کیا وہ یہ تھا کہ تینوں بہنیں خوبصورت ہونے کے باوجود ادھوری ادھوری سی نظر آ رہی تھیں ان میں نسوانیت نام کو نہیں تھی۔ ایک تو ان میں بالکل ایسی محسوس ہو رہی تھی جیسے تیسری مخلوق سے تعلق رکھتی تھے۔ جو عورت بالوں اور چوٹی سے محروم ہو آدھی نسوانیت سے تو وہ اتنے ہی میں محروم ہو جاتی ہے۔ پھر مردوں کی شباہت اوپر سے لاابالی پن بات بات پر قہقہے، عادات و اطوار عامیانہ، جھجک اور حیا جو نسوانی حسن کا ایک لطیف پہلو ہے عنقا، خیر وہ مخصوص ماحول میں رہتے ہوئے شریعت سے بالکل بیگانہ نظر آ رہی تھیں لیکن مشکل یہ تھی کہ مغربیت کو بھی پوری طرح اپنانے کا ان کو سلیقہ نہیں تھا۔ وہ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر بن کر رہ گئی تھیں ان پر یہ مقولہ انتہائی فٹ آتا تھا۔ "کوا چلا ہنس کی چال اور اپنی بھی بھول گیا"۔

میرا جی چاہا یہاں سے اٹھ جاؤں لیکن مروت آڑے آ گئی ویسے بھی ہم جیسے لوگوں کو ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے، ان میں سے ایک نے مجھے پوچھا۔

''سر آپ کی خانقاہ کدھر ہے؟''

میں نے برجستہ کہا۔ ''بھئی ابھی تو میں زندہ ہوں''۔ بے ساختہ قہقہوں سے کمرہ گونج گیا۔

بجائے نادم ہونے کے اس نے فوراً کہا۔ ''اوہ سوری میرا مطلب ہے آپ کا مزار؟''

''بھئی مزار بھی مرنے کے بعد ہی بنتا ہے''۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس نے دوسری بہن کی طرف دیکھا اور کہنے لگی ڈارلنگ میں کیا کہنا چاہتی تھی؟ اس نے کہا۔ بھئی مجھے کیا پتہ۔ وہ حواس باختہ ہو چکی تھی۔ قہقہوں کا سیلاب تھما تو وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوئی اور کہنے لگی دیکھیں بھائی بُرا محسوس نہ کرنا میرا مطلب تھا آپ کہاں رہتے ہیں؟ وہ آہستہ آہستہ مصنوعی خول سے باہر آنے لگی حتیٰ کہ ٹھیٹھ پنجابی میں باتیں کرنے لگی۔ میں نے دل میں سوچا یہ غیروں کی نقالی ہمیں کہاں لے جائے گی۔ میں نے انہیں نماز کے متعلق پوچھا تو یہ جان کر انتہائی افسوس ہوا کہ وہ نماز نہیں پڑھتی تھیں۔ صاحب بہادر جو میرے قریب، بیٹھے ہوئے تھے ان سے استفسار کیا تو وہ کہنے لگے۔ دراصل مجھے نماز پڑھنے سے دلچسپی نہیں مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ کچن میں اپنی بیگم کے لئے چائے تیار کروں۔ میں نے سوچا ان کے سامنے دینی مسائل بیان کرنا محض وقت کا ضیاع ہے۔ میں نے چوہدری صاحب کو اشارہ کیا اور ہم وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گئے۔

چوہدری صاحب نے ایک گہری سانس لی اور پھر اپنے ہم زلفوں کے تموّل اور وسیع کاروبار اور شاندار طرز زندگی کا تذکرہ شروع کر دیا۔ بے تحاشہ دولت اور ماڈرن ٹائپ سالیوں کا ذکر کرتے ہوئے چوہدری صاحب کے لہجے میں محرومیت کا احساس واضح طور پر نظر آ رہا تھا اس کے ساتھ ہی میرے اندر کے روحانی معالج اور وجدان نے الارم دے دیا کہ چوہدری صاحب احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ آپ یقین کریں چوہدری صاحب کی تمام کیفیات جو ان پر طاری ہوئی تھیں سب احساسِ کمتری کا نتیجہ تھیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب میں نے انہیں اپنے مخصوص ہنڈرز میں مختلف روحانی مرحلوں سے گزارا؛ تو محض ہفتوں کی محنت سے وہ نارمل زندگی کی طرف پلٹ آئے۔ آج کل چوہدری صاحب اربوں کے مالک ہیں کیونکہ ان کی زمینیں جو شہر کے قریب تھیں انتہائی مہنگے داموں بکیں۔ پندرہ ایکڑ زمین پر بہترین ٹاؤن بنایا گیا اس کی آمدنی سے تین سو ایکڑ زمین شہر سے دور دیہاتی علاقے میں مزید خریدی گئی۔ ان کا لڑکا لندن میں اپنے ذاتی کاروبار کا مالک ہے۔

احساس کمتری کا روحانی علاج

طبیب روحانی و جسمانی سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد مبارک ذہن میں ہمیشہ رکھیں۔ مفہوم یہ ہے کہ اپنے سے اوپر کے لوگوں کی طرف مت دیکھیں بلکہ اپنے سے نیچے والے لوگوں کی طرف دیکھیں۔

ایک سبق آموز حکایت

شیخ سعدیؒ سفر کے دوران جوتوں سے محروم ہو گئے۔ دل میں احساس محرومی پیدا ہوا۔ فرماتے ہیں جب میں کوفہ کی مسجد میں جانے کے لئے چلا تو مسجد کے دروازے میں ایک شخص کو دیکھا جو دونوں پاؤں سے محروم تھا، میرے دل کو سکون مل گیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ جوتے تو اور بھی مل جائیں گے اللہ کی کتنی بڑی مہربانی ہے کہ میرے پاؤں تو ہیں جن سے میں چل پھر سکتا ہوں۔

الیکٹرانک میڈیا اور عامل

علی ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخش کے حالیہ عرس کے موقع پر نجی ٹی وی پر ایک پروگرام چل رہا تھا جس میں ایک مولوی ٹائپ عامل جس کے ساتھ ایک بے پردہ جوان لڑکی ناظرین و سامعین کی فون کالز وصول کر رہی تھی اور ان کے مسائل عامل کو بتاتی جا رہی تھی۔ عامل صاحب بے دھڑک جھوٹ بولتے چلے جا رہے تھے اور ہر سائل کو یہی کہتے تھے کہ آپ پر سفلی عمل کیا گیا ہے۔ پروگرام کے بعد سکرین پر موجود نمبر نوٹ کر لیں اور مجھ سے رابطہ کریں۔ آپ کو وظائف بتا دیئے جائیں گے۔ کسی کسی کو وقتی طور پر بھی کچھ عمل بتا رہے تھے۔ کالز کے وقفے کے دوران اولیاء اللہ کی کرامتیں بھی بیان کرتے، کبھی قرآن حکیم کی تلاوت میں مصروف ہو جاتے۔ مشکلات و مصائب کا ایک حل انہوں نے یہ بھی بتایا کہ داتا صاحب کے در پر حاضری دیا کرو میرا دعویٰ ہے کہ تمام پاکستان عموماً اور لاہوریو، خصوصاً تم داتا کے ٹکڑوں پر پل رہے ہو۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، ایک انسان کے بس سے باہر ہے کہ مخلوق کے رزق کا انتظام کر سکے۔ موصوف واضح طور پر لوگوں کے ایمان و عقائد سے کھیل رہے تھے۔ شاید ان کے سامنے قرآن حکیم کا یہ فرمان نہیں تھا۔

ترجمہ: اور نہیں کوئی چلنے والا بیچ زمین کے مگر اوپر اللہ کے ہے رزق اس کا اور جانتا ہے جگہ قرار اس کی اور جگہ سونپنے اس کے کی ہر ایک بیچ کتاب بیان کرنے والی کے ہے۔ (سورہ ہود آیت 6)

دیکھیں صاحب، عملیات کے نام پر لوگوں کے مال اور ایمان پر کس سینہ زوری سے ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔ ٹی وی چینل کے مالکوں سے میری گزارش ہو گی

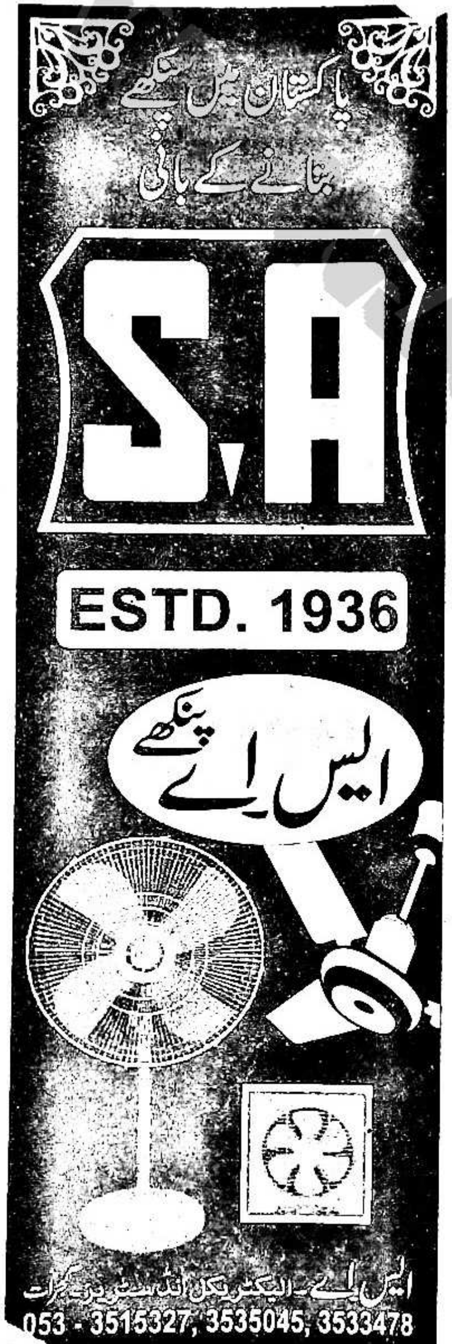

کہ خدارا! چند ٹکوں کی خاطر لوگوں کے مال و ایمان سے مت کھیلو اور ان بنگالی بابوں اور جادوگروں کی تشہیر کا ذریعہ نہ بنو۔ جو دھڑلے سے دعوے کرتے پھرتے ہیں کہ ہمارے جادو کا توڑ کرنے والے کو مبلغ پچاس لاکھ روپیہ انعام دیا جائے گا۔ یاد رکھیں اس کفر کو پھیلانے میں آپ بھی ان کے حصہ دار ہوں گے اور خسران الدنیا والاخرۃ کا مصداق بنیں گے۔

جادو کے بداثرات

یہ بات تو طے شدہ ہے اور ثابت ہو چکی ہے کہ جادو ایک علم ہے اور اس کے اثرات انسانی جسم، کاروبار موت اور دوسرے امور پر پڑ سکتے ہیں۔ لہٰذا جادوگروں کی حوصلہ افزائی اور اس کام میں ان کی مدد کرنا گویا ان کے شیطانی کام میں شامل ہونا ہے اس لئے جو کوئی بھی دامے، درمے، سخنے کسی بھی طرح ان کی مدد کرے گا وہ اس گناہِ عظیم میں باقاعدہ حصہ دار ہو گا۔ اس علم کے ذریعے کوئی شخص بیمار بھی پڑ سکتا ہے جیسے اس کا جسم دوسری بیماریوں کا اثر قبول کرتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان ناچاقی ہوسکتی ہے جیسا کہ سورہ بقرہ آیت نمبر 102 میں بیان ہوا ہے۔ یا شوہر بیوی کے ساتھ تو رہے لیکن سالہا سال تک بیوی کے قریب نہیں جا سکتا۔ مخلص دوستوں میں علیحدگی ہوسکتی ہے۔ کسی شخص کی زبان بندی ہوسکتی ہے اس طور پر کہ بعض مخصوص مواقع پر بات نہ کر سکے اور زبان گنگ ہو کے رہ جائے۔ کوئی شخص بظاہر صحت مند ہو سارے کام سرانجام دے مگر مسحور ہونے کے باعث وقفے وقفے سے ضیق الصدر سانس میں تنگی اور دل میں گھٹن جیسی بیماریاں محسوس کرے، بعض لوگوں کے کاروبار تباہ ہو جاتے ہیں، دکانیں اور مکان ویران ہو جاتے ہیں کیونکہ جادوگر اپنے مؤکل شیطانوں کو وہاں بھیجتے ہیں جو جھگڑا اور ہنگامہ کرتے ہیں چنانچہ کوئی شخص ایسی دکانوں سے سودا خریدنے اور ایسے مکانوں میں رہنے بسنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور شاندار کاروبار اور مکان ویران ہو جاتے ہیں۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ جادو کے اثر سے کسی شخص کا ذہن مفلوج ہو جاتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے، قوتِ فیصلہ ختم ہو جاتی ہے وغیرہ۔

ایک چشم دید واقعہ

میں حافظ صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا (یاد رہے کہ حافظ صاحب سے میں نے عملیات سیکھے تھے وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، بہت سے احباب نے ان کا پتہ وغیرہ پوچھا ہے تو اس بارے میں عرض ہے کہ ان کے صاحبزادوں نے مجھے ان کا پتہ بتانے سے منع کیا ہوا ہے۔ عملیات کی دنیا میں معروف شخصیت تھے) ایک آدمی ان کے پاس آیا۔ ابھی وہ کچھ فاصلے پر تھا، اسے ایک مرد اور ایک عورت سہارا دے کر لا رہے تھے۔ وہ زور زور سے کراہ رہا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو حافظ صاحب فرمانے لگے۔ افضل غور سے دیکھو یہ آدمی مسحور ہے۔ پھر وہ ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ وہ آدمی رو بھی رہا تھا اور بار بار پانی مانگتا تھا اور سینے پر ہاتھ پھیر کر دہائی دے رہا تھا کہ ہائے میں جل گیا، مجھے آگ لگی ہوئی ہے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر حافظ صاحب سے گزارش کر رہا تھا کہ اللہ کے لئے کچھ کریں۔

حافظ صاحب نے مجھے اشارہ کیا کہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر مخصوص آیات کی تلاوت کرو۔ چنانچہ میں نے جلدی جلدی متعلقہ آیات کی تلاوت شروع کر دی۔ جب میں نے پوری آیات پڑھ لیں تو حافظ صاحب نے مجھے اشارہ کیا کہ اس پانی پر دو تین پھونکیں لگا دو۔ میں نے پانی پر دم کر دیا، دم شدہ پانی اس کے

بدن پر چھڑکا گیا تو کچھ ہی دیر بعد اسے افاقہ ہو گیا۔

حافظ صاحب نے ان سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ اسی شہر سے آئے ہیں۔ حافظ نے مزید چند باتیں پوچھیں اور ساتھ والے آدمی سے کہا کہ جلدی جلدی سواری کا بندوبست کر لیں، ہم اسی وقت تمہارے گھر جانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سواری ہمارے پاس موجود ہے، ہم باہر آئے اور تانگے پر سوار ہو گئے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا، ہم جلد ہی ان کے گھر پہنچ گئے۔ حافظ صاحب جلدی سے ایک کمرے میں داخل ہوئے جو رہائشی کمرہ نہیں تھا بطور سٹور استعمال ہوتا تھا، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ کمرے سے گوشت کے جلنے کی ناگوار بو محسوس ہو رہی تھی۔ حافظ صاحب ذرا آگے بڑھے تو ان کے ہاتھ میں لوہے کی پتلی سلاخ تھی جس میں بکرے کا دل پرویا ہوا تھا اور اسے آگ لگی ہوئی تھی۔ حافظ صاحب باہر صحن کی طرف آئے اور ہینڈ پمپ چلا کر دل کو پانی کی بالٹی میں ڈال دیا۔ معاً آگ بجھ گئی لیکن دھواں ابھی اٹھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مریض کی کراہیں بالکل بند ہو گئیں۔ وہ حافظ صاحب کے قدموں سے لپٹ گیا اور لجاجت سے کہنے لگا۔ حافظ صاحب میرے دل کی آگ بجھ گئی ہے۔

حافظ صاحب نے بعد میں مجھے بتایا کہ اگر پورا دل جل جاتا تو لڑکے کی موت واقع ہو جاتی۔ چونکہ یہ کیس انتہائی حیران کن، ظالمانہ اور شاذ تھا کہ میں خود بہت زیادہ متاثر ہوا چنانچہ میں نے کرید کرید کر حافظ صاحب سے مختلف سوال کئے۔ انہوں نے میرے ہر سوال کا خندہ پیشانی سے جواب دیا اور جب میں نے یہ سوال کیا کہ آپ کو کیسے پتہ چل گیا یہ تو ایک قسم کا غیب کی بات پر مطلع ہو جانا ہے۔

حافظ صاحب مسکرائے اور کہنے لگے۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن یہ یاد رکھو کہ غیب کا جاننا کسی انسان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ خاصہ خداوندی ہے دراصل جنات میں بھی انسانوں کی طرح مخلص، ایماندار اور ہمدرد ہوتے ہیں۔ مجھے بھی ایک جن نے سرگوشی کی تھی اور صورت حال سے مطلع کیا تھا''۔

''لیکن حافظ صاحب میرا سوال ابھی برقرار ہے''۔ میں نے کہا۔

''ہاں، کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' حافظ صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے کہا جناب جن کو کیسے پتہ چل گیا؟

''ہاں، یہ بات سمجھنے والی ہے۔ دیکھو ایسا کرنے والا بھی جن تھا تو جس طرح ہم میں سے اگر کوئی غلط کام کرے اور دوسرا آدمی اسے دیکھ لے یا کسی اور واسطے سے اس کے غلط کام پر مطلع ہو جائے تو وہ از راہِ ہمدردی کسی ایسے انسان کو بتا دیتا ہے جو اس غلط کار کو روک سکتا ہے یا اس کے شر سے دوسرے آدمی کو بچا لیتا ہے۔ تو اس نیک جن نے مجھے ساری صورتِ حال بتا دی اور یوں یہ خطرناک کیس بخیر وخوبی حل ہو گیا۔

''ہاں، یہ تو ہے''۔ میں نے بات کو سمجھتے ہوئے تفہیمی انداز میں کہا۔

علم نجوم بھی جادو کی ہی ایک قسم ہے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے۔ ترجمہ: جس شخص نے نجوم کے بارے میں کچھ بھی علم حاصل کیا اس نے جادو کا ایک حصہ حاصل کیا، جتنا زیادہ علم نجوم سیکھے گا گویا اتنا ہی زیادہ وہ جادو سیکھنے کے مترادف ہو گا۔

ابو داؤد کتاب الطب، باب فی النجوم حدیث نمبر 3905۔ ابن ماجہ کتاب الادب حدیث نمبر 3766 اور صحیح کیا اس

کونوویؒ نے ریاض الصالحین میں اور ذہبیؒ نے کبائر میں اور ابن تیمیہؒ نے مجموع الفتاویٰ میں کہا کہ اس حدیث کی اسناد صحیح ہیں اور ابن مفلحؒ نے آداب الشرعیہ میں دیکھیں جلد تین صفحہ 434 اور محمد بن عبدالوہاب نے بھی اسے صحیح کہا۔ البانیؒ نے بھی اسی طرح کہا صحیح الجامع میں، وغیرہ۔

علم نجوم پر مختصر بحث

سورج، چاند اور ستارے دیگر مخلوقات کی طرح اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے اجرام فلکی ہیں اور چیزوں کی طرح انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے خاص مقاصد کے لئے پیدا فرمایا ہے مثلاً مختلف ستاروں کی مدد سے سمت اور وقت کا تعین کیا جاتا ہے۔ سورج سے روشنی اور حرارت حاصل کی جاتی ہے۔ چاند کے ذریعے بھی وقت اور تاریخ کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں سمندروں کے مد و جزر اور پھلوں کی مٹھاس وغیرہ میں دیگر عوامل کی طرح چاند بھی ایک مؤثر عامل بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اجرام فلکی سے آسمان کی زینت اور شیطانوں کو مار بھگانے کے لئے ہتھیار کا کام بھی لیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ازل ہی سے اجرام فلکی کی رفتار و حرکات کے ساتھ مندرجہ بالا چیزوں کو مربوط کر رکھا ہے۔

علم نجوم کی جائز صورت

انسان نے جب ان سیاروں اور ستاروں کی حرکات کا بغور مشاہدہ کرنا شروع کیا تو انہوں نے انسانی تاریخ کے آغاز ہی میں دن رات کا فرق، دنوں کی تقسیم، ماہ و سال کا اندازہ، سمتوں کا تعین، موسموں کی تقسیم وغیرہ جیسی بنیادی چیزوں کو معلوم کر لیا اور پھر جیسے جیسے ان فلکی اجرام کے گہرے مشاہدے کئے گئے ویسے ویسے انسان ان سے متعلقہ ایسی بہت سی چیزوں کا ادراک کرتا گیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے تخلیقی مقاصد میں شامل کر رکھا تھا اور بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و اذن ہی سے ممکن ہوا۔ ان معلومات کو علم فلکیات (Astronomy) علم ہیئت، علم نجوم وغیرہ ناموں سے موسوم کیا جاتا رہا۔ ایسے علوم اور تحقیقات جائز اور انسانی ضروریات میں سے ہیں۔

علم نجوم کی ناجائز صورت

پھر آہستہ آہستہ لوگوں نے ان اجرام فلکی کے ساتھ بہت سی ایسی چیزوں کو مربوط کرنا شروع کر دیا جن کا ان اجرام سے قطعی طور پر کوئی تعلق نہ تھا۔ مثلاً ان اجرام فلکی کی حرکات و رفتار کے ساتھ لوگوں کی قسمت کے فیصلے وابستہ کئے جانے لگے، انسانی زندگی میں عروج و زوال، صحت و بیماری، فقر و غنا، غمی و خوشی، کامیابی و ناکامی، فتح و شکست وغیرہ جیسی بہت سی چیزوں میں بھی ان اجرام کو قطعی مؤثر سمجھا جانے لگا۔ ان کی حرکات و گردش کے ساتھ غیب کے دعوے اور مستقبل کی خبریں دی جانے لگیں۔ پھر رفتہ رفتہ توہم پرست انسان نے اپنی زندگی کے ہر معاملہ کو دینی و مذہبی تعلیمات کی بجائے انہی اجرام سے وابستہ کر لیا اور نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ انہیں خدائی کا درجہ دیا جانے لگا اور ان کی پرستش کی جانے لگی۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر اجرام فلکی کی پرستش سے منع کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

ترجمہ: دن اور رات اور سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ تم سورج کو سجدہ نہ کرو اور نہ چاند کو بلکہ سجدہ اس اللہ کے لئے کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے۔ اگر تم واقعی اللہ کی عبادت کرنا چاہتے

ہو۔ (سورہ حٰم سجدہ آیت 37)

کواکب پرستی کی ایک مثال

دیکھیں انگریزی زبان میں ہفتہ کے دنوں کے نام انہی اجرام فلکی سے منسوب کر کے رکھے گئے ہیں۔ اتوار کو Sunday کہا جاتا ہے جس کا ترجمہ ہے "سورج کا دن"۔

سوموار کو Monday کہا جاتا ہے اس کا ترجمہ ہے چاند کا دن۔ گویا سورج کی طرح چاند کو بھی دیوتا تسلیم کیا گیا اور سوموار کو چاند کی طرف منسوب کیا گیا۔

منگل کو Tuesday ٹیوزڈے سے موسوم کیا گیا یعنی ٹیو دیوتا کا دن۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ٹیو دراصل مریخ سیارے کے دیوتا کا نام ہے۔

بدھ کو Wednesday وینس ڈے Weden دراصل عطارد سیارے کے دیوتا کا نام ہے جس کی طرف دن منسوب ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ Weden دیوتا کے ایک بیٹے کا نام Thor ہے جو رعد کا دیوتا تھا۔ اسے سیارہ مشتری کا دیوتا قرار دے کر اس کے نام سے جمعرات کو Thursday سے موسوم کیا جاتا ہے اور Weden کی بیوی کا نام فرگ (Frigg) تھا جو زہرہ سیارے کی دیوی تھی اسی مناسبت سے جمعہ کو Friday یعنی فرگ دیوی کا دن کہا جانے لگا۔ ہفتہ کو سیچر ڈے Saturday کہا جاتا ہے اور Satur دراصل زحل سیارے کا نام ہے اور یہی اس کا دیوتا ہے۔ چنانچہ اسی سیارے کی طرف ہفتہ کا دن منسوب کر دیا گیا۔

اسی طرح ہفتہ کے دنوں کو ہندوؤں نے بھی مختلف سیاروں کی طرف منسوب کیا ہوا ہے مثلاً اہل ہند زہرہ سیارے کو "شکر" کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے جمعہ کو شکروار سے موسوم کیا جاتا ہے اور زحل کو سنیچر نام سے پکارتے ہیں۔ اسی مناسبت سے ہفتہ کو سنیچروار سے پکارتے ہیں۔

اسی طرح انگریزی مہینوں کے نام بھی مختلف سیاروں کی طرف منسوب کر کے رکھے گئے مثلاً پہلا انگریزی مہینہ جنوری کہلاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ اہل مغرب کے معتقدات کے مطابق جینس نامی رومن دیوتا کی یاد تازہ کرتا ہے لہٰذا اسی دیوتا کی طرف اس مہینے کو منسوب کر دیا گیا۔

اسلام کی امتیازی خصوصیت

اوپر ذکر کی گئی تقویموں میں ہفتہ وار دنوں کے نام چونکہ دیوی، دیوتاؤں اور ستاروں، سیاروں کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے شرک کا پہلو نمایاں کرتے تھے اس لئے اسلام نے اپنے مزاج کے مطابق شرک کی بیخ کنی کرتے ہوئے ان دونوں کی نسبت کسی بھی مخلوق کی طرف کرنے کی بجائے محض عدد پر ان کی بنیاد رکھی تاکہ ان میں شرک کا شائبہ تک نہ ہو۔ اسلامی تقویم کے مطابق ہفتہ وار دنوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

یوم الجمعہ	(جمعہ)
یوم السبت	(ہفتہ)
یوم الاحد	(اتوار)
یوم الاثنین	(سوموار)
یوم الثلثاء	(منگل)
یوم الاربعاء	(بدھ)
یوم الخمیس	(جمعرات)

خوب غور فرمائیں، دیکھیں اسلام اس چیز کے قریب بھی نہیں پھٹکتا جو شرک کی راہ دکھائے۔ یاد رہے کہ ستاروں کو انسانی قسمت کے ساتھ مربوط سمجھنا

اسلامی نقطۂ نظر سے ایک شرکیہ عقیدہ ہے کیونکہ ستارے اس مقصد کے لئے پیدا ہی نہیں کئے گئے اور اس کی کوئی تک بھی نہیں بنتی کہ انسانی قسمت کو ستارے کے ساتھ منسلک کر دیا جائے جبکہ انسانی قسمت کا مالک صرف رب کائنات ہے۔ علامہ اقبالؒ خوب فرماتے ہیں:

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
کہ خود ہے وسعتِ افلاک میں وہ خوار وزبوں

ایک اور صاحب فرماتے ہیں:

چاند، ستاروں سے کیا پوچھوں کب دن میرے پھرتے ہیں
یہ تو بیچارے خود ہیں بھکاری مارے مارے پھرتے ہیں

اجرام فلکی کے تین بنیادی مقاصد

قرآن حکیم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو بنیادی طور پر تین مقاصد کے لئے پیدا فرمایا ہے:

(1) راستوں اور سمتوں کے تعین اور وقت معلوم کرنے کے لئے۔

(2) آسمان کی زیب وزینت کے لئے

(3) شیطانوں کو مار بھگانے کے لئے

فرمان باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: اور اسی ذات نے تمہارے لئے ستاروں کو پیدا فرمایا تاکہ تم ان کے ذریعے سے اندھیروں میں، خشکی میں اور دریا میں راستہ معلوم کرو۔ بلاشبہ ہم نے دلائل خوب کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں، ان لوگوں کے لئے جو فہم وشعور رکھتے ہیں۔

(سورہ انعام آیت 97)

ترجمہ: اور ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں سے آراستہ کیا۔ (سورۃ الصافات آیت 6)

ترجمہ: سورج اور چاند (مقررہ) حساب سے ہیں۔

ترجمہ: ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے آراستہ کیا اور حفاظت کی سرکش شیطان سے عالم بالا کے فرشتوں (کی باتوں) کو سننے کے لئے وہ کان بھی نہیں لگا سکتے بلکہ ہر طرف سے وہ مارے جاتے ہیں بھگانے کے لئے اور ان کے لئے دائمی عذاب ہے مگر جو کوئی ایک آدھی بات اچک کر لے بھاگے تو (فوراً) اس کے پیچھے دہکتا ہوا شعلہ لگ جاتا ہے۔

(سورۃ الصافات آیت 6 تا 10)

مختصر یہ کہ ستاروں اور دیگر اجرامِ فلکی کے تخلیقی مقاصد میں سے یہی ایک مقصد انسانوں کے لئے مختلف چیزوں کی معلومات کے لئے مفید اور جائز ہے اور یاد رہے کہ اس کا تعلق بھی علم ہیئت کی ان مختلف شاخوں سے ہے جن کے ذریعے ماہ وسال، اوقات کا تقرر، کیلنڈروں کی تیاری اور سمتوں کے تعین وغیرہ میں مدد اور فائدہ حاصل کیا جاتا ہے۔ جبکہ لوگوں کی تقدیر، کامیابی وناکامی، فتح وشکست وغیرہ جیسی غیبی اور مستقبل کی مخفی باتوں میں ان ستاروں اور سیاروں کا کوئی عمل دخل نہیں بلکہ ان معاملات میں انہیں مؤثر سمجھنا شرک ہے۔ مندرجہ بالا معاملات میں علم ہیئت میں جتنی بھی ترقی کی جائے ہرگز مذموم نہیں لیکن اگر ان ستاروں، سیاروں کو انسانی قسمت میں دخیل سمجھا جائے تو پھر اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ آپ کی تسلی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صرف ایک فرمان درج ذیل ہے۔

ترجمہ: حضرت زید بن خالد جہنیؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ میں ہم کو ایک صبح نماز پڑھائی اس رات بارش ہوئی تھی۔ نماز کے بعد آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: معلوم ہے تمہارے رب نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ خوب جانتے ہیں۔ آپ

نے فرمایا کہ پروردگار نے فرمایا ہے آج میرے دو طرح کے بندوں نے صبح کی ایک مومن ہیں اور ایک کافر۔ جس نے کہا کہ اللہ کے فضل ورحم سے بارش ہوئی وہ تو مجھ پر ایمان لایا اور ستاروں کا منکر ہوا اور جس نے کہا فلاں ستارے کے فلاں جگہ آنے سے بارش ہوئی تو اس نے میرا کفر کیا اور وہ ستاروں پر ایمان لایا۔

(بخاری کتاب الاذان حدیث 846-1038، مسلم کتاب الایمان حدیث 71، احمد حدیث 117)

لیکن آج کل مسلمان بے دھڑک نجومیوں اور جوتشیوں کے پاس جاتے اور ان سے قسمت کا حال اور کامیابی وناکامی اور دوسرے مسائل میں مشورہ کرتے ہیں پھر وہ انہیں لایعنی باتوں کی طرف لگا دیتے ہیں جو صرف مضحکہ خیز ہی کہی جا سکتی ہیں۔ مثلاً ہم برج اسد تاریخ 24 جولائی تا 23 اگست کے متعلق علم نجوم کا حساب پیش کرتے ہیں۔ اس برج سے منسوب اشخاص کے لئے موافق رنگ سرخ، سبز اور نارنجی ہے۔ موافق نگینہ ہیرا اور لعل، خوش بختی کا ہندسہ 1، 4 اور 11۔ مبارک دن اتوار۔ نیز ان تاریخوں کے درمیان پیدا ہونے والے بچوں کے نام کے ابتدائی حروف ٹ اور م ہونا چاہئیں۔

برادو کرام! مجھے بتایا جائے کہ یہ قیاسی باتیں اور مفروضے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں مسلمانوں کو کہاں سے کہاں لے جا رہے ہیں۔ کیونکہ علم نجوم کی بنیاد نہ شرعی تعلیمات پر ہے، نہ قطعی حقائق پر اور نہ ہی مشاہدات وتجربات پر بلکہ اس میں محض انکل پچو اور بے تکی قیاس آرائیوں ہی سے کام لیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں کسی بھی نجومی کے پاس اس سوال کا جواب ہرگز نہیں ہوگا کہ اگر دو یا دو سے زیادہ بچے ایک ہی وقت میں پیدا ہوں تو علم نجوم کے حساب سے ان کی قسمت بالکل ایک سی ہونی چاہئے مگر سب کو معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوتا حتیٰ کہ دو جڑواں بھائیوں کی قسمت بھی ایک سی نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود اگر کوئی شخص ستاروں کو انسانی قسمت میں دخیل سمجھتا اور ان فضولیات پر یقین رکھتا ہے تو اس بے وقوف پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

ایک نجومی کو پیشگوئی

برج حمل (21 مارچ تا 21 اپریل) کے پس منظر میں ایک نجومی اس طرح پیشگوئی کرتا ہے:

کسی جذباتی لغزش کے باعث رسوائی کا اندیشہ ہے، محتاط رہیں۔ سفر کے حسب منشا نتائج حاصل ہو سکیں گے۔ کاروباری پوزیشن قدرے غیر مستحکم رہے گی۔ خاندان کے بزرگوں سے وابستہ توقعات پوری ہونے کا امکان نہیں ہے۔ گھریلو ماحول خوشگوار رہے گا۔ ٹریفک قوانین پر سختی سے عمل کریں۔ اس ہفتے کا موافق عدد چار ہے۔

جنابِ من! عدل وانصف کے ساتھ برج حمل کے پس منظر میں اس پیشگوئی کا ملک بھر کے دیگر نام نہاد نجومیوں کے برج حمل سے متعلقہ اسی سال کی پیشگوئیوں سے تقابل کریں تو عجیب اتفاق ہوگا کہ کسی ایک نجومی کی پیشگوئی بھی دوسرے سے میل نہیں کھاتی۔ تمام نجومیوں کی تضاد بیانیاں بیان کرنا تو ایک تفصیل طلب کام ہے اس وقت مندرجہ بالا پیشگوئی میں تضاد بیانیوں پر تھوڑی سی بحث کر لیتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی۔ اس پیشگوئی میں نجومی نے نفع ونقصان دونوں پہلوؤں کو ایک ساتھ بیان کیا ہے حالانکہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہر انسان کو نفع یا نقصان دونوں صورتوں سے ہر وقت کسی نہ کسی شکل میں ضرور واسطہ پڑتا ہے۔ اب اس پیشگوئی میں ایک طرف یہ ہے کہ "کسی جذباتی لغزش کے باعث رسوائی کا اندیشہ ہے" اور

دوسری طرف اس کے برعکس یہ دعویٰ بھی ہے کہ ''گھریلو ماحول خوشگوار رہے گا'' حالانکہ یہ دونوں صورتیں متضاد ہیں اس لئے کہ اگر کسی انسان کی معاشرے میں عزت ہی نہ رہے اور اسے ہر سُو رسوائی کا سامنا رہے تو اس کا گھریلو ماحول خوشگوار کیسے رہ سکتا ہے؟

اسی طرح ایک طرف تو پیشگوئی کی جارہی ہے کہ ''سفر کے حسب منشا نتائج حاصل ہوسکیں گے'' اور دوسری طرف یہ بھی اطلاع ہے کہ ''کاروباری پوزیشن قدرے غیر مستحکم رہے گی'' اس میں تضاد یہ ہے کہ ایک طرف سفر کی کامیابی کا دعویٰ ہے اور وہ سفر کاروبار کی غرض سے بھی ہوسکتا ہے اور کاروبار میں نفع ہی بنیادی طور پر مطلوب ہوتا ہے یعنی اس پیشگوئی کے مطابق نفع ضرور حاصل ہوگا اور دوسری طرف نقصان کا اندیشہ اس میں اس طرح سے کر دیا گیا کہ ''کاروباری پوزیشن قدرے غیر مستحکم رہے گی'' اور غیر مستحکم کا معنی ہے کہ نقصان ہوگا۔ اب خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ ایک طرف فائدے کا اشارہ ہے اور ساتھ ہی نقصان کا اندیشہ بھی ذکر کردیا گیا ہے۔ ظاہر ہے نفع ونقصان سے ایک پہلو تو ضرور سامنے آء گا اور جو پہلو بھی سامنے آئے گا اسے بنیاد بنا کر یہ نجومی اپنے آپ کو سچا منوانے کی کوشش کریں گے۔

یہ پیشگوئی کہ ''سفر کے حسب منشاء نتائج حاصل ہوں گے'' اس میں ایک اور چالاکی ہے کہ یہاں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ اس سفر سے مراد کون سا سفر ہے؟ تعلیمی، تجارتی، تفریحی یا کوئی اور سفر؟ یہ وضاحت اس لئے نہیں کی گئی کہ مذکورہ سفروں میں سے اگر کسی میں نقصان ہو یا مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوسکیں تو ایسی صورت میں اپنی حقیقت اور کذب بیانی کو چھپانے کے لئے کم از کم نجومی صاحب یہ تو کہہ سکیں گے کہ اس سفر سے میری مراد تفریحی سفر تھا جبکہ آپ نے تجارتی سفر کیا ہے لہٰذا میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں اور اس کے برعکس اگر آپ نے تفریحی سفر میں نقصان اٹھایا ہے تو نجومی کے پاس یہ جواب تیار ہوگا کہ کامیابی کی امید تو اس سفر میں تھی جو تفریح کے علاوہ ہوتا۔ اس طرح یہ پیشگوئی کہ ''کاروباری پوزیشن قدرے غیر مستحکم رہے گی'' اس پیشگوئی میں لفظ ''قدرے'' قابلِ غور ہے یعنی نہ تو واضح طور پر نقصان کی پیشگوئی ہے نہ ہی نفع کی۔ اب اگر نجومی کے گاہک کو کاروبار میں بالفرض نقصان پہنچ جائے تو اس کا ایسے نجومی پر یقین واعتماد بڑھ جائے گا اور اگر اسے کاروبار میں نفع ہو تو اس کی بھی اس عبارت میں گنجائش موجود ہے کیونکہ ''قدرے غیر مستحکم کاروبار'' کا واضح طور پر نفع یا نقصان سے کوئی تعلق نہیں۔

قارئین کرام! آپ یقین جانیں کہ نجومیوں کی پیشگوئیوں میں تقریباً اس طرح کی دھوکے بازیاں، چالاکیاں اور فریب کاریاں پنہاں ہوتی ہیں جنہیں ذرا سے غور وفکر سے بہ خوبی سمجھا جا سکتا ہے مگر افسوس کہ ہمارے سادہ لوح عوام اس طرف مطلق توجہ نہیں دیتے اور نجومیوں کی پیدا کردہ گمراہیاں دن بدن بڑھتی جارہی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہی گمراہیوں کے انسداد کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان نجومیوں، کاہنوں وغیرہ کے پاس جانے ہی سے روک دیا تاکہ لوگ ان سے متاثر ہوکر راہِ ہدایت سے بھٹک نہ جائیں۔

بہرحال علم نجوم کوئی تحقیقی علم نہیں جس کی بنیاد حقائق (Facts and Figures) پر ہو۔ نہ ہی کوئی سائنسی علم ہے جس کی بنیا مشاہدات وتجربات پر ہو بلکہ علم نجوم ایک قیاسی علم اور توہماتی بات ہے۔ جس کی بنیاد ظن وتخمین اور اٹکل پچو پر ہے (جس کی کوئی حقیقت نہیں)۔ (تلخیص از جنات کا پوسٹ مارٹم بتغیر یسیر)

(یہ بصیرت افروز سلسلہ جاری ہے)

◆*◆

ماہنامہ حکایت لاہور

فروری 2016ء کا شمارہ

قیمت: 120 روپے

سالنامہ

اپنی سابقہ روایات کے ساتھ شائع ہوگا

یہ خاص نمبر قارئین کی تحریروں سے ترتیب دیا جائے گا۔

- اپنی پسند کا کوئی مضمون
- آپ بیتی
- یادگار واقعہ
- ناقابل فراموش
- پاک بھارت جنگ
- جرم وسزا
- شکاریات
- دین اسلام وغیرہ
- کشمیر کی جنگ آزادی
- جگ بیتی
- سچی کہانی
- افسانہ
- مہم جوئی

اپنی تحریریں 30 دسمبر تک ارسال کردیں۔ صرف وہی تحریریں ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں واپس بھیجی جائیں گی جن کے ساتھ واپسی ڈاک ٹکٹ ہوں گے۔

ماہنامہ حکایت 26-پٹیالہ گراؤنڈ لاہور

ساز سے سوزِ دروں (ناول)

تبصرہ کتب

تالیف: جنید ملی

قیمت: 550روپے

پبلشر: کمبائنڈ پبلشرز، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

پہلی بار ناول کا نام پڑھ کر لگتا ہے کہ یہ کوئی شعری مجموعہ ہے یا پھر فنِ موسیقی کی کتاب۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ٹائٹل پر ہی وضاحت سے لفظ ''ناول'' لکھ دیا گیا۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھا ناول کی پشت پر دیئے گئے اقتباسات پڑھ کر محسوس ہوا کہ ''در خورِ اعتنا'' ہے۔ ورق گردانی شروع کی تو پہلے ہی صفحے پر ٹھٹک جانا پڑا کیونکہ ''انتساب'' ایک چونکا دینے والی تحریر تھا۔ دوسرے صفحے سے ناول کا نام رکھنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی جو علامہ اقبالؒ کے ایک شعر

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

سے ماخوذ ہے۔

ناول کا ہیرو فرہاد ایک سٹینوگرافر ہے اور سارا ناول اس کی سرگزشت پر مبنی ہے۔ ناول کا آغاز فرہاد کی شہلا سے دس سال بعد اچانک ملاقات سے ہوتا ہے جو اس کی بچپن کی دوست ہے۔ غور کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ ناول کے آغاز کا زمانہ 1975ء کے لگ بھگ ہے اور پھر سٹوری آئندہ چالیس سال پر پھیلی ہوئی ہے۔

مرکزی کہانی کے ساتھ ساتھ کئی ذیلی کہانیاں بھی چلتی ہیں جو بذاتِ خود بہت دلچسپ ہیں۔ ناول شروع کرنے کے بعد اس سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ کہانیوں کے حالات، واقعات، کردار اور ماحول اتنے جاذبِ توجہ ہیں کہ قاری خود کو ناول کا ایک کردار محسوس کرنے لگتا ہے۔ گفتگو اور مکالمات خصوصی تذکرے کے مستحق ہیں۔ لگتا ہے مصنف نے ان کو بیان سے قبل، ان کے پس منظر پر بہت توجہ دی ہے۔

ناول کی Diction میں لسانی تنوع بھی بہت پُرلطف ہے۔ عربی، فارسی، اردو، انگلش، پنجابی، سرائیکی اور ہندی کے الفاظ، محاورات، اشعار اور کہاوتیں نہ صرف برمحل بلکہ بے ساختہ بھی لگتے ہیں اور یہ چیز اس ناول کو عام روش سے ممتاز کرتی ہے۔ خاص طور پر باب بیس تو قریباً سارا پنجابی زبان میں ہے جو عام اردو قاری کو مشکل میں ڈال سکتا ہے۔ شعری مواد کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ استاد دامن سے لے کر پروین شاکر تک اور فارسی اشعار سے فلمی نغموں تک بھی سامان ضیافتِ طبع کے لئے موجود ہے۔ متعدد اشعار کی بہت دل نشیں انداز میں پیروڈی کی گئی ہے۔ پورا ناول پڑھ کر فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مصنف کا اصل میدان شاعری ہے یا ناول نگاری۔

یہ ایک مقصدی اور اصلاحی ناول ہے جس کا مقصد گھریلو سے لے کر قومی سطح تک خواتین سے حسنِ سلوک کی ترغیب دینا ہے۔ چند ایک مقامات پر براہ راست وعظ و نصیحت بھی کی گئی ہے جسے ادب نگاری کے لحاظ سے مستحسن نہیں سمجھا جاتا۔ بہتر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ادب نگاری کرتے ہوئے جو کچھ پیش کیا جائے قاری خود اس سے جو چاہے نتیجہ اخذ کرے۔

اس دور میں جبکہ گھریلو ناچاقیوں اور ورک پلیسز (Work Places) پر خواتین کو تنگ کرنے کے واقعات عام ہیں۔ اس ناول کا مطالعہ صورتِ حال کو بہتر بنانے میں مدد دے سکتا ہے۔ میری رائے میں خواتین کے حقوق پر زور دینے والے افراد اور اداروں کو اس ناول کی ترویج و اشاعت میں ممد معاون ہونا چاہئے۔

اس ناول میں فلمی نغموں کے عنصر کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو یہ اس قابل ہے کہ مشرقی ذہن، روایات اور اقدار والے گھرانوں کی خواتین اور بچیوں کو بھی پڑھنے کے لئے دیا جا سکتا ہے۔

قیمت کچھ زیادہ ہے عام قاری کے ذوق کے پیشِ نظر قیمت کم ہونی چاہئے تھی۔

اندھیرے سے اُجالے تک

اشکِ ندامت

اس کو ساری دُنیا اسی میدان میں سمٹی نظر آنے لگی۔ وہ خوب صورت غلاف میں باپردہ کمرہ اس وقت اسے دُنیا کی سب سے مقدس ترین تصویر لگ رہا تھا۔ بارش کی بوندیں اس کی خشک جلد کو سیراب کر رہی تھیں۔ وہ اسی مستی میں سرشار ''لبیک، لبیک'' کے نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ میزابِ رحمت کے قریب پہنچا۔

قسط: 4

☆ رمیز احمد
0331-5178929

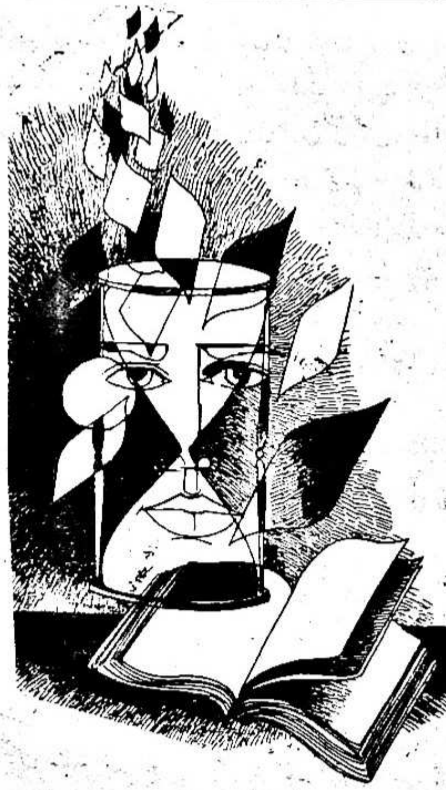

خواہش

جاذب سفید بستر پر پشت دیوار سے لگائے ہسپتال کے وارڈ میں بیٹھا تھا۔ وہاں جتنے لوگ تھے، سب ہی اپنی زندگی کے دن گن رہے تھے۔ کیونکہ ان سب کے پاس گنے چنے دن ہی بچے تھے۔

یہ ایک ٹرسٹ ہسپتال تھا۔

جاذب کی کچھ تھراپیز Therapies ہو رہی تھیں۔ وہ ابھی لیب سے فارغ ہوا تھا۔ اس کے ذہن کی ڈوریں ابھی تک اُلجھی ہوئی تھیں۔ وہ یہ سوچتا تھا کہ اس نے کیا قصور کیا ہے جو اس کے ساتھ یہ سب ہوا......؟

آج وارڈ میں معمول سے کچھ زیادہ صفائی ستھرائی ہو رہی تھی۔ جاذب نے ایک نرس سے پوچھا۔

''آج کوئی خاص دن ہے کیا......؟''

نرس نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔

''حکومت کے کوئی بڑے عہدہ دار آ رہے ہیں۔ ان کی طرف سے زیادہ فنڈ مل سکے، اس لئے ہمیں سولی پر چڑھایا ہوا ہے۔''

جاذب کو اس کا لہجہ آری کی طرح کاٹنے والا لگا۔ جاذب نے پھر سوال کیا۔

''آپ تو اپنی ڈیوٹی ہی کر رہی ہیں، پریشانی کیا ہے......؟''

نرس نے پھر آری چلائی۔

''وہ تو صرف اپنے ووٹ بڑھانے آ رہے ہیں یہاں، جو کچھ بھی دے کر جائیں گے، اس کو بڑھا چڑھا کر میڈیا پر بتایا جائے گا۔ لیکن جو میڈیا پر نہیں بتایا جائے گا، وہ سب تو ہمیں ہی برداشت کرنا ہوتا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ جاذب کو لگا اس سے زیادہ سوال کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس نے خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔ کچھ باتیں نہ جاننے میں ہی بھلائی ہوتی ہے۔ ایک وارڈ بوائے بھاگتا ہوا اندر آیا اور چلانے لگا۔

''سر آ گئے ہیں، سر آ گئے ہیں۔''

سب میں ایک لمحے کے لئے ہلچل ہوئی، پھر وہ سب بہت مصروف نظر آنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد ایک وفد کی صورت میں کچھ ڈاکٹر کچھ حکومتی عہدہ دار کے گارڈز اور وہ خود وارڈ میں داخل ہوئے۔ سب لوگ ان کو اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوش تھے۔ انہوں نے کچھ مخصوص مریضوں سے ملاقات بھی کی۔ کچھ وقت اس کام کو دینے کے بعد وہ کھڑے ہوگئے۔ ڈاکٹر انہیں بتا چکے تھے کہ یہاں جتنے بھی مریض ہیں، سب کو بہت مہلک بیماریاں لاحق ہیں جو لاعلاج ہیں۔ اس وفد کے ہر انسان کی آنکھوں میں ان کے لئے ترس واضح تھا۔

جاذب کو اپنے اوپر اس طرح کی آنکھیں تیروں کی طرح لگتی تھیں۔ وہ ان تیروں سے بچنے کے لئے ہی تو یہاں چھپ کر بیٹھا تھا۔

آخر وہ تھوڑی اونچی جگہ پر کھڑے ہوئے اور مریضوں کو متوجہ کر کے پہلے انہوں نے اپنا تفصیلی تعارف کروایا، پھر کہنے لگے۔

''میں اس بار ہسپتال کے فنڈ کے علاوہ ایک اور کام کرنا چاہتا ہوں۔''

سب لوگ مزید متوجہ ہوئے۔ ان میں سے کچھ مریضوں کو وہ ترس والی نگاہیں پھولوں کی طرح لگ رہی تھیں۔

غربت اَنا کی قاتل ہو سکتی ہے لیکن اگر غربت پر جہالت کے آسیب کا بسیرا ہو جائے تو اَنا کے فرشتے بھی واپس نہیں آتے۔

''میں چاہتا ہوں کہ اس ہال میں موجود ہر مریض کی ایک ایک خواہش میں پوری کروں۔ بس

ایک شرط ہے کہ اس خواہش کو پورا کرنے کی اجازت ان کو ڈاکٹر سے بھی لینی ہوگی۔''

جاذب کو لگا وہ ''ایک خواہش'' کی جگہ ''آخری خواہش'' بولنے لگے تھے۔ لیکن انہوں نے الفاظ تبدیل کر دیئے۔

سب لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جاذب کو یہ سب بہت عجیب لگا۔ لوگ اپنی اپنی خواہشات لکھوانے لگے۔ جاذب اپنے ملک کے غریب لوگوں کی خواہشات دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

کسی کو اپنے گھر میں صرف ایک نلکا چاہئے تھا، کسی نے اپنی ہی زمین کے کیس کی سنوائی کی خواہش کی۔ ان سب میں سے صرف ایک بزرگ نے فائدہ اُٹھایا تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں کے لئے جہیز مانگ لیا۔ کچھ دیر بعد جاذب کی باری آ گئی۔ ایک اٹینڈنٹ نے جاذب کے پاس آکر اس کی خواہش پوچھی۔

جاذب نے انکار کر دیا۔

''نہیں سر......! تھینکس......! میری کوئی خواہش نہیں ہے۔''

اس اٹینڈنٹ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''آپ واقعی اپنی کوئی خواہش پوری نہیں کرنا چاہتے......؟''

اٹینڈنٹ ایک دانا انسان لگ رہا تھا۔ جاذب نے پھر انکار کیا تو اس نے جاذب کو سمجھایا۔ وہ اس کی آنکھوں میں بہت کچھ پڑھ چکا تھا۔

''دیکھو بیٹا......! یہ پیسے آپ کے ہی حکومتی خزانے سے جائیں گے، کسی بھی عہدہ دار کی جیب سے نہیں۔ اگر آپ اس کو کسی کا احسان سمجھ کر ریجیکٹ کر رہے ہو تو یہ مت سمجھو، اس کو اپنا حق سمجھ کر استعمال کرو۔''

جاذب واقعی اسی وجہ سے کوئی چیز نہیں مانگ رہا تھا۔ یہ بات سننے کے بعد اس نے اپنے بچے کھچے ارمانوں کے کوزے میں غوطہ لگایا لیکن اس میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جس پر اس کا اب جی چاہے۔ آخر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

ہاں......! اس سے اچھا راہِ فرار کوئی نہیں۔

''میں World Tour کرنا چاہتا ہوں۔''

اٹینڈنٹ نے اس کی بات سنی تو کافی خوش ہوا لیکن ڈاکٹر سے مشورہ کرنا مناسب سمجھا۔ ایک ڈاکٹر کو اکیلے میں لے جا کر اس نے معاملہ بتایا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

''اگر آپ کہتے ہیں تو منع کر دیتا ہوں، ورنہ اس مریض کو تو ابھی تھراپی سے بھی کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ یہ جو کرنا چاہے، کر سکتا ہے۔''

اٹینڈنٹ نے ڈاکٹر کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور ڈاکٹر کو کوئی جواب دیئے بغیر ہی جاذب کی طرف چل پڑا۔ اس نے آکر جاذب کو خوش خبری سنائی کہ اس کی ریکویسٹ اپروو (Approve) ہو گئی ہے۔

جاذب نے مسکراہٹ دی۔ ایک فارم پُر کیا، اپنا نیا پتا بھی لکھ دیا، اپنے کالج کے ہاسٹل کو چھوڑ کر وہ اسی دن ایک پرائیویٹ ہاسٹل کے کمرے میں شفٹ ہو چکا تھا۔

اس نے کمرے میں جا کر سب کچھ سمیٹا اور اپنی پیکنگ کرنے لگا۔ وہ اب کچھ آزادی محسوس کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

جبار احمد ٹی وی لگا کر خبریں سننے میں مصروف تھے۔ شام کے وقت اکثر ان کا یہی معمول ہوتا۔ ان کو سیاست کی خبروں سے اتنا لگاؤ نہیں تھا، جتنا کھیلوں کی

خبروں سے تھا۔ اس چینل پر خبر چلنے لگی۔

''آج موجودہ حکومت کے ایک سربراہ نے ٹرسٹ ہسپتال کو کروڑوں کا فنڈ دیا اور اس ہسپتال میں جتنے مریض مہلک بیماریوں کی وجہ سے زندگی کے آخری کنارے پر تھے۔ ان سب کی ایک ایک خواہش پوری کرنے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں کی دُعائیں لیتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔''

اتنے میں کلثوم کام کرتے کرتے کمرے میں آگئی، انہوں نے بھی خبر سن لی تھی۔

''ہائے......! کتنے ثواب کا کام کیا ہے انہوں نے۔''

جبار کے ماتھے پر بل آئے۔ ٹی وی پر اب تفصیل سے وہی خبر سنائی جارہی تھی۔

''وہاں ایک مریض نے اپنی دو بیٹیوں کی شادی کے سارے اخراجات مانگ لئے اور ایک لڑکے......''

جبار نے چینل ہی بدل دیا۔ کلثوم سننا چاہ رہی تھیں۔

''سننے تو دیں نا کہ زندگی اتنی سی رہ جائے تو کس قسم کی خواہشات باقی رہتی ہیں......؟''

جبار نے دوبارہ وہ چینل نہیں لگایا۔

''یہ سب Publicity Stunts ہیں، سب ڈرامے بازی، صرف ایڈورٹائزمنٹ کے طریقے ہیں۔''

انہوں نے ہر چیز کو نظرانداز کیا اور کرکٹ لگا کر دیکھنا شروع کردیا۔ کلثوم بھی اپنے کام میں مصروف ہوگئیں۔

آزادی

یہ اسے ایک نئی دُنیا لگ رہی تھی۔ اونچی اونچی عمارات دیکھ کر وہ مرعوب ہونے لگا۔ ایئر پورٹ سے نکلتے ہی اسے لگا جیسے اس نے آج تک اندھیرے میں زندگی گزاری ہے۔ اصل دُنیا تو یہاں تھی۔

اس کو حکومت کی طرف سے ایک ویزٹنگ گروپ کے ساتھ ورلڈ ٹور پر بھیجا جا چکا تھا۔ ان سب کے ساتھ اس کی جہاز میں کافی اچھی گفتگو ہوئی۔ ان میں تین امیر زادوں سے تو اس کی دوستی بھی ہوگئی تھی۔

اس نے اپنے گھر یہ کہہ دیا کہ اس کے بہت Important امتحان شروع ہو رہے ہیں تو وہ کچھ عرصہ موبائل بند رکھے گا تا کہ وقت ضائع نہ ہو۔ اس بات پر جبار کو بہت خوشی ہوئی تھی کہ آخر ان کے بیٹے نے دل لگا کر پڑھنا شروع کر ہی دیا۔

وہ دُبئی میں ایک بہت خوب صورت ہوٹل میں رُکے تھے۔ اس کے پیکیج میں بہت سے تفریحی مقامات شامل تھے۔ ان کو دُبئی گھومنے کے لئے 15 دن کا وقت ملا۔

آج شام انہوں نے دُبئی مال (Dubai Mall) گھومنے کا ارادہ کیا۔ اس کے ساتھ آنے والے لوگ بہت خوش تھے۔ وہاں کی گہما گہمی اور رنگینیوں میں جاذب کو اپنی زندگی کی اصلیت بھولنے لگی۔ دُبئی مال میں دُنیا کی ہر چیز دیکھنے کے بعد وہ برج خلیفہ کے Top Flore کے لئے نکلے۔ جاذب اپنے گاؤں کے پہاڑ پر چڑھ کر نیچے دیکھا کرتا تھا، پر یہ اونچائی حد سے زیادہ تھی۔ ان کی لفٹ بادلوں میں جارہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ بادلوں سے بھی اوپر تھے۔ اسے اپنے آپ کو اتنا اونچا دیکھ کر بہت اچھا محسوس ہورہا تھا۔

اسے آج اندازہ ہوا کہ عقاب اتنا خوددار کیوں ہے......؟ اونچائی میں بھی ایک نشہ ہوتا ہے اور وہ اونچائی کے نشے میں ہی مست رہتا ہے۔ وہ بھی آج چڑیا کی طرح بارش سے بچنے کے لئے چھپنے کی جگہ نہیں ڈھونڈ رہا تھا بلکہ عقاب کی طرح بادلوں کو چیر کر اوپر جا رہا تھا۔ ان میں سے ایک کو Hight Phobia ہونے کے باوجود اس کے دوست اسے زبردستی لے کر جارہے تھے۔ اس لڑکے کے چہرے پر موجود خوف کو واضح دیکھا جا سکتا تھا، اور وہ اس شیشے کی لفٹ میں آنکھیں کھولنے کو تیار نہیں تھا۔

جاذب کی بھی ان تینوں لڑکوں سے اچھی دوستی ہوچکی تھی۔ اس نے فیضان کے کندھے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھا اور کہا۔

''فیضان......! میں نے تمہیں پکڑا ہوا ہے اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں گرنے نہیں دوں گا۔ مجھ پر یقین رکھو اور آہستہ آہستہ آنکھیں کھولو۔''

جاذب کی یہ بات سنتے ہی اس نے جاذب کا ہاتھ کندھے پر محسوس کیا اور اس کو مضبوطی سے پکڑ کر آنکھیں کھولنے لگا، پر اس کا بچپن کا خوف اتنے آرام سے نہیں جا سکتا تھا۔ جاذب نے اسے سمجھایا کہ یہ سب باتیں ہمارے دماغ کی بنائی ہوئی ہیں، اور ان کو ختم کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کو فیس کیا جائے۔

وہ آخر سب سے اوپر والی منزل پر پہنچ گئے۔ نیچے دیکھنے سے ایسا لگتا تھا جیسے یہ عمارت بادلوں پر تیر رہی ہو۔ وہاں اِنجوائے کرتے کرتے اس نے فیضان کا Phobia کافی حد تک ختم کردیا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ انہیں گھومتے گھومتے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ وقت کی تو یہ پرانی عادت ہے، جہاں انسان خوش ہو اور ان گھڑیوں کو قید کرنا چاہتا ہو، وہاں یہ خرگوش کی طرح پلک جھپکتے ہی گزر جاتا ہے، اور جس جگہ دُکھ ہو اور انسان چاہے کہ یہ جلدی گزرے، تو وہاں یہ کچھوا بن جاتا ہے، اور رینگتے ہوئے ہر قدم پر رُک کر منہ چڑھاتا ہے۔

وہاں اسی عمارت کے وسط میں Fountain Dance شروع ہوگیا۔ یہ ایک بہت ہی دلفریب منظر تھا۔ بہت سے اونچے اونچے فوارے ایک دُھن پر ناچ رہے تھے۔ جاذب اس دُنیا کے سحر میں گم ہونے لگا۔

''یہاں کی دُنیا کتنی خوب صورت ہے۔ کسی کو کوئی پریشانی نہیں۔ سب بس تفریح کر رہے ہیں۔''

وہ یہ سوچتے ہوئے لطف اندوز ہوتا رہا۔ آخر تھک ہار کر وہ ہوٹل پہنچے۔ سب نے تاش کھیلنا شروع کر دی۔ جاذب بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ انہوں نے اس کے پتے بانٹنا چاہے تو اس نے انکار کردیا۔

اس کو وہ کھیل نہیں آتا تھا۔ وہ ساتھ بیٹھ کر کچھ دیر دیکھتا رہا، پھر کچھ سمجھ آجانے کے بعد اس نے بھی حصہ لیا اور ایک رات میں اچھا خاصا کھلاڑی بن گیا۔

پوری رات وہ لوگ کھیلتے رہے۔ وہ لوگ سگریٹ بھی پی رہے تھے۔ جاذب زیادہ سگریٹ نہیں پیتا تھا، پر کبھی کبھی دوستوں میں بیٹھ کر ایک دو کش لگا لیا کرتا۔

وہ لوگ طلوعِ آفتاب کے بعد سوئے۔ جاذب کو بھی اتنی تھکن کے بعد بہت اچھی نیند آئی۔ شام کو وہ لوگ سفاری کے لئے گئے۔ ہمر (Hammar) کو صحرا میں بھگانا بھی ایک عجیب ہی تجربہ تھا۔ وہاں جا کر اندازہ ہوا کہ عامر ان سب میں اچھا ڈرائیور ہے۔ اب ان چاروں کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جاذب ان سے صرف چند دن پہلے ملا ہے۔ یہ سب تفریح ان کے وزٹ پیکیج میں شامل تھی۔

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ انہوں نے دُبئی کی ساری واضح جگہوں کی سیر کر لی۔ جاذب بہت خوش تھا۔ صرف جب وہ اکیلا ہوتا تو اسے تھوڑا ویرانہ محسوس ہوتا۔ باقی سب کچھ بہت اچھا جارہا تھا۔ ایک رات وہ سب بیٹھے تاش کھیل رہے تھے کہ عامر نے مشورہ دیا۔

"یار......! یہ تو سب کچھ پیکیج میں ہے۔ کیوں نہ کچھ پیکیج سے ہٹ کر کیا جائے......؟ ہم خود بھی تو پاکٹ منی لائے ہیں۔ کچھ حصہ دُبئی کی حسیناؤں کے نام ہی سہی۔"

سب نے خوشی سے ایک دوسرے کو تالی دی۔ جاذب مشکوک نظروں سے ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ عامر اس کے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہوئے بولا۔

"یار فیضان......! اس کو تُو ہی سمجھا۔ اب اس نے کیوں منہ بنا لیا ہے......؟"

فیضان نے جاذب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جاذب صاحب......! کیا ہوا ہے......؟ انجوائے کرنے آئے ہو تو پورا اِنجوائے تو کرو۔ یہ کیا بات ہوئی......؟"

اتنا کہتے ہوئے فیضان باقی سب کی طرف متوجہ ہوا۔

"ویسے اس سے ہم پوچھ کیوں رہے ہیں......؟ اس کا حصہ بھی میں ڈالتا ہوں، یہ چلے گا۔"

جاذب نے پیسوں کی بات سنی تو اَنا کا مسئلہ سمجھتے ہوئے جتنے پیسے احتیاطاً وہ اکٹھے کر کے لایا تھا، تھوڑے پاس رکھ کر سب انہیں دے دیئے۔

جاذب سارے رستے پریشان رہا کہ وہ کہاں جا رہا ہے......؟ وہ یہ سب کرنے تو نہیں آیا تھا۔ لیکن اب وہ نکل چکے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک کلب میں تھے۔

یہ جاذب کے لئے دوبارہ ایک اور نئی دُنیا تھی۔ وہاں پر موجود ہر انسان نشے میں چُور بس ناچنے میں مگن تھا۔ اس ملک میں اس نے بے حیائی تو ہر طرف دیکھی تھی۔ لیکن اس Under ground bar میں جو ہو رہا تھا، یہ بے حیائی سے کچھ آگے کا درجہ تھا۔

ان کے داخل ہوتے ہی انہیں شراب پیش کی گئی۔ جاذب نے انکار کیا، باقی تینوں نے ایک ایک گلاس اُٹھا لیا۔ انہوں نے جاذب کو انکار کرتے دیکھ کر دوبارہ ایک قہقہہ لگایا۔ جاذب کو بہت عجیب لگ رہا تھا۔ آخر وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ عامر نے کہا۔

"یار......! یہ Saphire ہے۔ واقعی تو نہیں پی سکے گا۔ تجھے Red Valvet منگوا دیتا ہوں۔ وہ Light ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے تیری پہلی بار ہے۔"

جاذب نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"نہیں یار......! میں شراب نہیں پی سکوں گا۔ مجھے وجہ نہیں معلوم، پر یہ ممکن نہیں میرے لئے۔"

انہوں نے اس کی بات نہیں سنی اور وہی شراب منگوا لی۔ وہ انکار کرتا رہا۔ وہ سب نشے میں تھے۔ کچھ دیر کوشش کے بعد وہ اسے چھوڑ کر خود پینے لگے۔ کچھ دیر ہی گزری تھی کہ عامر نے جیب سے سگریٹ نکالے اور ایک ایک سب کو دیا۔ جاذب پہلے ایک دفعہ انکار کر چکا تھا، اس بار وہ انکار نہ کر سکا۔

جاذب نے ایک کش لگایا تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ عام سگریٹ نہیں ہے، پر اب وہ اپنے دوستوں کو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ جاذب نے دو ہی کش لگائے تو اسے ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہوئی، پر نشہ بھی ہو رہا تھا۔ عامر نے بھاری لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھا بیٹا......! تجھے بھی یہ نشہ راس آ گیا۔ یہ صحیح جنت میں پہنچاتا ہے۔"

جاذب کچھ دیر میں اپنا سگریٹ ختم کر چکا تھا۔ اس کے ساتھ صوفے پر کچھ جگہ خالی تھی۔ وہاں پر ایک نیم برہنہ بار گرل آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

جاذب نشے میں تھا۔ اسے اپنے آس پاس اتنے انسانوں کی موجودگی میں بھی ہر چیز ویران لگی۔

جاذب نے مسکرا کر دوبارہ دیکھا تو وہ اس کے اور قریب ہوئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ مسکرائی، اس کے دائیں گال پر گڑھا نمودار ہوا اور مزید گہرا ہو گیا۔ جاذب کو کرنٹ لگا۔ گال کے گڑھے نے اسے شدت سے زینب کی یاد دلائی۔

چند لمحے کے لئے اس کا نشہ ٹوٹا۔ وہ نشے میں ہر چیز بھول سکتا تھا، پر یہ کیا یاد کروا دیا......؟

وہ اس لڑکی کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اُٹھا اور باہر کی طرف چل پڑا۔ سب نے اس کو آوازیں دیں، پر کسی میں اُٹھنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ باہر نکلا۔ سڑک پر چلتے ہوئے اسے اپنے قدموں میں لڑکھڑاہٹ محسوس ہوئی۔ اسے چکر آ رہے تھے۔ سامنے ایک بنچ پر وہ تقریباً گرتے ہوئے بیٹھا۔ وہ اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر تھپڑ مارے۔

"جاذب......! تجھے شرم نہیں آتی......؟ یہ تُو نے کیا کیا......؟ یہ کرنے آیا تھا تُو......؟"

وہ روتا جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اسی بنچ پر ایک ادھیڑ عمر شخص آ کر بیٹھ گیا۔ جاذب نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا۔ وہ پینٹ کوٹ میں کافی معتبر شخص لگ رہا تھا۔ جاذب نے پھر اپنے اوپر دھیان دینا شروع کر دیا۔ وہ شخص بولا۔

"بیٹا......! اس قدر پریشان نہ ہو۔ غلطیاں بھی انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔"

جاذب نے پھر اس کو دیکھا۔ اسے لگا کہ شاید اس شخص نے اسے اپنے آپ سے باتیں کرتے سن کر یہ اندازہ لگایا ہے۔ اس نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ وہ شخص جواب نہ پا کر دوبارہ بولا۔

"بیٹا......! سکون صرف ایک ہی راستے میں ہے۔ تم اسے اور کہیں تلاش نہیں کر سکتے۔ جہاں بھی جاؤ گے، بس وقتی خوشی پاؤ گے۔"

اس نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس آدمی نے ہمت نہیں ہاری۔

"انسان کا ظاہر اگر ضرورت سے زیادہ آباد ہو جائے تو باطن ویران ہونے لگ جاتا ہے۔"

اس شخص نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کی طرف چل پڑو، بہت فائدہ ہے۔ اپنی تلاش کو اتنا اوپر لے جاؤ کہ دُنیا کے حساب سے بڑی بڑی چیزیں تمہارے پیچھے رہ جائیں۔"

جاذب اس وقت اس طرح کی خلائی کہانیاں سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے بولنا مناسب سمجھا۔

"آپ کو پتا ہے، آپ جس سے بات کر رہے ہیں، وہ بلڈ کینسر کا مریض ہے......؟ اور موت کا فرشتہ اس کے سر پر کھڑا ہے......؟"

وہ آدمی مسکرایا۔

"اس بات سے ہی تو تم پر رشک آ رہا ہے۔ کوئی بھی عام انسان جب رستے پر چلتا ہے تو کبھی کبھی کئی سالوں کی محنت لمحوں میں ضائع ہو جاتی ہے۔ کبھی اس کی بیوی پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتی ہے، کبھی اولاد اس سے کچھ غلط کروا دیتی ہے، اور کبھی اس کو دُنیا اور دولت کی محبت زیر کر لیتی ہے، اور تم ان سب چیزوں سے آزاد ہو۔"

اسے لگا جیسے اس کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس شخص نے آواز لگائی۔

"بیٹا......! میرا نام عبدالرحمٰن ہے۔ کل شام چھ بجے میں تمہارا اسی بنچ پر انتظار کروں گا۔ تمہیں سوچنا چاہئے۔"

جاذب اب مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ذہن میں عہد کر لیا تھا کہ وہ یہاں سے دوبارہ گزرے گا بھی نہیں۔ وہ کلب کے باہر اپنے دوستوں کا

انتظار کرتا رہا۔

آخر وہ سب نشے میں دھت باہر آئے۔ اب وہ گھر پہنچ گیا تھا۔ اسے ہر چیز بہت ویران اور اُجڑی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ عبدالرحمٰن صاحب کی بات دماغ میں گونجی۔

"انسان کا ظاہر اگر ضرورت سے زیادہ آباد ہو جائے تو باطن ویران ہونے لگ جاتا ہے۔"

اس کے منہ سے نکلا۔

"یہ باطن کیا ہوتا ہے......؟"

وہ آج کے واقعے میں اُلجھ گیا تھا۔ وہ آزاد ہونے نکلا تھا اور یہاں ایک نئی قسم کی قید نے اسے جکڑ لیا تھا۔ وہ باتھ روم میں گیا اور شاور کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کون سی دُنیا ہے جہاں اس پر بھی رشک کیا جا سکتا ہے......؟ آخر وہ روتے روتے سو گیا۔

نور

"میں ایک ویران صحرا میں جا رہا تھا۔ صحرا میں بادلوں کی آوازیں آنے لگیں۔ آندھی کی وجہ سے ریت اُڑنے لگی۔ میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھا تاکہ ان میں ریت نہ جائے۔

آسمان پر بجلی کڑکنے لگی۔ میں نے آنکھوں سے ہاتھ اُٹھایا تو بجلی کے بار بار چمکنے سے آس پاس کا منظر نظر آنے لگا۔

وہ جگہ ویران نہیں تھی۔ وہاں بہت سے لوگ تھے۔ طوفان سے بے نیاز زندگی کی مستی میں گم۔ صرف مجھے وہ طوفان نظر آ رہا تھا۔ پھر مجھے اپنے آپ پر گندگی محسوس ہونے لگی۔ میں اپنے جسم سے وہ کالے رنگ کی عجیب سی غلاظت نوچ نوچ کر اُتار رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی کہ میں بھی اس ہجوم کا ایک حصہ ہوں جس کو خبر ہی نہیں کہ ایک طوفان بس ان تک پہنچنے کو ہے۔

میرے کانوں میں شیشے ٹوٹنے، ٹرین کا ہارن بجنے کی آوازیں، چیخوں اور گولیاں چلنے کی آوازوں کا ایک سیلاب تھا۔ میں ایک قرب سے گزر رہا تھا۔ ان آوازوں میں جب بادلوں کی گرج شامل ہوتی تو میرا خوف آسمان کو چھونے لگتا۔ کہیں کوئی تارا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

کچھ دیر میں بادل خاموش ہو گئے۔ وہ آوازیں غائب ہونے لگیں۔ میرے اندر سکون کی ایک لہر اُتری۔ سامنے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دیا جل رہا ہے۔ وہاں چلتی ہوئی ہوا دیے کو بجھانے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ میں اس کی طرف چلنے لگا۔

قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک ستون ہے، سفید رنگ کا آدھا ستون، اس پر ایک چراغ جل رہا ہے اور ساتھ ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ میں اس کے قریب ہاتھ لے کر جاتا ہوں۔

پر مجھے اپنے ہاتھ ناپاک لگتے ہیں اور میں اس کتاب کو چھونے کی ہمت نہیں کر پاتا۔

پھر ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آتا ہے اور اس خوب صورت کتاب کے صفحات کو پلٹنے لگتا ہے۔ میں اپنی بے بسی پر رونے لگتا ہوں کہ میں ہاتھ کیوں نہیں لگا سکتا......؟

صفحات رُکتے ہیں، میں غور سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس چراغ کی روشنی میں بس چند الفاظ ہی پڑھ پاتا ہوں۔ وہاں بہت سی آیات میں سے ایک آیت بہت روشن تھی۔

"فَاَیْنَ تَذْهَبُوْنَ o"

اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔"

جاذب ایک بار پھر عبدالرحمٰن صاحب کے پاس بیٹھا تھا اور ان کو رات کا خواب سنا رہا تھا۔ اب وہ روتے ہوئے کہنے لگا۔

"کیا میں اتنا ناپاک ہوں کہ میں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا قرآنِ پاک کو......؟ اور اس آیت کا کیا مطلب ہے......؟"

عبدالرحمٰن صاحب مسکرائے۔

"اس آیت کا مطلب ہے کہ تم کہاں جا رہے ہو......؟"

جاذب سوچ میں پڑ گیا۔

"میں کہاں جا رہا ہوں......؟ مجھے کہاں جانا چاہئے......؟ میری اس چھوٹی سی زندگی کا بھی کوئی مقصد ہو سکتا ہے......؟"

آخر اس نے کوشش کر کے بات شروع کی۔

"سر......! آپ کل کچھ بتا رہے تھے۔ اس کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے......؟"

عبدالرحمٰن صاحب کچھ سنجیدہ ہوئے۔

"بیٹا......! آپ کو کچھ نہیں کرنا۔ بس اپنے نفس کو صاف رکھنا ہے اور اللہ سے اس کا رستہ مانگنا ہے۔ آپ تو بہت خوش نصیب ہو کہ وہ آپ کو خود بلا رہا ہے اور دوسرے رستے پر جانے سے ڈرا رہا ہے۔ بس یہی مشورہ ہے کہ جتنا وقت آپ کے پاس ہے، اس کو رنگینیوں میں ضائع نہ کرو۔ لوٹ جاؤ پاکستان، مجھے یقین ہے اللہ رستہ دکھائے گا آپ کو۔"

عبدالرحمٰن صاحب کو اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ اسے کون سا رستہ چھوڑنا ہے اور جانا کس طرف ہے......؟ اس خواب نے جاذب کے دل پر بہت گہرا اثر چھوڑا تھا۔ جاذب ان کی باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ پھر کہنے لگا۔

"لیکن سر......! مجھے دُنیا گھومنے کا شوق ہے۔"

"ہاں......! آپ دُنیا گھوم سکتے ہو اس طریقے سے، پر جس طرف کا رستہ میں آپ کو بتا رہا ہوں، اس سے ایک ذرّے میں بھی پوری کائنات کو دیکھا جا سکتا ہے۔"

جاذب کو اس وقت ان کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں، پر وہ باتیں اس کا تجسس بڑھا رہی تھیں۔ وہ اب ان باتوں کو سمجھنا چاہ رہا تھا۔

اس کی جستجو بڑھ رہی تھی اور اب ان باتوں کو سمجھنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں فیصلہ کر لیا۔ وہ عبدالرحمٰن صاحب کو مل کر ہوٹل واپس آ گیا۔ اب وہ نم آنکھوں کے ساتھ موبائل پر بات کرنے میں معروف تھا۔

میزابِ رحمت

ہوا گنبدِ خضرا کی طرف کھینچ کر لے جا رہی تھی۔ وہ وہاں آہستہ چلنا چاہتا تو اسے ایسا لگتا کہ وہ تازہ ہوا اس کے کان میں سرگوشی کر رہی ہو:

"جن سے تم ملنے جا رہے ہو، وہ مدینہ جاتے ہوئے تیز چلتے تھے اور لمبے لمبے قدم رکھتے تھے۔"

یہ بات ذہن میں آتے ہی وہ لمبے لمبے قدم رکھنے لگتا۔ لیکن ایک خوف تھا یا شاید ندامت جو اسے روک رہی تھی۔

جاذب نے اس خواب کے بعد وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے اپنے گائیڈ کو فون کیا اور ریکویسٹ کی کہ آپ باقی ملکوں کا ٹور کینسل کر دیں اور مجھے عمرہ کروا کے پاکستان بھیج دیں۔ جاذب کو بہت بحث کرنا پڑی۔ آخر وہ مان گئے۔

کیونکہ حکومت اب میڈیا میں کوئی بات نہیں پہنچنے دینا چاہتی تھی۔ ویسے بھی تھوڑا سا پیپر ورک کرنے

کے بعد ان کو اس میں کافی سارے پیسے بچ رہے تھے۔

اب وہ مدینہ میں تھا۔ وہ ایک عمرہ کر چکا تھا، لیکن وہاں بھی وہ سہا سہا رہا۔ اس نے آخر یہ ہی سوچا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضے کی زیارت کرے گا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں اس کے مسئلے کو ضرور سنا جائے گا۔ وہاں پہنچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو رُک نہیں رہے تھے۔ وہ سنہری جالیوں کو دیکھ رہا تھا، پر ان کے پاس جا کر چھونے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ آخر وہ تھوڑی دُور ہی بیٹھ گیا۔ وہ دُعا کر رہا تھا۔

''میرے مولا......! مجھے اپنے رستے پر قبول فرما لے۔ مجھے نہیں پتا میں کس رستے کی بات کر رہا ہوں......؟ اور یہ رستہ کہاں سے شروع ہوتا ہے......؟ اس کی منزل کیا ہے......؟ میں نہیں جانتا مجھے کہاں جانا ہے......؟ پر میں پہنچنا چاہتا ہوں۔ بس مجھے دِکھا وہ چیز جس کی بات عبدالرحمن صاحب کر رہے تھے۔ مجھ سے تُو نے خواب کے ذریعے پوچھا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں......؟

یااللہ......! میں رُک گیا، میں واپس آ گیا، اب تو مجھے بتا کہ مجھے کہاں جانا چاہئے......؟ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ ہی بتایئے ناں، مجھے وہ رستہ......! آپ اللہ سے میری سفارش کیجئے کہ مجھے اپنے رستے پر چلنے والوں میں سے ایک کر دے۔''

اسے کچھ سکون محسوس ہونے لگا۔ روتے روتے اس کے سر میں درد ہو چکا تھا۔ اب وہ بہتر ہونے لگا۔ وہ آج سمجھ رہا تھا کہ دُعا کی قبولیت کی پہلی شرط یقین ہے۔

''یااللہ......! میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں۔ میری غلطیاں معاف فرما دے۔ اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے معاف کر دے مجھے۔''

وہ اپنی غلطی کے بعد اپنے آپ کو معاف کر ہی نہیں پا رہا تھا۔ سنہری جالیوں کے سامنے ہوتے ہوئے وہ ان کو چھونے کی ہمت نہیں اکٹھی کر پا رہا تھا۔ لیکن اب جب اس کو کچھ راحت کا احساس ہوا تھا تو اسے لگا کہ توبہ قبول ہو رہی ہے۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دوبارہ عمرے کے لئے جائے گا۔ اسے بہت خوشی ہو رہی تھی کہ وہ جکڑن ختم ہو گئی ہے۔

اگلے دن وہ پھر حرم میں موجود تھا۔ خانۂ کعبہ کو دیکھ کر اس کو بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ شرمندگی کا احساس کم ہو چکا تھا۔ آسمان پر بادل آنے لگے۔

اس نے طواف شروع کیا۔ ہر طرف ''لبیک، لبیک'' کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ وہ دل و جان سے حاضر تھا۔ حاضری کا مطلب کیا ہوتا ہے......؟ وہ اب سمجھ سکتا تھا۔

بارش کا ایک قطرہ اس کے کندھے پر گرا۔ اسے بہت سکون ملا۔ وہ بس اپنے آپ کو ''لبیک، لبیک'' میں گم ہوتا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے منہ سے آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

اس کو ساری دُنیا اسی میدان میں سمٹی نظر آنے لگی۔ وہ خوب صورت غلاف میں باپردہ کمرہ اس وقت اسے دُنیا کی سب سے مقدس ترین تصویر لگ رہا تھا۔ بارش کی بوندیں اس کی خشک جلد کو سیراب کر رہی تھیں۔ وہ اسی مستی میں سرشار ''لبیک، لبیک'' کے نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ میزابِ رحمت کے قریب پہنچا۔

بارش تیز ہوئی۔ اس رحمت کی آبشار سے پانی کا ایک خوب صورت دھارا اس کے اوپر گرا۔ اسے لگا کہ وہ اس کے اوپر گرنے کی بجائے اندر جذب ہو رہا ہو۔

وہ خواب والی کالی کالی غلاظت اسے اپنے اوپر سے ڈھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ سے اس کو اپنے وجود سے بھاری پن ختم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ شکر کے آنسو تھے۔ اس کے جسم کا ہر ذرّہ شکر میں مگن تھا۔ پھر اس کو دھکا لگا اور سب لوگ میزابِ رحمت کے نیچے کھڑے ہونے کے لئے ایک دوسرے کو ہٹانے لگے۔

جاذب آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اس کی دُعا قبول ہو گئی ہے۔

وعدہ

''بیٹا......! تم فریش ہونے کے لئے کالج کا چکر کیوں نہیں لگا آتے......؟''

معراج بابا نے اسے افسردہ دیکھا تو کہنے لگے، پر جاذب نے انکار کر دیا۔

''بابا جی......! میں کالج نہیں جا سکتا۔ میں ہر ایک کو جواب دے لوں گا، لیکن وہاں زینب بھی ہے۔ میں اس سے جھوٹ بول نہیں پاؤں گا اور سچ میں بولنا نہیں چاہتا۔''

معراج بابا اس کو کسی کام پر مجبور نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ پھر بولنے لگا۔

''آپ کو پتا ہے بابا جی......! میں اس کو اپنی محسوسات بتانے والا تھا۔ پتا نہیں کتنی بار میں خیالوں میں ڈائیلاگ تیار کر چکا تھا اور اس کے بہت سے مختلف Reactions بھی ذہن میں سوچ چکا تھا۔''

شروع کے دنوں میں وہ معراج بابا سے بالکل دوستوں کی طرح بات کرتا تھا۔ اس کو بچپن ہی سے بزرگوں سے باتیں کرنے اور ان کی زندگی کے تجربات سے سیکھنے کا شوق تھا۔ اب یہاں معراج بابا اس کو اپنی زندگی کے سارے واقعات سنایا کرتے تھے۔ اس لئے ان کے درمیان عزت کے ساتھ ساتھ دوستی کا رشتہ بھی قائم ہو گیا۔

''ہاں تو اسے جا کر بتا دو، کبھی نہ کبھی تو اسے پتا چلنا ہی ہے۔''

معراج بابا نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔ جاذب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''بابا جی......! پتا تو چلنا ہی ہے، پر میں نہیں چاہتا وہ میری زندگی میں میری وجہ سے پریشان ہو۔ آپ کو پتا ہے بابا جی......! وہ بہت نازک مزاج ہے۔ پریشانی اور دُکھ میں تو لوگ روتے ہی ہیں۔ وہ خوشی اور غصے میں بھی رو پڑتی ہے، اور میں اسے روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ آخری دفعہ اسے ہنستے ہوئے دیکھا تھا، وہی چہرہ اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں۔''

معراج بابا نے پھر سوال کیا۔

''یہ تو چلو مجھے سمجھ آ گئی کہ اس سے جتنا کم ملو گے، اتنی جلدی وہ آزاد ہو سکتی ہے۔ لیکن تم اپنے والد کو

قدر و قیمت

حضرت قائداعظم محمد جناح رحمتہ اللہ علیہ نے پنجاب مشین گن رجمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''الفاظ کی اتنی نہیں جتنی قدر و قیمت افعال کی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب پاکستان کے دفاع اور قوم کی سلامتی اور حفاظت کے لئے آپ کو بلایا جائے گا تو آپ اپنے اسلاف کی روایات کے مطابق شاندار کارناموں کا مظاہرہ کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ پاکستان کے ہلالی پرچم کو سربلند رکھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی عظیم قوم کی عزت و وقار کو برقرار رکھیں گے''۔

(15 اپریل 1948ء)

"کیوں نہیں بتاتے......؟"

جاذب کے پاس اس سوال کا جواب تو خود بھی نہیں تھا۔ وہ معراج بابا کو کیا بتاتا......؟ وہ بہت سوچتا تھا کہ وہ گھر چلا جائے اور اپنے والدین کے ساتھ رہے، پر وہ انہیں بتانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

"بابا جی......! یہ تو میں بھی نہیں جانتا، پر شاید اس کی وجہ وہ وعدہ ہے جو میں توڑ چکا ہوں۔ میرے بابا نے اس وعدے کے بعد مجھے بہت زیادہ خوشی سے گلے لگایا تھا۔ میں ان کی اس گرم جوشی کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ ایک ہی تو وقت تھا جب بابا کو میرے کسی کام نے خوشی دی تھی۔ میں ان کو یہ نہیں بتا سکتا کہ انہوں نے ایک غلط موقع پر خوشی محسوس کی تھی۔ میرے بابا اپنا خواب ٹوٹتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ میرے بعد جو کچھ بھی ہوگا، مجھے نہیں پتا، پر میں نہیں چاہتا کہ اپنی زندگی میں، میں ان کو ایک بھی دُکھ دوں۔ خوشی تو میں دے نہیں سکا۔"

یہ کہتے ہوئے جاذب کی آنکھ میں آنسو آگئے۔ معراج بابا یہ باتیں کہنا ضروری سمجھتے تھے لیکن پھر بھی انہیں لگا، ان کو یہ باتیں کسی اور طرح کرنی چاہیے تھیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چلو کوئی بات نہیں......! جیسے تمہاری مرضی ہے، ویسے ہی کرو۔ میں بھی تو تمہارے باپ کی ہی طرح ہوں۔"

وہ بھی نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دیا۔

اس کو اپنی ماں کی شدت سے یاد آ رہی تھی۔ کینسر کے بعد جب وہ گھر گیا تھا تو باقی سب کو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا، پر کلثوم نے کوئی گھڑی ایسی نہیں جانے دی جب پوچھا نہ ہو:

"بیٹا......! تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو......؟ مجھے بتاؤ، مجھے تمہارے ہر انداز سے خوف آ رہا ہے۔ جب کا تمہیں دیکھا ہے، میں سو نہیں پاتی۔ کوئی بھی پریشانی ہے بتا دو، اندر مت رکھو۔"

جاذب کو ان سے جھوٹ بولتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ آخر تھک ہار کر اس نے واپس آنے کا سوچا اور کالج کے کام کا بہانہ بنا کر واپس آگیا۔

اسے خود حیرانی تھی کہ وہ ٹوٹ کیوں نہیں رہا......؟ یہ کون سی طاقت ہے جس نے اسے اتنا مضبوط کر دیا ہے......؟ اس نے مشکل حالات کے فوائد پر بہت سے لوگوں کو لیکچر دیئے تھے، پر اب اسے صحیح معنوں میں اندازہ ہو رہا تھا کہ حالات کی پیچیدگی واقعی انسان کو مضبوط کرنے کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔

جاذب نے بابا جی سے اجازت لی۔ قلم اور ڈائری اُٹھا کر اپنے لگائے ہوئے پودوں میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ اب پنسل کو منہ میں ڈال کر کچھ سوچ رہا تھا۔ اب جب وہ قلم چلاتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ کوئی ماہر جوہری زیورات میں نگینے جڑ رہا ہو۔ اس نے ایک اور نگینہ جڑا۔

"اگر واقعی اللہ کو پانا ہے تو خواہش سے بے نیازی پہلی شرط ہے۔ بے نیاز ہو کر دیکھو، سب تمہارا ہو جائے گا۔ اب جو چیز بنی ہی تمہارے لئے ہے، وہ تم کو مل کر ہی رہنی ہے۔ خواہش کرو نہ کرو، وہ اپنے وقت پر ہی ملے گی۔ کہتے ہیں، اللہ کے عشق اور ہدایت کے علاوہ سب کچھ مانگے بغیر ملتا ہے۔ سو ہمارے مانگنے کی چیز تو ہے ہی صرف ایک، تو ہم کیوں اپنی طاقت صرف کرتے ہیں بے معنی خواہشات میں......؟ خواہش انتظار پیدا کرتی ہے اور انتظار موت سے بھی بدتر ہو سکتا ہے۔ بے نیازی بس انتظار ختم کرتی ہے، لیکن بے نیازی اور بے حسی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

(اگلے ماہ اس فکر انگیز سلسلے کی آخری قسط ملاحظہ فرمائیں)

★★★

"کیوں نہیں بتاتے......؟"

جاذب کے پاس اس سوال کا جواب تو خود بھی نہیں تھا۔ وہ معراج بابا کو کیا بتاتا......؟ وہ بہت سوچتا تھا کہ وہ گھر چلا جائے اور اپنے والدین کے ساتھ رہے، پر وہ انہیں بتانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

"بابا جی......! یہ تو میں بھی نہیں جانتا، پر شاید اس کی وجہ وہ وعدہ ہے جو میں توڑ چکا ہوں۔ میرے بابا نے اس وعدے کے بعد مجھے بہت زیادہ خوشی سے گلے لگایا تھا۔ میں ان کی اس گرم جوشی کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ ایک ہی تو وقت تھا جب بابا کو میرے کسی کام نے خوشی دی تھی۔ میں ان کو یہ نہیں بتا سکتا کہ انہوں نے ایک غلط موقع پر خوشی محسوس کی تھی۔ میرے بابا اپنا خواب ٹوٹتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ میرے بعد جو کچھ بھی ہوگا، مجھے نہیں پتا، پر میں نہیں چاہتا کہ اپنی زندگی میں، میں ان کو ایک بھی دُکھ دوں۔ خوشی تو میں دے نہیں سکا۔"

یہ کہتے ہوئے جاذب کی آنکھ میں آنسو آگئے۔ معراج بابا یہ باتیں کہنا ضروری سمجھتے تھے لیکن پھر بھی انہیں لگا، ان کو یہ باتیں کسی اور طرح کرنی چاہیے تھیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چلو کوئی بات نہیں......! جیسے تمہاری مرضی ہے، ویسے ہی کرو۔ میں بھی تو تمہارے باپ کی ہی طرح ہوں۔"

وہ بھی نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دیا۔

اس کو اپنی ماں کی شدت سے یاد آ رہی تھی۔ کینسر کے بعد جب وہ گھر گیا تھا تو باقی سب کو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا، پر کلثوم نے کوئی گھڑی ایسی نہیں جانے دی جب پوچھا نہ ہو:

"بیٹا......! تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو......؟ مجھے بتاؤ، مجھے تمہارے ہر انداز سے خوف آ رہا ہے۔ جب کا تمہیں دیکھا ہے، میں سو نہیں پاتی۔ کوئی بھی پریشانی ہے بتا دو، اندر مت رکھو۔"

جاذب کو ان سے جھوٹ بولتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ آخر تھک ہار کر اس نے واپس آنے کا سوچا اور کالج کے کام کا بہانہ بنا کر واپس آگیا۔

اسے خود حیرانی تھی کہ وہ ٹوٹ کیوں نہیں رہا......؟ یہ کون سی طاقت ہے جس نے اسے اتنا مضبوط کر دیا ہے......؟ اس نے مشکل حالات کے فوائد پر بہت سے لوگوں کو لیکچر دیئے تھے، پر اب اسے صحیح معنوں میں اندازہ ہو رہا تھا کہ حالات کی پیچیدگی واقعی انسان کو مضبوط کرنے کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔

جاذب نے بابا جی سے اجازت لی۔ قلم اور ڈائری اُٹھا کر اپنے لگائے ہوئے پودوں میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ اب پنسل کو منہ میں ڈال کر کچھ سوچ رہا تھا۔ اب جب وہ قلم چلاتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ کوئی ماہر جوہری زیورات میں نگینے جڑ رہا ہو۔ اس نے ایک اور نگینہ جڑا۔

"اگر واقعی اللہ کو پانا ہے تو خواہش سے بے نیازی پہلی شرط ہے۔ بے نیاز ہو کر دیکھو، سب تمہارا ہو جائے گا۔ اب جو چیز بنی ہی تمہارے لئے ہے، وہ تم کو مل کر ہی رہنی ہے۔ خواہش کرو نہ کرو، وہ اپنے وقت پر ہی ملے گی۔ کہتے ہیں، اللہ کے عشق اور ہدایت کے علاوہ سب کچھ مانگے بغیر ملتا ہے۔ سو ہمارے مانگنے کی چیز تو ہے ہی صرف ایک، تو ہم کیوں اپنی طاقت صرف کرتے ہیں بے معنی خواہشات میں......؟ خواہش انتظار پیدا کرتی ہے اور انتظار موت سے بھی بدتر ہو سکتا ہے۔ بے نیازی بس انتظار ختم کرتی ہے، لیکن بے نیازی اور بے حسی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

(اگلے ماہ آخری قسط)

مکافاتِ عمل

نافرمان

وہ والدین سے دور اور اللہ کے غصے کے قریب ہو گیا

☆ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق
0323-4546115

میں بابا نذیر کو جب بھی دیکھتا ہوں رنج اور کرب کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہوں اور جب سے اس کی زبانی اس کے حالات سے آگاہ ہوا ہوں، اس کیفیت میں عبرت اور خوف کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ بابا نذیر کو میں برسوں سے جانتا ہوں، کبھی کسی دکان پر بیٹھے ہوئے، کبھی کسی شخص سے گپ شپ کرتے ہوئے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ چار پانچ سال پہلے وہ مذہب اور مذہبی لوگوں سے بہت بیزار تھا۔ بہت قابل احترام علماء کے بارے میں بھی ناگواری اور بدگمانی کا سلوب اختیار کرتا اور دینی شعار کے معاملے میں استہزا کا انداز اختیار کرتا لیکن اب اس کی کنوتیاں خاصی ڈھیلی ہو گئی ہیں۔ مذہبی لوگوں ہی نے مل کر اسے ایک کمرہ کرائے پر لے دیا ہے اور ایک دینی جماعت کے ایک عہدیدار نے اس کے لئے دو وقت کے کھانے کا انتظام کر دیا ہے۔

میں بابا نذیر کو کم و بیش تیس سال سے جانتا ہوں۔ وہ بے آسرا اور تن تنہا بے یار و مددگار زندگی گزار رہا تھا۔ پہلے تو اس کے کھانے پینے کا بھی کوئی مستقل انتظام نہ تھا۔ کبھی کسی نے ترس کھا کر کھلا دیا اور کبھی کہیں پناہ لے لی۔ وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولتا ہی پھرتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی زندگی کانٹوں میں الجھ کر رہ گئی ہے اور اس کی ساری شخصیت لیر لیر ہو گئی ہے۔

بابا نذیر کے متفرق اور جزوی حالات سے میں آگاہ ہوتا رہتا تھا۔ اس کا ایک بیٹا ہے، امریکہ میں ملازمت کرتا ہے، بہت امیر ہے۔ اس کی دو بیٹیاں ہیں، ایک کو طلاق ہو گئی ہے اور بیوی مستقل ذہنی مریض ہے لیکن تفصیل کے ساتھ، ثقہ حوالے سے اس کے معاملات سے واقفیت نہ ہو رہی تھی۔ میرا وجدان کہتا تھا کہ بہت سے دیگر واقعات کی روشنی میں اور اللہ کی سنت کے حوالے

سے بابا موصوف کے معاملے میں ''مکافاتِ عمل'' کا قانون کارفرما ہے۔ کئی بار جی چاہا کہ بابا سے کسی وقت خود بات کروں اور اس کی کہانی خود اس کی زبانی سننے کا موقع پاؤں لیکن اس کام کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ بری بات سننا ہی گوارا نہ کرے۔ اس کے مزاج میں جھلاہٹ اور غصہ بھی ہے، ہو سکتا ہے وہ ڈانٹ دے اور مجھے خفت کا سامنا کرنا پڑے۔

لیکن خدا کا شکر ہے برف پگھل گئی۔ مختلف مواقع پر مجھے بابا نذیر کی خدمت کا موقع ملا۔ میں نے تعاون کیا تو اس کا رویہ خاصا خوشگوار ہو گیا اور کچھ عرصہ قبل جب ایک روز میرا اس کا آمنا سامنا ہوا اور میں نے پیشکش کی کہ اگر ان کے پاس فرصت ہے تو میرے ساتھ چلیں اور چائے نوش کریں تو وہ فوراً راضی ہو گیا اور میں اسے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مجھے بابا نذیر کی خدمت کا کئی بار موقع ملا۔ اب بھی چائے آنے سے پہلے میں نے حاسے کچھ رقم پیش کی جسے اس نے بغیر کسی تکلف کے خاموشی سے جیب میں ڈال لیا اور پھر چائے پیتے ہوئے میں نے پوچھ ہی لیا کہ یہ جو آپ لمبے عرصے سے ڈانواں ڈول صورت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ کیوں ہے اور اس کے پیچھے کیا کہانی ہے؟

بابا پہلے تو کچھ دیر خاموش رہا پھر اس کے لبوں سے ایک لمبی آہ نکلی اور پھر اس نے جو واقعات سنائے اس کے مطابق وہ 1924ء میں کھاریاں کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کے والد حافظ فضل داد (یہ نام اصل نہیں ہے) ایک سکول ٹیچر تھے، صوفی منش اور باعمل انسان تھے لیکن بدقسمتی سے نذیر احمد پرائمری سے آگے نہ پڑھ سکا۔ اس نے نالائق اور آوارہ لڑکوں کی صحبت اختیار کر لی اور خود بھی گھر سے بھاگ کر آوارگی کو زندگی کا مطمح نظر بنا لیا...... اس زمانے میں بمبئی تھیٹر اور فلم کا مرکز تھا

اور گھر سے بھاگے ہوئے لڑکوں کی آخری پناہگاہ بھی شہر تھا۔ چنانچہ نذیر احمد بھی بمبئی جا پہنچا...... اور قیام پاکستان تک وہیں ہوٹلوں اور تھیٹروں میں نوکری کر کے وقت گزارتا رہا، تاہم اس نے اس دوران یہ کارنامہ ضرور انجام دے دیا کہ کسی نہ کسی طرح مڈل کا امتحان پاس کر لیا اور اس زمانے میں اس کی بھی خاصی اہمیت تھی۔

تقسیم کے بعد بابا نذیر پاکستان آ گیا اور اپنے والدین کے پاس آنے کی بجائے سکھر میں مقیم ہوا اور وہاں محکمہ انہار میں اوورسیئر کی حیثیت سے ملازمت کرنے لگا۔ سکھر میں اس نے ایک ہندو ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ پھر وہ کراچی چلا گیا اور یہیں اس کی بدقسمتی کا آغاز ہوا۔ کراچی میں اس کا تعارف ایک ایسے خاندان سے ہوا جس کی لڑکیاں بہت خوبصورت تھیں لیکن کردار کے اعتبار سے وہ خاندان پستیوں میں گرا ہوا تھا۔ چنانچہ 1954ء میں اس نے اسی خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کر لی۔ یہ لڑکی اپنی خاندانی روایات کے مطابق آوارہ مزاج تھی اور بہت جاہل بھی۔

1957ء میں نذیر اپنی بیوی کو لے کر اپنے والدین کے پاس گاؤں آیا لیکن اس کی بیوی کے انداز و اطوار اتنے ناپسندیدہ تھے کہ اس کے بے حد دین دار باعمل والد نے اسے قبول نہ کیا اور دونوں میاں بیوی کو گھر سے نکال دیا اور اس کے بعد نذیر احمد نے دوبارہ کبھی بھی گاؤں کا رخ نہ کیا۔ حالانکہ اس کے والد کی وفات بیس سال کے بعد 1979ء میں ہوئی تھی۔

1974ء میں نذیر کراچی سے لاہور منتقل ہو گیا۔ دراصل وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس کے لئے وہ انہیں اپنے ننہالی رشتہ داروں سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت تک اس کے چار بچے تھے، دو بیٹے، دو بیٹیاں۔ لاہور میں اس نے سخت محنت کی۔ سولہ

سولہ گھنٹے کام کرتا۔ کئی کئی اداروں کی خدمت کرتا اور وہ اس وقت خوشیوں سے نہال ہو گیا جب اس کے بڑے بیٹے انوار کو انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔

انوار خوبصورت اور لائق تھا لیکن وہ پیپلز پارٹی کا جیالا تھا اور کسی طرح کی اخلاقی قدروں کا قائل نہ تھا۔ اس کے دل میں باپ کی قربانیوں کی کوئی پروا نہ تھی اور سچی بات ہے کہ نذیر احمد کی ساری اولاد پر اپنی ماں اور اس کے خاندان کے گہرے اثرات ثبت تھے۔ اندازہ کیجئے کہ انوار جونہی انجینئر بنا اس نے باپ سے معمولی مشورہ کیے بغیر جلو کے ایک امیر خاندان میں خود ہی شادی کر لی۔ نذیر احمد کی چھوٹی بیٹی جو بہت خوبصورت تھی، تھرڈ ایئر میں پڑھ رہی تھی لیکن تعلیم ادھوری چھوڑ کر کراچی چلی گئی اور جا کر خالہ زاد سے شادی رچا لی۔ نذیر احمد کے لئے یہی صدمے شدید پریشانی اور بدنامی کا باعث بن رہے تھے کہ ایک اور قیامت ٹوٹی۔ اس کا چھوٹا بیٹا پرویز جو انٹر میں پڑھتا تھا اور بے حد خوبصورت تھا، راوی میں ڈوب کر مر گیا اور اس صدمے سے اس کی بیوی کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔

انجینئر انوار لاہور کی ایک سٹیل فیکٹری میں منیجر بن گیا۔ پھر وہ سعودی عرب چلا گیا، وہاں کئی سال مقیم رہ کر کینیڈا منتقل ہو گیا اور آج کل امریکہ میں ہے۔ لاکھوں روپے ماہوار تنخواہ لیتا ہے لیکن اس بدنصیب نے کبھی بھولے سے بھی باپ کا حال نہیں پوچھا۔ اس کے لاہور میں چار مکان ہیں لیکن باپ پچاسی سال کی عمر میں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ اس کا نہ کوئی مکان ہے، نہ کوئی روزگار وہ دو وقت کی باعزت روٹی کو بھی ترس گیا ہے۔ چند خدا خوف لوگوں نے مل کر اسے پندرہ سو روپے ماہوار پر ایک کمرہ کرائے پر لے دیا ہے اور ایک دینی جماعت کے رہنما نے اس کے لئے کھانے کا انتظام کر دیا ہے۔ اس کی بیوی اپنی بڑی بیٹی کے پاس رہتی ہے اور یہ واحد

غصہ دنیا کے 90 فیصد مسائل کی ماں ہے۔ برداشت دنیا کی سب سے بڑی اینٹی بائیوٹک اور دنیا کا سب سے بڑا ملٹی وٹامن ہے۔ انسان اکثر ایک گالی برداشت کر کے سینکڑوں گالیوں سے بچ سکتا ہے اور بُری نظر کو نظر انداز کر کے دنیا بھر کی غلیظ نظروں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

☆......دستگیر شہزاد

اولاد ہے جس کی طرف سے نذیر احمد کو کوئی پریشانی لاحق نہیں ورنہ جس بیٹی یعنی نازیہ نے گھر سے بھاگ کر خالہ زاد سے شادی کی تھی اسے وہاں بھی کوئی خوشی حاصل نہ ہوئی۔ اس کا خاوند اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ تھا، چنانچہ دس سال کی رفاقت کے بعد نازیہ نے طلاق لے لی۔ پھر اسلام آباد کے ایک معزز اور اعلیٰ تعلیم یافتہ فرد سے شادی کی، اس سے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی لیکن تیرہ سال کی رفاقت کے بعد اس نے اس خاوند سے بھی خلع لے لیا۔ بیٹے باپ کے پاس ہیں، بیٹی نازیہ کے پاس ہے اور اب یہ بھی لاہور آ گئی ہے اور نذیر احمد کے دکھوں میں کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ بیٹی کو اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا لیکن اس انتہائی بڑھاپے میں جبکہ وہ خود درماندہ و لاچار ہے، بیٹی اور نواسی کا سہارا کیسے بنے۔ چنانچہ میں دیکھ رہا ہوں چند ہفتوں میں بابا نذیر پہلے سے کہیں زیادہ نحیف ہو گیا ہے، اس کی کمر کا خم بڑھ رہا ہے اور خدا جانتا ہے کہ وہ اپنی بے عملیوں اور بے اعتدالیوں کی سزا کس صورت میں بھگتتا رہے گا!

(مصنف کی کتاب ”مکافاتِ عمل“ سے ماخوذ)

◆✻◆

یہ ایک سچی کہانی ہے جس کے کرداروں اور علاقے کے نام فرضی ہیں۔ پھر بھی اگر کسی سے مماثلت پائی جائے تو محض اتفاق ہو گا۔

یہ کہانی تقسیم کے وقت رُونما ہوئی اور کرداروں کی اکثریت اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔ کہانی سے مزید کہانیاں نکلتی گئیں اور عوام الناس کے لئے عبرت کا نشان چھوڑ گئیں۔ قتل اور لوٹ مار اور ملاوٹ جیسے عظیم گناہوں نے لوگوں کی زندگیوں کو کیسے برباد کیا۔ فطرت نے ان سے کیسا انتقام لیا۔ لمحہ بہ لمحہ یہ کہانی اپنے رنگ بدلے گی۔ اڑسٹھ سالہ دور پر محیط اس کہانی نے ناول کی صورت اختیار کر لی ہے۔

ایک دِل ہزار داستان

قسط: 1

☆ ایس ایم صفی
0300-5563881

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

برصغیر پاک و ہند مسلمانوں کی جدوجہد مسلسل کی وجہ سے بالآخر 14 اگست 1947ء کو تقسیم ہو چکا تھا۔ تقسیم سے پہلے اور مابعد تقسیم سرحد کے دونوں اطراف خون کی ندیاں بہائی گئیں اور خاص طور پر خواتین کی عصمت دری کے بے شمار واقعات رُونما ہوئے۔ یہ کہانی بھی مغربی پنجاب (پاکستان) کی ایک سچی داستان ہے۔ جس نے کئی واقعات کو جنم دیا۔

15 اگست 1947ء کو یوم آزادی مشرقی پنجاب (انڈیا) میں بڑے انوکھے انداز میں منایا گیا۔ سکھوں کے ایک منظم جتھہ نے امرتسر کے بازار میں برہنہ مسلم خواتین کا جلوس نکالا۔ ان کی سرِ بازار عصمت دری کی گئی اور پھر کرپانوں سے ان کے ٹکڑے کر ڈالے اور بعض کو زندہ آگ لگا دی۔

انہی واقعات کی عکاسی کرتے ہوئے ”لندن ٹائمز“ نے اپنی 18 اگست 1947ء کی اشاعت میں لکھا۔ ”گزشتہ پچاس برس کے شہری فسادات میں جتنے لوگ ہلاک ہوئے ان سے کہیں زیادہ برصغیر پاک و ہند کے لوگ پچھلے ایک ماہ کے مختصر عرصہ میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ لاکھوں افراد کو بے گھر کر دیا گیا۔

مشرقی پنجاب (انڈیا) سے جونہی مسلمان مہاجرین کا لاہور اور مغربی پنجاب (پاکستان) کے دوسرے مقامات پر تانتا بندھا اور انہوں نے اپنا دکھڑا یہاں آ کر سنایا تو ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف فوراً جوابی کارروائی شروع ہو گئی۔ مہاجرین کی حالت زار کو دیکھ کر لوگوں کے جذبات اس قدر مشتعل ہو گئے کہ قائداعظمؒ اور دوسرے لیڈروں کی عوام کو پُر امن رکھنے کی تمام تر کوششیں کارگر نہ ہوئیں۔ یہ ہندوؤں سکھوں کی درندگی کا جبلی ردِعمل تھا جو انہوں نے مشرقی پنجاب (انڈیا) میں مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی۔

مشرقی پنجاب (انڈیا) کے برعکس تشدد کے ان فوری مظاہروں میں نہ کوئی منصوبہ تھا اور نہ ہی باقاعدہ کوئی تنظیم۔ جرائم پیشہ عناصر نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ان جوابی حملوں کا ہدف زیادہ تر سکھ تھے لیکن ہندو بھی تشدد کی اس لہر سے بچ نہ پائے کیونکہ سکھوں کو ہلہ شیری دے کر آگے بڑھانے والے ہندو ہی تھے۔ اس طرح مجموعی طور پر ہندوؤں کو سکھوں کی کارستانیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

اس موقع کو غنیمت جان کر محسن پورہ مغربی پنجاب (پاکستان) کے وڈیرے ملک نواب کا بیٹا ملک جابر اپنے دو جگری یاروں ”غفورے (غفور) اور ”کریمے“ (عبدالکریم) کے ہمراہ لوٹ مار کی غرض سے ”سرحد“ کے مشہور شہر ”ہری پور“ کو روانہ ہوئے۔ ”غفور“ اور ”کریما“ ملک جابر کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے اور دن رات ایک ساتھ گزارتے تھے۔ ہری پور محسن پورہ سے کوئی تیس میل کے فاصلے پر تھا۔ آمدورفت زیادہ تر ریل گاڑی کے ذریعہ ہوتی تھی۔ تینوں دوست محسن پورہ کے قریبی ریلوے سٹیشن ”طار“ سہ پہر ساڑھے تین بجے پہنچ گئے کیونکہ چار بجے ریل گاڑی نے سٹیشن پر پہنچنا تھا۔ سٹیشن پر پہنچ کر ملک جابر نے ہری پور کے لئے تین ٹکٹ خرید لئے۔

اچھے دور کی بات ہے۔ ریل گاڑیاں وقتِ مقررہ پر پہنچ جایا کرتی تھیں۔ اس لئے ٹھیک چار بجے ٹرین طار سٹیشن پر آ کر رکی۔ باقی مسافروں کے ہمراہ یہ تین لوگ بھی سوار ہو گئے۔ چار پانچ منٹ بعد ٹرین ہری پور کے لئے روانہ ہو گئی۔ اگست کا مہینہ تھا گرمی کا زور چند بارشوں کے سبب کم ہو چکا تھا۔ پچاس منٹ کی مسافت طے کر لینے کے بعد ریل گاڑی ہری پور سٹیشن پر رکی۔ سٹیشن شہر سے کچھ فاصلے پر تھا۔ سٹیشن کے اردگرد امرود اور لوکاٹ کے پھیلے ہوئے باغات تھے۔

ملک جابر نے اس روز اپنے دوستوں کے ہمراہ کوئی بڑا ہاتھ مارنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ ملک جابر پورے شہر سے اچھی طرح واقف تھا۔ کیونکہ اس کے بڑے دو بھائی ملک بابر اور ملک ناصر ہری پور میں کریانہ کی دکان چلا رہے تھے۔ ان کی دکان کے بالکل سامنے ”لالہ شرما جی“ کی سنیار کی دکان تھی۔ لالہ جی بھری پور میں بہت معروف تھے۔ اکثر زرگر لالہ جی سے سونا لے کر آگے کام کر رہے تھے۔ لالہ جی کا سونے کا بڑا اچھا کاروبار تھا۔ لالہ جی کا ملک برادران سے بھی کافی اچھا رکھ رکھاؤ تھا۔ ملک جابر اکثر لالہ جی کے گھر جایا کرتا تھا۔ لالہ جی کے گھر کے بارے اسے مکمل معلومات تھیں۔ ملک جابر نے اس بار لالہ شرما جی کے گھر کو نشانہ بنانے کا تہیہ کر رکھا تھا کیونکہ وہ لالہ جی کے بارے مکمل معلومات رکھتا تھا۔

گو کہ ہری پور میں ہندوؤں کی اچھی خاصی آبادی تھی جو آبائی طور پر یہاں آباد تھے۔ مگر اب تو حالات یکسر بدل چکے تھے۔ اپنے پرائے بن گئے تھے۔ صدیوں کے یارانے، دشمنیوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ یہ دیس اب بیگانہ سا لگ رہا تھا۔ لوٹ مار کی کثرت ہو چکی تھی اور اکا دکا قتل کے واقعات بھی رُونما ہو رہے تھے۔ شام ڈھلتے ہی ہندوؤں کو جان کے لالے پڑ جاتے تھے۔ دور دراز علاقوں سے چور اچکے شام ڈھلتے ہی شہروں کا رخ کر لیتے اور رات کو ہندوؤں اور سکھوں کے گھرانوں کو لوٹتے تھے۔

لالہ شرما جی ہری پور کا نامی گرامی زرگر تھا۔ سونے اور دولت کی ریل پیل تھی۔ شرما جی کی پتنی رادھا رانی جو کہ لالہ جی سے پندرہ برس چھوٹی کوئی تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کے علاوہ لالہ جی کی بیٹی ”سیتا رانی“ جو ابھی بمشکل سولہ سال کی ہو گی اور ”گوبی راج“ بیٹا جو تیرہ سال کا نوجوان تھا۔ لالہ جی کی کل کائنات تھی۔ شرما جی اور رادھا رانی رات جاگ کر گزارتے تھے۔ اولاد اور جان کی فکر کے ساتھ ساتھ لالہ جی کو اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی کا بھی فکر دامن گیر تھا۔

شام کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ رات نے اپنا دھرتی بکھیرنا شروع کر دیا۔ انسان اور حیوان اپنی اپنی آرام گاہوں میں محوِ استراحت ہو چکے تھے۔ صرف کتوں کے بھونکنے اور مقامی پولیس اہلکاروں کے گشت پر مامور نوجوانوں کی سیٹیوں کی گاہے گاہے آوازیں آ رہی تھیں۔ لالہ جی کے گھر کے پچھواڑے خوبصورت پھلدار پودوں کا باغ بھی تھا جو تا حال لالہ جی کی ملکیت تھا۔ ملک جابر شہر سے ذرا ہٹ کر رات گہری ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ پیش آمدہ حالات کا اندازہ لگا کر دوستوں سے رائے لے رہا تھا۔ رات بارہ بجے کے قریب تمام پروگرام طے پا گیا۔

ملک جابر اپنے دونوں دوستوں کے ہمراہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ تینوں گشت پارٹیوں سے بچتے بچاتے لالہ جی کے مکان کے پچھواڑے باغ میں جا پہنچے۔ ملک جابر کے پاس خنجر اور ایک عدد طمنچہ (پستول) تھا۔ باقی دو ساتھی بھی خنجر اور تلواروں سے لیس تھے۔ تلواریں ملک جابر نے اپنی دکان سے اٹھائی تھیں۔ افراتفری کا دور دورہ تھا۔ اتنے ہتھیار تو کوئی بھی رکھ سکتا تھا۔

دیوار پر چڑھنا ملک جابر کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ آن کی آن میں وہ جست لگا کر لالہ جی کے مکان پر چڑھ گیا اور یکے بعد دیگرے باقی دو ساتھیوں کو بھی رسی کی مدد سے چھت پر چڑھا چکا تھا۔ لالہ جی اور رادھا صحن میں بچھی چارپائیوں پر باتیں کر رہے تھے جبکہ سیتا رانی اور گوبی راج اپنے اپنے بستر پر محوِ خواب تھے۔

”ہمیں اب جلدی سے یہ دیس چھوڑ کر اپنے

وطن (انڈیا) چلے جانا چاہئے"۔ لالہ جی نے رادھا رانی سے کہا۔

دراصل لالہ مسلسل کئی روز سے اپنے کاروبار کو سمیٹ رہا تھا اور لین دین چکتا کر رہا تھا۔ اسی غرض سے لالہ جی نے دو روز پہلے اپنا تمام سونا ڈھلوا کر ٹھوس اینٹیں بنوالی تھیں اس خیال سے کہ ساتھ لے جانے میں آسانی ہوگی۔

لالہ جی آئے روز معلومات حاصل کر رہے تھے کہ کوئی معقول بندوبست ہو جائے تو اپنے پریوار کے ہمراہ انڈیا کی راہ لیں۔ آج انہوں نے دل کی بات رادھا رانی سے کہہ ڈالی۔

"نہ سیتا کے بابو! نہ یہ دھرتی بھی تو اپنی ماتا ہے"۔ رادھا رانی نے کہا۔ یہ ہماری جنم بھومی ہے۔ ہم اسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ بھگوان ہماری رکھشا کرے گا۔ جلد ہی دیش میں امن ہو جائے گا"۔

"رادھا تمہیں حالات کی خبر نہیں ہے"۔ لالہ جی نے کہا۔ "کل تک ایک جگہ مل کر رہنے والے آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے ہیں۔ اوپر سے مشرقی پنجاب (بھارت) میں سکھ مسلسل مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں۔ آئے روز لاکھوں مہاجرین پاکستان آ رہے ہیں اور ہر ایک اپنے ساتھ دل دوز واقعات لا رہا ہے۔ ایسے حالات میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بازار میں بھی مسلمانوں کے تیور اب پہلے سے نہیں رہے"۔

"اجی! کچھ بھی ہوئے پر میں اپنی سیتا اور گوبی کو اپنے جنم کے ساتھیوں سے الگ نہیں کروں گی"۔ رادھا رانی نے لالہ جی کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔ "بھگوان کی سوگند بھارت جانے سے میں اس دھرتی ماں پر مرنے کو ترجیح دوں گی۔ بھگوان خیر کرے گا۔ گوبی کے بابو! افواہوں پر دھیان نہ دیا کرو"۔

"خبردار! اگر ذرا بھی آواز نکالی تو کاٹ کر رکھ دیں گے"۔

تین نقاب پوش شرما جی کے پریوار کو گھیر چکے تھے۔ رادھا رانی خوف سے ماری شرما جی سے لپٹ گئی۔

"رام...... رام...... رام"۔ لالہ شرما جی بکری کی طرح ممیانے لگے۔ "بھگوان کے لئے ہمیں کچھ مت کہنا۔ ہمارا کوئی دوش نہیں ہے"۔

"بھگوان کے لئے ہمیں چھوڑ دو"۔ رادھا رانی نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔ "ہم تو اسی جنم بھومی سے ہیں"۔

"جو کچھ ہے ہمارے حوالے خاموشی سے کر دو"۔ ملک جابر نے طمنچے کی نالی لالہ جی کی کنپٹی پر رکھ دی۔

"رام، رام، ہمارے پاس کچھ بھی باقی نہیں ہے"۔ لالہ جی نے مکاری سے کہا۔ "ہم پہلے ہی لٹ چکے ہیں"۔

"بکواس بند کرو اپنی اور سیدھی طرح جو کچھ ہے ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ......" ملک جابر نے کڑک کر کہا۔

ملک جابر کی کرخت آواز سے سیتا رانی اور گوبی راج کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ سیتا رانی نے خوف کے مارے چیخ ماری مگر آواز نہ نکل سکی کیونکہ، کریمو کا آہنی پنجہ اس کے منہ پر جم چکا تھا۔ اب وہ مکمل "کریمو" کی گرفت میں تھی۔ سیتا رانی بلا کی خوبصورت اور نازک اندام تھی۔ بیچاری مرجھا کر رہ گئی۔

غفور نے گوبی راج کی خبر لی۔ وہ تو جیسے گنگ ہو چکا تھا۔ غفورے کی برہنہ تلوار گوبی کی شہ رگ کو چھو رہی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے ابھی گوبی کی نازک گردن کٹ کر نیچے آ گرے گی۔ موت کا خوف گوبی کے بدن میں سرایت کر چکا تھا اور وہ سردی لگے مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔

"کاٹ دے گردن اس سالے کی"۔ ملک جابر کی سفاک آواز ابھری۔ "یہ اپنے جیتے جی کچھ نہیں دیں گے، ہندو بنیے ہیں"۔

"بھگوان کے لئے مجھے مت مارو"۔ گوبی راج نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "مجھے مت مارو، بابو جی...... ماتا جی! مجھے بچالو"۔

ماں کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے کیسے اپنے بیٹے کو مرتا دیکھ سکتی تھی۔

"بھگوان کے لئے میرے لال کو کچھ مت کہنا"۔ رادھا رانی نے روہانسی آواز میں کہا۔ "ہماری ساری دولت اور سارا سونا لے لو، پر میرے بچوں کو چھوڑ دو"۔

سیتا رانی ماہی بے آب کی طرح کریمو کی مضبوط گرفت میں تڑپ رہی تھی۔ لالہ جی سے بیٹی کی حالت دیکھی نہ گئی۔

"رام، رام...... بھگوان کے لئے میری سیتا، میری رانی کو چھوڑ دو"۔ لالہ جی نے گھبرا کر کہا۔ "اسے مت کچھ کہو۔ میرا سب کچھ لے لو پر میری......" بات شرما جی کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

"چھوڑ دے ناگن کو!" ملک جابر نے کریمو کو حکم دیا۔

سیتا بھاگ کر باپ سے لپٹ گئی اور سسکیاں لینے لگی۔

رادھا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تجوری کی چابیاں لالہ جی کے تکیے کے نیچے نکال کر بولی۔

"یہ لو یہ لو...... لے لو سب کچھ ہمارا لے لو پر ہمیں...... چھوڑ دو۔ بھگوان کا واسطہ ہے...... تمہیں تمہارے بچے خدا کا واسطہ ہے، ہمیں کچھ مت کہنا"۔

لالہ جی کا کل پریوار سمٹ کر ایک چارپائی پر آ گیا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے اور خوف کے مارے کانپ رہے تھے۔

"دھیان رکھ ان کراڑوں کا"۔ ملک جابر نے کریمو سے کہا۔ "کوئی ہلنے نہ پائے اور نہ کوئی آواز نکالے۔ کاٹ کر رکھ دینا سب کو اگر کوئی الٹی حرکت کرے تو"۔ پھر اس نے رادھا رانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اٹھو دیوی جی اٹھو"۔

وہ رادھا رانی کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ "اپنے ہاتھوں سے ہمیں اپنے بل سے سب کچھ نکال دو اور ہاں ذرا بھی چالاکی دکھائی تو تمہارا کچھ نہیں بچے گا۔ نہ دولت نہ عزت اور نہ پریوار"۔

رادھا خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی ساڑھی بھی آدھے سے زیادہ کھل گئی تھی۔ مگر موت کو سامنے دیکھ کر بدن اور لباس کی پروا کون کرتا ہے۔

بے چاری رادھا کے دل میں ہول اٹھ رہے تھے۔ گرتے پڑتے وہ طاق تک پہنچی۔ طاق میں رکھا دیا اس نے روشن کر دیا۔ غفورے نے جھپٹ دیا طاق سے اٹھا لیا۔

رادھا اب ملک جابر کے سامنے کٹھ پتلی کی طرح گھوم رہی تھی اور گھر کے کونے کھدروں میں چھپائی ہوئی دولت نکال کر دے رہی تھی۔ مگر تا حال جابر کی توقع کے مطابق کامیابی نہیں مل رہی تھی۔

"اے چالاک کراڑنی سیدھی طرح سب کچھ ہمارے حوالے کر دے"۔ ملک جابر چلایا اور خنجر رادھا کی گردن پر رکھ دیا"۔ ہمیں مورکھ سمجھ رکھا ہے کیا؟"

رادھا کو لگتا تھا اب اس کی سانسیں پوری ہونے کو ہیں۔

"بھگوان کے لئے میں دیتی ہوں ابھی نکال کر دیتی ہوں"۔ یہ خنجر تو ہٹا لو"۔

رادھا رانی اب اس طرف بڑھی جہاں وہ تمام

عمر میں صرف چند بار ہی لالہ جی کی معیت میں گئی تھی۔

غفورا ایک ہاتھ میں چراغ اور دوسرے ہاتھ میں سرہانے کا غلاف تھامے ہوا تھا جس میں چاندی کے سکوں کی کھنک پیدا ہو رہی تھی۔

رادھا رانی خوف سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دیواروں کو ٹٹول رہی تھی۔ دراصل لالہ جی نے سونا چھپانے کے لئے ماہر کاریگروں سے دیوار کے اندر طاق بنوا رکھا تھا۔ جو لالہ جی کی تجوری تھی۔ یہ طاق اتنی مہارت سے بنایا گیا تھا کہ دن کے اجالے میں بھی کوئی محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

آخرکار رادھا اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئی۔

دیوار کو ایک جگہ سے دبایا تو ہلکی سی آواز سے ایک تجوری ظاہر ہو گئی۔ رادھا نے اندر سے ٹھوس سونے کی اینٹیں نکالنی شروع کر دیں۔ سونے کو دیکھ کر ملک جابر کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

غفورا ایک ایک کر کے اینٹوں کو غلاف کے اندر ڈال رہا تھا۔ یہ ایک ایک کلو کی کل پانچ اینٹیں تھیں۔ جو لالہ جی نے چند روز پہلے اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی کو سمیٹ کر تیار کروائی تھیں تاکہ ہجرت کے وقت ساتھ لے جانے میں آسانی ہو۔ دو گھنٹے کی تلاش بسیار کے بعد ملک جابر اور اس کے ساتھی لالہ جی کی زندگی بھر کی دولت لوٹ چکے تھے۔

جب ملک جابر کو مکمل یقین ہو گیا کہ لالہ جی کے گھر میں اب پھوٹی کوڑی بھی نہیں بچی تو اطمینان سے غفورے کو کہا۔

''ارے دھیان سے ڈال لیں نا تمام چیزیں، ان کو اب کمبل میں لپیٹ لے تاکہ راستے میں کچھ گر نہ جائے۔ دولت کی پیاس تو بجھ چکی تھی، اب پیٹ کی آگ بھی بجھانا چاہتے تھے۔

''کیا مہمانوں کو یوں بھوکا واپس کر دو گی؟''

ملک جابر نے رادھا سے کہا۔ ''کچھ کھانے کے لئے بھی دو''۔

لالہ جی کے گھر میں گھی مکھن کی کثرت تھی۔ رادھا نے گھی سے بھرا دیگچہ لا کر سامنے رکھ دیا اور ساتھ شکر بھی۔ تینوں سورماؤں نے خوب پیٹ بھر کر گھی شکر کھایا۔ اس دوران شرما جی کا کل پریوار بت بنا بیٹھا رہا۔ سب لوگ سہمے ہوئے تھے۔ ان کو اب اپنی دولت اور عورتوں کی عصمت کا غم کھائے جا رہا تھا۔

''الگ کر دو ان کراڑوں کو ان کراڑیوں سے''۔ ملک جابر غرایا۔

لالہ جی کی تو جیسے جان ہی نکل گئی ہو یہ الفاظ سن کر۔ رادھا اور شرما جی کو اب کوئی شک باقی نہ رہا کہ دولت اور پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد اب یہ لوگ نفس کی آگ بجھائیں گے اور رادھا اور سیتا کی عصمت دری کریں گے۔ کیونکہ مشرقی پنجاب (بھارت) میں مسلم خواتین کے ساتھ آئے روز یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔

غفورے اور کریمے نے گھسیٹ کر رادھا رانی اور سیتا رانی کو شرما جی اور گوبی سے الگ کر دیا۔

یہ دونوں ماں بیٹیاں اب صحن میں ننگے سر اور ننگے پاؤں کھڑی تھیں۔ سیتا جسے جیون بھر کوئی کانٹا بھی نہیں چبھا تھا۔ ناز و نعم میں پلی بڑی تھی۔ آج حسرت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ سیتا کے چہرے کا رنگ زرد اور گالوں کی سرخی غائب ہو چکی تھی۔ اسی چھینا جھپٹی میں سیتا کی نرم و نازک کلائیاں چوڑیاں ٹوٹنے سے بری طرح زخمی ہو چکی تھیں۔ خون رس رس کر اس کے ہاتھوں کو رنگین کر رہا تھا۔

''بھگوان کے لئے جو بھی ظلم کرنا ہے میرے ساتھ کر لو پر میری بیٹی کو چھوڑ دو''۔ رادھا رانی نے سیتا کو اپنے پیچھے چھپا لیا۔ ''اس معصوم سے......''

''بھگوان کے لئے یہ ظلم نہ کرنا میری سیتا میری

پیاری بیٹی معصوم ہے" لالہ شرما جی بھی ہاتھ باندھ کر منتیں کرنے لگا۔ "بھگوان آج ہم کو یہ کیسا دن دیکھنا تھا"۔

غفورے اور کریمے نے آرام سے لالہ جی کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ منہ پر رومال باندھ دیا گیا کہ کہیں شور نہ مچانا شروع کر دے۔ گوپی راج کے بھی ہاتھ پاؤں کو باندھ کر منہ پر رومال باندھ دیا گیا تھا۔

لالہ شرما جی خون کے آنسو رو رہا تھا مگر بے بس تھا۔ "میری رادھا، میری بیٹی، میری سیتا رانی"۔ وہ بول تو نہیں سکتا تھا مگر کوشش کر رہا تھا۔

اب شرما جی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تھا اور دل ڈوب رہا تھا۔ دل میں ہول اٹھ رہے تھے۔ ہائے میری رادھا میری سیتا رانی، میری بیٹی، میری معصوم رانی!"

ملک جابر کا حکم پا کر غفورے اور کریمے نے لالہ جی اور گوپی راج کو گھسیٹ کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ ان کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے جکڑ دیئے گئے تھے اور منہ پر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں تاکہ شور نہ مچا سکیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے رادھا اور سیتا رانی کی خبر گیری کی۔

"لے جاؤ اور ان کو کمرے میں بند کر دو"۔ ملک جابر نے ساتھیوں کو حکم دیا۔

کریما اور غفورا دونوں ماں بیٹی پر جھپٹ پڑے۔ کریمے نے رادھا کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا اور تھوڑے تردد کے بعد وہ رادھا کو کمرے میں پہنچا کر رادھا کے ہاتھ پاؤں باندھ رہا تھا۔ ادھر غفورا مسلسل سیتا رانی کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور سیتا اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ کریما اطمینان سے رادھا کے منہ پر بھی پٹی باندھ چکا تھا۔

اسی چھینا جھپٹی میں سیتا نے ایک زوردار تھپڑ غفورے کے منہ پر دے مارا اور یہ سیتا کی آخری ناکام کوشش تھی اپنے آپ کو آزاد کرانے کی جس کی بعد میں اسے بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔

سیتا نے اپنے تئیں بھرپور کوشش کی تھی اپنی جان چھڑانے اور عصمت بچانے کی مگر وہ بیچاری اکیلی اور ادھر وہ تین ہٹے کٹے مرد۔ اس کے علاوہ وہ نہتی کر بھی کیا سکتی تھی۔ تڑاخ کی آواز نے ملک جابر کو متوجہ کر دیا۔ غفورے کا منہ ستیا کے تھپڑ سے لال ہوا دیکھ کر ملک جابر طیش میں آ گیا۔ اس نے سیتا کو ننگی گالیاں دیں اور ساتھ ہی سیتا کے نرم و نازک بدن پر لاتوں اور مکوں کی بھرمار کر دی تھی۔

غموں سے نڈھال وہ بیچاری جلد ہی نیم بیہوش حالت میں زمین پر گر پڑی۔

"اٹھا لو اس کتیا کو اب اسے سبق سکھائیں گے ہم"۔ ملک جابر نے حکم دیا۔

ملک جابر کا حکم پا کر کریما جھٹ سے کھانڈ کی ایک خالی بوری اٹھا لایا اور غفورے نے انتہائی بے دردی سے کس کر سیتا کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ دیئے۔ کلائیاں تو اس کی پہلے سے زخمی تھیں۔ اب مزید کس کر باندھنے سے درد کی ٹیسیں سیتا کے دماغ کو جھلا کر رکھ رہی تھیں۔

انسان جب درندگی پر اتر آتا ہے تو وہ انسانیت کی تمام حدود کو توڑ کر نئی نئی داستانیں رقم کر دیتا ہے۔ بے رحمی سے سیتا کے منہ میں کپڑا ڈال کر سر کے پیچھے کس کر باندھ دیا تھا۔ غفورے نے۔

کریمے اور ملک جابر کی مدد سے غفورے نے سیتا کو اس بوری کے اندر بند کر کے اوپر سے بوری کا منہ بند کر دیا تھا۔ سیتا خون کے آنسو رو رہی تھی۔ لالہ جی تو غم سے نڈھال ہو چکے تھے اور طرح طرح کے خیالات ان کے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ رادھا بھی غم کی ماری بیہوش ہو

چکی تھی۔ لالہ جی کے گھر میں دو ڈھائی گھنٹے گزارنے کے بعد یہ تینوں واپسی کی راہ پر گامزن ہوئے۔

رات کا پچھلا پہر تھا، انسان تو انسان اب تو کتے بھی لمبی تان چکے تھے۔ ملک جابر آگے آگے تھا اور کریما لوٹی ہوئی دولت اٹھائے پیچھے اور سب سے آخر میں غفورا کندھے پر بوری میں بند سیتا کو اٹھائے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

غفورا اگرچہ ایک آنکھ سے محروم تھا اور 45 سال کے لگ بھگ تھا مگر صحت و توانائی میں بے مثال تھا۔ اس کے لئے چالیس پینتالیس کلوگرام کی سیتا پھول لگ رہی تھی۔ وہ بلا تردد تیزی سے چل رہا تھا۔ یہ لوگ صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے آبادی سے نکلنا چاہتے تھے تاکہ وہ لوگوں کی نظروں سے بچ سکیں۔ یہ فیصلہ ان کو اچانک کرنا پڑا۔ کیونکہ اب وہ زر کے ساتھ ساتھ زن کو بھی اٹھا کر لے جا رہے تھے جو ان کے لئے کسی بھی خطرے کا باعث بن سکتی تھی۔

الغرض ان لوگوں نے آبادی کا سفر انتہائی تیز رفتاری سے طے کیا اور صبح کی اذان کی آواز جب آ رہی تھی تو اس وقت ہری پور شہر سے وہ کافی دور غیر آباد راستے پر گامزن تھے۔

سورج نکلنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ ملک جابر نے ویران ٹیلوں کے عقب میں پہنچ کر رکنے کا حکم دیا۔ غفورا اور کریما بھی کافی تھک چکے تھے۔ وہ بھی تھوڑی دیر سستانا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ سیتا کی بھی تو خبر لینی تھی کہ وہ مردہ ہے یا زندہ۔ غفورے نے بوری کندھے سے نیچے اتار کر رکھ دی۔

"دیکھ لو رانی کس حال میں ہے"۔ ملک جابر نے کہا۔ "اب اس پر ہمارا راج چلے گا"۔

بوری کا منہ کھول کر سیتا کو باہر نکالا گیا۔ وہ بوری میں تھک کر بُری طرح چُور ہو چکی تھی۔ باہر نکالتے ہی وہ اوندھے منہ زمین پر لیٹ گئی کیونکہ ابھی تک اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر سستانے کے بعد ملک جابر ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر اردگرد کے حالات کا جائزہ لے رہا تھا اور وہ سمت دیکھ رہا تھا کہ کس سمت میں سفر کو مزید جاری رکھا جائے۔ اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد وہ نیچے اترا۔ پیدل چلنے کی وجہ سے سب کو پیاس نے ستا رکھا تھا۔ بغیر پانی پینے کے وہ اب مزید سفر کرنے سے عاجز تھے۔

ملک جابر نے دور ایک طرف ایک کچا مکان دیکھا جو کسی مزارعے کا لگ رہا تھا جس نے کھیتوں کو آباد کرنے کے لئے بنا رکھا تھا۔ باہر چند ڈھور ڈنگر نظر آ رہے تھے۔ ایک بیل رہٹ پر جتا ہوا تھا اور ایک آدمی دور کھیتوں کو سیراب کر رہا تھا۔ ملک جابر نے کریمے کو پینے کے لئے پانی لانے کے لئے بھیجا۔ وہ فوراً پانی لینے کے لئے روانہ ہو گیا۔ کریما لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک ملک جابر کریمے کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر نیچے اتر آیا۔

غفورہ سیتا کے سرہانے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ سیتا بیچاری درد کی ماری زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ چہرہ اس کا نیچے پڑی مٹی سے گرد آلود ہو چکا تھا۔ برہنہ سر پر بھی مٹی کے نشانات واضح نظر آ رہے تھے۔ اسے اب ان لوگوں سے رحم کی ذرا بھی توقع باقی نہ تھی۔ ملک جابر ٹیلے سے نیچے اتر کر سیتا کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ سیتا کی یہ حالتِ زار دیکھ کر اس کے دل میں کچھ نرمی پیدا ہوئی۔ اس نے غفورے کو ٹھوکر ماری جس سے غفورہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کھول دے اس ماں کے ہاتھوں کو۔ اب یہ کہیں نہیں جا سکتی"۔ غفورے نے ملک جابر کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں غورے نے سیتا کے نازک ہاتھ کھول دیئے مگر سیتا دنیا و

بانیہا سے بے نیاز اسی طرح زمین پر اوندھے منہ پڑی رہی۔

"اٹھا کر بٹھا دے اس مریل کو، وقت سے پہلے ہی مرنا چاہتی ہے"۔ تھوڑا انتظار کرنے کے بعد ملک جابر نے غفورے کو کہا۔ "ابھی تو اس کے چودہ طبق روشن کرنے ہیں، ابھی تو اس کا غرور توڑنا ہے۔ بہت زور دکھا رہی تھی اپنے باپو جی کے گھر میں"۔

غفورے نے کمر میں ہاتھ ڈال کر سیتا کو بٹھا دیا مگر سیتا تو بُت بنی ہوئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ ملک جابر کو بے حد فکر تھی۔ وہ جلد از جلد مسافت طے کرنا چاہتا تھا۔ اگر سیتا نہ ہوتی تو وہ آرام سے گھر کو جا سکتے تھے مگر اب تو یہ ان کے لئے سانپ کے منہ میں چھچھوندر بن گئی تھی۔ ملک جابر پھر ٹیلے پر چڑھ گیا۔

"کافی دیر ہو گئی ہے اس کریمے کے بچے کو جہاں جاتا ہے وہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے"۔ ملک جابر بڑبڑا رہا تھا۔

وقت وقت کی بات ہے، لوگ پانی مانگتے تھے تو دودھ ملتا تھا۔ کریما جب وہاں رہٹ پر پہنچا تو اسلم کی بیوی اسلم کے لئے لسّی کی گاگر اٹھائے کھانا لا رہی تھی۔ یہی دہقانوں کا ناشتہ تھا۔ کریمے نے پہنچ کر اسلم کو سلام کیا اور پانی لینے کی اجازت مانگی اور مختصراً بتایا کہ میرا ساتھی ہے اور اس کی بیوی سخت بیمار ہے۔ کافی دور سے سفر کر کے آ رہے ہیں۔ ان کے لئے پانی لے کر جانا ہے۔ اسلم نے خوشی سے اسے کھانے کی دعوت دی جو کریمے نے یہ کہہ کر رد کر دی کہ اسے بہت جلدی واپس جانا ہے۔

اسلم نے پانی کا مشکیزہ جو مٹی کا بنا ہوا تھا جسے مقامی زبان میں "بدک" کہتے تھے۔ اس کو دیا اور ساتھ میں لسّی کی گاگر بھی اسے دے دی۔ کریما بدک اور گاگر لئے جلدی جلدی واپس روانہ ہو گیا۔ ملک جابر بڑی بیتابی سے انتظار کر رہا تھا۔ کریمے کو قدرے قریب آتے دیکھ کر اسے اطمینان ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں کریما لسّی کی گاگر اور پانی کی بدک لے کر پہنچ گیا۔ سب سے پہلے مالک جابر نے پانی پیا پھر غورے اور پھر کریمے نے۔ پانی پینے کے بعد ان کو قدرے تازگی محسوس ہوئی۔ پھر ملک جابر نے لسّی کی گاگر کو منہ لگایا اور بے صبری سے لسّی پینے لگا۔ بقیہ لسّی غفورے اور کریمے نے پی۔ سیتا اس وقت تک گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی ہوئی تھی۔ پیاس سے ہونٹوں پر پپڑی جم چکی تھی اس کے۔

"دو گھونٹ اس کو بھی دے دے، پتا جی اور ماتا کا سوگ منا رہی ہے"۔ جابر نے کہا تو کریما بدک اٹھا کر سیتا کے پاس گیا مگر تا حال وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"لو رانی پانی پی لو"۔ ملک جابر نے آواز لگائی۔

سیتا نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ پیاس سے وہ نڈھال ہو رہی تھی۔ کل کی عرش نشین آج فرش نشین تھی۔ پانی پینے کو دل تو کر رہا تھا مگر وہ بدک سے پانی پینا جانتی نہ تھی، یہ بالکل اس کے لئے عجیب چیز تھی۔ دراصل کسان بدک سے پانی پینے کے عادی تھے پر یہ بیچاری سیتا تو شہر میں پلی بڑھی تھی وہ کیا جانے بدک کو۔ وہ تو گھر میں صرف شیشے کے گلاس میں پانی پینے کی عادی تھی۔ اس نے تو آج تک مٹی کے برتن یا دھات کے برتن سے پانی نہیں پیا تھا۔ بدک سے پانی پینے کا ایک خاص طریقہ ہوتا ہے۔ اکڑوں بیٹھ کر بدک کو بائیں گھٹنے پر رکھ کر بائیں ہاتھ سے سہارا دیا جاتا ہے اور دائیں ہاتھ کے چلو کو بدک کے منہ سے جوڑا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ بائیں ہاتھ سے بدک کو نیچے کیا جاتا ہے جس سے پانی دائیں ہاتھ کے چلو میں آنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر منہ چلو سے لگا کر پانی پیا جاتا ہے۔ یہ سب سے آسان طریقہ ہے بدک سے پانی پینے کا۔ پر یہاں سیتا بیچاری ان تمام کاموں سے عاری تھی۔ پیاس نے اس کے تن بدن میں آگ لگا رکھی تھی جو اب پانی کو سامنے دیکھ کر مزید بھڑک اٹھی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے کریمے کے ہاتھ میں تھامی بدک کو دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔

"اب اس کو پانی بھی خود پلانا پڑے گا"۔ ملک جابر نے بھڑک کر کہا۔ "لگا کریمے! اس کے منہ سے لگا بدک کو"۔

کریمے نے دونوں ہاتھوں میں بدک کو تھام کر سیتا کے منہ سے لگا دیا۔ سیتا نے بدک کو منہ لگا لیا اور جیسے تیسے چند گھونٹ گلے سے نیچے اتارے۔ باقی پانی نے اس کے کپڑوں کو سامنے سے گیلا کر دیا تھا۔

"جا کریمے! میرے شیر، جلدی سے یہ بدک اور گاگر واپس کر آ۔ کہیں وہ اسلم اس طرف نہ آ نکلے، سارا بھانڈہ پھوٹ جائے گا اور ہاں ذرا جلدی واپس آ جانا، دن کافی چڑھ آیا ہے جلدی سے ٹھکانے تک پہنچ جائیں"۔

کریما تیز تیز قدموں سے روانہ ہو گیا اور بہت جلدی وہ اسلم کو برتن واپس کر کے واپس لوٹا۔ اسلم نے بہتیرا زور دیا کہ بھائی اب دن کا کھانا میرے ساتھ کھا کر جانا مگر کریما اپنی جان چھڑا کر واپس پلٹ آیا۔ دھوپ میں کافی تیزی آ چکی تھی اور برسات کی وجہ سے حبس بھی زیادہ تھی۔

"گرمی تیز ہے، ملک جی! آج بارش کا امکان ہے"۔ غفورہ ملک جابر سے مخاطب ہوا۔

"ہاں، غفورے! اب وہ کریمے کا بچہ آ جائے تو ہم روانہ ہوں"۔

"ملک جی! وہ کریما آ گیا ہے"۔

"آ گیا واپس تُو برتن واپس دے کر؟"

"ہاں جی، ملک جی!"

"اس کو کوئی شک تو نہیں گزرا؟" ملک جابر فکرمندی سے بولا۔

"نہیں ملک جی! بالکل بھی نہیں۔ وہ تو اپنے کام میں جتا ہوا ہے۔ کھانے کے لئے بہت اصرار کیا تھا اس نے پر میں نے بہانہ بنا کر جان خلاصی کرا لی"۔

"ملک جی! اس چڑیا کو پنجرے میں بند کر دیں؟" غفورے نے بوری کو سیدھا کرتے ہوئے پوچھا۔ کریما بھی مستعدی سے سیتا کی طرف لپکا۔

"نہ نہ...... رک جاؤ"۔ ملک جابر جلدی سے بولا۔ "اب سارے راستے تھوڑا اسے اٹھا کر تھوڑا ہی لے جانا ہے، کون سی اس کی بارات ہے جو اس کا ڈولا اٹھائے پھریں گے۔ اٹھ بدذات اٹھ، اب سیدھی طرح ہمارے ساتھ ساتھ چل۔ اگر تُو نے ذرا بھر بھی کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو تیرا وہ انجام ہو گا کہ خود موت بھی تجھ سے پناہ مانگے گی"۔

کریمے اور غورے نے نڈھال سیتا کو بازوؤں سے پکڑ کر اوپر اٹھا دیا۔ غفورے نے اپنی سفید چادر سیتا کے سر پر اوڑھا دی تا کہ اگر کوئی دیکھ بھی لے تو کسی کو کوئی شک نہ گزرے۔

اب یہ کل چار افراد پر مشتمل قافلہ عازم سفر ہوا۔ ملک جابر اونچے نیچے ٹیلوں کی اوٹ میں چل رہا تھا، باقی لوگ اس کی پیروی کر رہے تھے۔ ملک جابر جلد از جلد منزل پر پہنچنا چاہتا تھا مگر سیتا کی وجہ سے ان لوگوں کی رفتار سست تھی۔ آگے آگے ملک جابر پیچھے کریما، اس کے پیچھے سیتا اور سب سے پیچھے غفورہ جھاڑیوں کو پھلانگ پھلانگ کر چل رہا تھا۔ پیدل چلنا سیتا کے لئے کسی عذاب سے کم نہ تھا اور وہ بھی ایسے خاردار راستوں پر چلنا، وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہی تھی۔ اونچی اونچی

گھاس اور جنگلی جھاڑیوں کی وجہ سے سیتا کے پاؤں بُری طرح زخمی ہو چکے تھے۔ پاؤں کے نرم تلووں نے صرف چند لمحے ساتھ دیا تھا، اب تو آبلہ پاؤں بیچاری چل رہی تھی۔ گرمی اور حبس نے ان کا بُرا حال کر رکھا تھا۔

سیتا رانی جو ہر وقت گھر میں چہکتی رہتی تھی، مسکراہٹیں بکھیرنا جس کا مشغلہ تھا، آج انتہائی بے بسی و بے کسی کی حالت میں چل رہی تھی۔ پاؤں اور پنڈلیوں سے مسلسل خون نکل رہا تھا۔ اب تو قدم اٹھانا بھی سیتا کے بس میں نہ تھا، وہ اب لڑکھڑانے لگی۔ غفورے اور کریے نے سیتا کو ایک ایک بازو سے پکڑ کر سہارا دیا اور مسلسل اسے گھسیٹنے لگے۔ اب سیتا سے قدم اٹھ نہیں رہے تھے بلکہ نیچے زمین پر گھسٹتے جا رہے تھے۔ سیتا اب بے جان سی ہو گئی تھی۔ دھوپ بھی اب قدرے ڈھل رہی تھی مگر تمازت ابھی باقی تھی۔ اچانک سیتا کی گردن ایک طرف لٹک گئی، غفورہ اور کریا مسلسل اسے گھسیٹ رہے تھے۔ ملک جابر نے مڑ کر دیکھا۔

''غفورے! اسے کندھے پر اٹھا لے، وہ سامنے پانی کا چشمہ ہے، تھوڑی ہمت کرو''۔

غفورے نے سیتا کو چشمے کے کنارے پہنچ کر کندھوں سے نیچے اتار دیا، وہ اب بیہوش ہو چکی تھی۔ ملک جابر اور باقی دو ساتھیوں نے جی بھر کر پانی پیا۔

''اس کے پاؤں پانی میں کر دو اور منہ پر چھینٹے مارو۔ کہیں ہماری پیاس بجھانے سے پہلے ہی مر نہ جائے۔ میں ذرا نیچے نہا لوں، بہت گرمی لگ رہی ہے''۔

غفورے اور کریے نے سیتا کو گھسیٹ کر پانی کے مزید قریب کر دیا۔ اب سیتا کے پاؤں پنڈلیوں تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کا دامن جھاڑیوں سے الجھ الجھ کر تار تار ہو گیا تھا۔ غفورے نے چلو بھر کر سیتا کے منہ پر پانی ڈالنا شروع کر دیا۔ سیتا نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ نیم غنودگی کی حالت میں سیتا بڑبڑا رہی تھی۔

''بابو جی...... ماتا جی! مجھے بہت نیند آئی ہے۔ گوبی! تم مجھے تنگ نہ کرو''۔ سیتا نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

غفورہ مسلسل چلو بھر بھر کے اس کے منہ پر پانی ڈال رہا تھا۔ وقت کی بے رحم موجوں نے ایک ہی دن میں کتنا تبدیل کر دیا تھا سیتا کو۔ ہونٹوں کی سرخی، گالوں کی لالی سب کچھ تو اُڑ چکا تھا۔ بالوں کا سنہری رنگ اب گرد آلود ہو چکا تھا۔ چشمے کے کنارے پہنچے ایک گھنٹہ بیت چکا تھا۔ ملک جابر اور باقی دونوں ساتھی نہا کر قدرے تازہ دم ہو چکے تھے۔ درختوں کے جھنڈ اور چشمے کے پانی نے عجب سماں پیدا کر رکھا تھا۔ کوے اور مینا گرمی کا زور کم کرنے کے لئے پانی میں بیٹھے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ چڑیوں کا چہچہانا اور فاختہ کی سریلی آواز ماحول کو پُر کیف بنا رہا تھا۔

اگست کا مہینہ کافی بیت چکا تھا مگر پنجاب (پاکستان) کا یہ علاقہ شمالی علاقہ جات کے قریب ہونے کی وجہ سے زیادہ بارشوں کے لئے مشہور ہے۔ دن ڈھل رہا اور سورج مغرب کی جانب رواں دواں تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں سفید بادل کے ٹکڑے مٹرگشت کر رہے تھے۔ سیتا دنیا و مافیہا سے بے خبر چشمے کے کنارے چت پڑی ہوئی تھی۔ قریب ہی نرم نرم گھاس پر ملک جابر باقی دو ساتھیوں کے ہمراہ قدرے ستا رہا تھا۔ شمال مغربی پہاڑوں سے بادل کے موٹے موٹے سیاہ سفید ٹکڑے نمودار ہوئے اور وہ مسلسل اوپر اٹھنے لگے۔

برسات کا موسم اپنے آخری حصے میں تھا مگر پھر بھی اس خطے پر زوردار بارشیں ہوتی ہیں۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چلنے لگی، بادل کے ٹکڑے اب تیز رفتاری سے اوپر اٹھنے لگے۔ کبھی کبھی کوئی آوارہ بادل کا ٹکڑا سورج کے سامنے آ کر اپنا دامن پھیلا لیتا اور تھوڑی دیر تک سورج

نکھوں سے اوجھل ہو جاتا۔ سیتا نے ابھی تک آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ نیند بھی بہت عجیب شے ہے، پھانسی کے پھندے اور کانٹوں کے بستر پر بھی آ دبوچتی ہے۔ ہمارے بہت سارے دکھوں کا مداوا صرف نیند ہی ہوتی ہے۔ آج سیتا بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر کانٹوں کے بستر پر محوِ خواب تھی۔ ملک جابر اٹھ بیٹھا، اس کو برسات کی گھنگھور گھٹائیں اب گہری ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ بے سدھ پڑی سیتا کو گھور رہا تھا۔

کتنا خوبصورت خدا نے سیتا کو بنایا تھا۔ من موہنی سی صورت، لمبی غزال آنکھیں، گھنی پلکیں، سیاہ ابرو، متناسب پتلی ناک، بس ایک دیوی جیسی وہ لگتی تھی۔ اس کے من میں ہوس کا طوفان اٹھ رہا تھا۔

''اٹھا دو اس رانی کو''۔ ملک جابر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''پہلی رات کی دلہن کی طرح سو رہی ہے ہے''۔

غفورے نے چلو پانی کا لے کر زور سے سیتا کے منہ پر دے مارا۔ سیتا نے آنکھیں کھول دیں مگر وہ پوری طرح اپنے حواس میں نہ تھی۔

''گوبی! مجھے آرام کرنے دو، کیوں مجھے تنگ کرتے ہو؟''

''اٹھ گوبی کی بچی!'' کریے نے سیتا کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

سیتا اٹھ بیٹھی اور اپنے اردگرد ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ وہی تین مکروہ صورتیں رات والی۔ وہ اس کے سامنے اس کی بے بسی پر مسکرا رہے تھے۔ ملک جابر نے سونے اور دولت والی گٹھڑی اٹھالی۔

''لے چلو اس بدذات کو، اس کی وجہ سے ہمیں بھی مصیبت اٹھانا پڑی۔ شام تک گھر پہنچنا ضروری ہے۔ دو دن سے گھر سے غائب ہیں، بڑے ملک نواب کا پارہ بہت چڑھا ہوا ہوگا۔ غفورے جلدی کرو، بارش بھی آنے والی ہے''۔

O*O

محسن پور تھوڑے فاصلے پر رہ گیا تھا مگر یہ سب لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لئے ایک لمبا چکر کاٹ کر ملک جابر کے گاؤں سے باہر بنائے گئے ''بھروں'' (مٹی کے ٹیلوں کو کھود کر رہنے کے لئے غار نما کمرے بنائے جاتے ہیں) تک پہنچنا چاہتے تھے۔ ان غار نما مکانوں کو یہاں مقامی زبان میں ''بھرہ'' کہتے ہیں۔ یہ گرمیوں کے لئے خاص طور پر تیار کئے جاتے ہیں کیونکہ بھرہ گرمیوں میں انتہائی ٹھنڈا ہوتا ہے اور سردیوں میں گرم۔ اس لئے لوگ گاؤں سے باہر اکثر اپنے اور مال مویشیوں کے لئے یہی بھرے بناتے ہیں جو ان کے ڈیرے کا کام دیتا ہے۔ یہ بھرے جو تعداد میں چار تھے، ملک نواب کے والد ملک جبار نے کھدوائے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خستہ حالی کا شکار تھے مگر پھر بھی پناہ گاہ کا کام دیتے تھے۔

ملک نواب کا ایک پرانا ملازم دوست محمد (دوسا) عرصہ دراز سے یہاں رہ رہا تھا۔ وہ یہاں اکیلا رہتا تھا، چند ڈھور ڈنگر بھی ملک نواب کے یہیں دوسے کے سپرد تھے۔ قریبی زمینوں میں ملک نواب کا رہٹ لگا ہوا تھا۔ دوسا دن بھر کھیتوں میں محنت کرتا اور رات کو روکھی سوکھی کھا کر یہیں سو جاتا تھا۔ دراصل دوسے کے والد نے اس کی شادی کے لئے ملک نواب سے 120 روپے ادھار لئے تھے تو تب دوسے کی شادی ہوئی تھی اور طے یہ پایا تھا کہ دوسا بطور ہالی ''زمیندار'' کام کرے گا اور ساتھ ساتھ یہ رقم ادا کرتا رہے گا۔ جب تک رقم ختم نہیں ہوگی دوسا کہیں اور کام نہیں کر سکے گا۔

دوسے نے محنت اور ایمانداری سے کام کیا اور چند سالوں میں ملک نواب کے 60 روپے قرض واپس کر دیا۔ مگر اچانک دوسے کا والد مر گیا۔ دوسے نے والد

کے کفن دفن کے لئے ملک نواب سے مزید 50 روپے ادھار لے لیا۔ اب پھر یہ رقم بڑھ کر 100 روپے ہوگئی تھی۔ دوسے نے اپنی محنت جاری رکھی اور دس سالوں میں ملک نواب کو 100 روپے قرض واپس کر دیا۔ مگر تاحال 10 روپے قرض باقی تھا۔

دوسے کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بڑی بیٹی نے بڑی جلدی قد کاٹھ نکال لیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہر روز ملک جابر کے گھر جھاڑو پونچھا لگانے کے لئے جاتی تھی۔ ماں نے بیٹی کو جوان ہوتے دیکھا تو جھٹ سے اس کا رشتہ طے کر دیا۔ رشتے والوں کو جلدی تھی مگر گھر میں پھوٹی کوڑی بھی موجود نہ تھی۔ خاوند بیوی نے صلاح مشورہ کیا اور ایک بار پھر ملک نواب سے قرض لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ مگر آج دوسے کے ساتھ اس کی بیوی ''ریشماں'' بھی جانے کے لئے تیار تھی۔ سورج طلوع ہوتے ہی دوسا اور ریشماں ملک نواب کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ رحمت جو ملک نواب کے ڈیرے کا نگران تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔

''او دوسے! آج خیر تو ہے صبح صبح آمد ہوگئی ہے؟''

''ویرا! آج ملک صاحب کے سلام کو حاضر ہوئے ہیں''۔ ریشماں نے فوراً جواب دیا۔

''نہ ریشماں! آج کوئی خاص بات ہے۔ مجھ سے تم چھپا رہے ہو''۔

دوسا سیدھا سادہ انسان تھا۔ ~~ہوئے~~ رحمت بھائی! ہم نے اپنی کاکی (بیٹی) کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ بس اب اس کی ڈولی اٹھانی ہے۔ اس لئے ملک صاحب کے پاس حاضر ہوئے ہیں''۔

''اچھا تو یہ بات ہے! اپنی غرض لے کر آئے ہو؟''

''ہاں، ویرا!'' ریشماں نے روہانسا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

ملک نواب ڈیوڑھی سے باہر آیا۔

''سلام ملک جی...... سلام علیکم ملک جی!''

دوسے اور ریشماں نے آگے بڑھ کر خوشامدانہ انداز میں جھک کر سلام کیا۔

''اوئے خیر ہو، ریشماں! آج کیسے صبح صبح ڈیرے پر ہو؟''

''او ملک جی! بس او جی......'' دوسا جھجکتے ہوئے بولا۔

''کیا او جی او جی لگا رکھی ہے، جلدی کرو بات بتاؤ''۔ ملک نواب پلنگ پر بیٹھتے ہوئے غصے سے بولا۔

ریشماں اور دوسا ملک نواب کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ ریشماں قدرے ہمت کرتے ہوئے بولی۔

''ملک جی! وہ دراصل ہم نے اپنی کاکی کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ وہ ''سلیمے'' (سلیم) مصلی کے کاکے (لڑکے) سے۔ بس کچھ پیسے چاہئے تھے''۔

''دیکھ ریشماں! تیری شادی پر بھی اس کے باپ نے قرض لیا تھا جو آج تک چکتا نہیں کر سکا دوسا۔ اب اور مانگنے آ گئے ہو۔ اب تو تم دونوں بوڑھے ہو گئے ہو۔ تمہارے پیچھے قرض کون اتارے گا۔

''مائی باپ!'' دوسے نے کہا۔ ''میں آپ کی ایک ایک پائی ادا کر دوں گا''۔

''ملک جی!'' ریشماں عاجزی سے بولی۔ ''اگر ہم دونوں مر بھی گئے تو ہمارا بیٹا اب ہل چلانے کے قابل ہے، وہ قرض چکتا کرے گا۔ آخر اولاد ہے ہماری''۔

''ٹھیک ہے، زیادہ کہانیاں مجھے نہ سناؤ۔ کتنے پیسوں سے کام چلے گا تمہارا''۔ ملک نواب نے کہا۔

''ملک جی! بس سو روپے میں کام چلا لیں گے۔ ذرا برادری میں ناک بھی تو بچانی ہے''۔ دوسے نے ملک نواب کو بتایا۔

''ٹھیک ہے، دو دن بعد آ کر لے جانا۔ اب جاؤ کام پر سورج نکل آیا ہے۔ مال مویشیوں کو جا کر چارہ ڈالو کافی دیر ہوگئی ہے''۔

''اللہ آپ کی حیاتی کرے، ملک جی! آپ ہی ہمارا مان ہیں''۔ دامن پھیلا کر ریشماں ملک نواب کو دعائیں دیتے ڈیرے سے باہر نکل آئے۔

دونوں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

''میں تو دوسے! اپنی کاکی کے سارے ارمان اب پورے کروں گی۔ سب سے بڑھ کر جہیز دوں گی۔ ساری برادری والی خواتین کو میں حیران کر دوں گی''۔

''بس ٹھیک ہے ریشماں! جیسے چاہتا کر لینا۔ اب میں سیدھا باہر بھروں پر جاتا ہوں۔ رہٹ بھی چلانا ہے۔ ذرا پانی زمین کو لگانا ہے۔ اس لاڈلے کو ذرا جلدی میری طرف بھیج دینا۔ اب کام کاج کے قابل ہو گیا ہے''۔

دوسا صبح سے لے کر شام تک کام میں جتا رہا۔ ملک جابر کے سارے سیاہ کارنامے اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتے تھے۔ وہ تو غریب آدمی تھا اور ان کے خاندان کے قرض تلے دبا ہوا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی ملک جابر کو روک نہیں سکتا تھا۔

عصر تک سیاہ بادلوں نے پورے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور گرج چمک کے ساتھ موسلادھار بارش شروع ہوگئی تھی۔ بارش کے ساتھ آندھی اور طوفان بہت زور کا تھا۔ بجلی کی چمک سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں اور کڑک سے دل دہل رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے خدا کو آج بہت غصہ آیا ہوا ہے اور خدا ملک جابر کے ظلم سے سخت ناراض ہے۔

ادھر تیز بارش اور آندھی میں ملک جابر اور اس کے باقی دو ساتھی مسلسل سیتا کو دھکیلتے گھسیٹتے غیر معروف راستوں پر گامزن تھے۔ تیز بارش سے ہر طرف جل تھل ہو گیا تھا۔ یہ لوگ پانی میں گرتے پڑتے منزل کو رواں دواں تھے۔

مغرب کے قریب ملک نواب اپنے ساتھیوں اور نیم مردہ سیتا کے ساتھ دوسے کے پاس اپنے بھروں پر آ دھمکے۔

''او دوسے...... او دوسیا!'' ملک جابر چلایا۔ ''پتا نہیں آج کدھر مر گیا ہے۔ یہ بوڑھا بھی اب کسی کام کا نہیں ہے، اب اسے چلتا کرنا چاہئے۔ او دوسے مریل کدھر ہو؟'' ملک جابر چند آوازیں کسنے کے بعد ایک بھرے میں داخل ہوا۔ باہر ابھی تک بارش جاری تھی پر طوفان اب ٹھہر گیا تھا۔

جی...... جی بابو جی!'' بھیگے کپڑوں کے ساتھ گرتا پڑتا دوسا آیا۔ ''اللہ خیر کرے آج اتنے طوفان میں خیر تو ہے؟ میں ذرا وہ بکریوں کو اندر باندھ رہا تھا۔ اس لئے دیر ہوگئی ہے''۔

''بس بس کام چور کہیں کا۔ اب زیادہ زبان نہ چلا میرا دماغ پہلے کا گھوما ہوا ہے۔ زیادہ مَیں مَیں کی تو زبان کھینچ دوں گا تیری۔ اندر آ ذرا غور سے میری بات سن۔ یہ چند دن کے لئے ایک مہمان کو تمہارے پاس چھوڑ رہا ہوں، اس کا دھیان رکھنا۔ بہت چالاک ہے، اس کے مکر میں نہ آنا اور ہاں کسی سے ذکر بھی نہ کرنا۔ بڑے ملک صاحب سے بھی۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات کی تو میرے اچھی طرح واقف ہو، وہ تمہاری کاکی بھی جوان ہوگئی ہے۔ سمجھ گئے ہو ناں!'' ملک جابر نے تحکمانہ انداز میں دوسے کو ہدایات دیں۔

''لے آ ذرا وہ سنگل (زنجیر) اور وہ تالا بھی۔ دیکھ غورے! ٹھیک طرح سے اس چڑیا کے پر باندھ دینا تاکہ اُڑنے کے قابل نہ رہے''۔

سیتا بت بنی گیلے کپڑوں میں سردی سے کانپ

www.urdusoftbooks.net

رہی تھی۔ بارش اور تھکاوٹ کی وجہ سے وہ بُری طرح بخار میں پھنک رہی تھی۔ دوسا جھٹ سے بھینسوں والا موٹا سنگل نکال کر لے آیا اور ہاتھ میں تالا بھی۔ دوسے نے اندھیرے میں ٹٹول کر ماچس نکالی اور دیا جلا دیا۔ غفورے نے کریمے کی مدد سے زنجیر سیتا کے پاؤں سے گزار کر پنڈلی پر تنگ کر کے تالا لگا دیا۔ زنجیر کا دوسرا سرا انہوں نے پہلے ہی کھونٹے سے باندھ دیا تھا۔

سیتا کی معصوم جان اور اس پر اتنے مظالم، بس وہ چپ چاپ کھڑی اپنی تقدیر کے بدلتے لمحوں کو دیکھ رہی تھی۔ دل میں طرح طرح کے خیالات اور ماتا پتا اور بھائی گوبی کا رہ رہ کر اسے خیال آ رہا تھا۔ وہ رونا چاہتی تھی جی بھر کے پر اس پر یہاں کسی کو ترس نہیں آ تا تھا۔ یہ لوگ تو سچ مچ بھیڑیے تھے۔ سیتا کو وزنی زنجیروں سے جکڑنے کے بعد غفورہ اور کریما ملک جابر پاس آئے۔

’’اچھی طرح باندھ دیا ہے، اب اس کا باپ بھی نہیں کھول سکتا‘‘۔

’’ٹھیک ہے‘‘۔ ملک جابر نے کہا۔

’’دیکھ دوسے! اسے کھول نہ دینا‘‘۔ ملک جابر نے دوسے کو ہدایت کی۔ ’’کہیں یہ چڑیا میرے واپس آنے سے پہلے آزاد نہ ہو جائے۔ بہت تکلیف اٹھائی ہے میں نے اس کی خاطر۔ اچھی طرح دھیان سے رات کو سو نہ جانا خیال رکھنا۔ اور ہاں ذرا وہ شیرو (کتے) کو دروازے کے سامنے باندھ دینا۔ اگر یہ زیادہ گڑبڑ کرے تو شیرو کو اس پر چھوڑ دینا۔ تکہ بوٹی کر دے گا اس کی‘‘۔

دوسے نے خوب موٹے تازے کتے کو دروازے کے سامنے باندھ دیا اور خود چارپائی بھرے کے دروازے میں بچھا کر لیٹ گیا۔

’’ہاں، اسے کچھ روٹی پانی بھی دے دینا، بڑے سوگ میں ہے یہ‘‘۔

بارش رک چکی تھی۔ ملک جابر، غفورہ اور کریما گاؤں کو روانہ ہوئے۔ دوسے کا بیٹا اور چھوٹی بیٹی بارش تھمتے ہی دوسے کے لئے رات کا کھانا لے کر آ گئے۔

’’آج بہت دیر کر دی ہے تم لوگوں نے؟‘‘

’’ابا بارش بہت زیادہ تھی، اب بھی بڑی مشکل سے پہنچے ہیں‘‘۔

’’ٹھیک ہے‘‘۔ دوسے نے کہا۔ ’’روٹی مجھے دے دو، برتن صبح تمہاری ماں لے جائے گی اور ہاں جلدی جلدی گھر پہنچو کہیں پھر بارش شروع نہ ہو جائے۔ او کاکے! ماں کو کہنا ذرا صبح جلدی آ جائے، دوپہر چڑھا کر آتی ہے‘‘۔ دوسے نے کھانے کے برتن لے کر چارپائی پر رکھ دیئے اور بچوں کو واپس روانہ کر دیا۔

دوسے نے دیے کی لو کو درست کیا اور اٹھا کر سیتا کے سامنے اونچی جگہ پر رکھ دیا اور کھانے کے برتن بھی اٹھا کر سیتا کے سامنے رکھ دیئے۔ سیتا مسلسل سر جھکائے بیٹھی رہی۔

’’یہ کھانا کھا لو‘‘۔ دوسا ہلکی آواز میں سیتا سے کہہ رہا تھا۔ ’’دیکھو کھانا کھا لو، ملک صاحب کہہ رہے تھے کہ تم نے دن کو بھی کچھ نہیں کھایا‘‘۔

سیتا ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی، اس کے بال اور پورا لباس بھیگا ہوا تھا۔ دوسے نے سیتا کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

’’اٹھ بیٹی! اٹھ سر تو اوپر کرو‘‘۔ دوسے کی لرزتی آواز اور میٹھے لہجے نے سیتا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

سیتا نے سر کو اوپر اٹھایا اب اس کا چہرہ دیے کی لو میں واضح نظر آ رہا تھا۔

دوسے نے غور سے بھیگی ہوئی معصوم سی ہرنی جیسی سیتا کو دیکھا تو اس کا دل موم کی طرح پگھلنے لگا۔ پھر بے اختیار اس کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی۔

(جاری ہے)

کشمیر جنت نظیر کی روٹھی ہوئی لیلیٰ حریت کو منانے کی روداد خونچکاں کا ایک لہو رنگ باب۔ وہی وادیٔ کشمیر جو کسی زمانے میں ’’ستی سر‘‘ کے نام سے ایک وسیع و عریض جھیل تھی۔ پھر ’’کشپ میر‘‘ ہوئی۔ ہجرت کر کے آنے والے بنی اسرائیلی قبائل نے جسے ’’کشمیر‘‘ کہا۔ اس خطہ زمین پر جنم لینے والی کہانی جو بارہ دریاؤں کی سرزمین ہونے کے باوجود صدیوں سے تشنہ لب ہے۔ وہ سرزمین جس کے حرماں نصیب ’’دسنیک‘‘ دستِ وفا پر دل سجا کر آگ اور لہو کے سمندر میں ڈوب چکے ہیں، جہاں مہکتے پھولوں کو جلا کر راکھ کر دینے کی رسم بد ایجاد ہوئی۔ شاعروں کے تخیل سے حسین سرزمین، نور و نکہت کی دل نواز وادی جسے ’’جنتِ سوزاں‘‘ کہا جا رہا ہے۔ اس جنتِ سوزاں میں جلتے پگھلتے پروانوں کا فسانہ۔

خصوصی کہانی

جنّتِ سوزاں

☆ اختر حسین شیخ

منظر اس قدر ہولناک تھا کہ گھنے درخت کی شاخوں میں چھپے بیٹھے حوالدار اوم پرکاش کے وہ جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ جسم و جاں کی ساری قوت سلب ہوگئی اور خوف و دہشت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایسا سفاکانہ فعل اس نے کبھی دیکھا، نہ سنا۔ دن کی اجلی روشنی میں اس کا کمانڈر کرنل وشواناتھ ایک درخت سے الٹا لٹکا ہوا تھا اور سیاہ لباس میں ملبوس ایک چوبیں پچیس برس کا نوجوان بڑے ماہرانہ انداز میں اس کی کھال کھینچ رہا تھا بالکل ویسے ہی جیسے ایک قصاب ذبح کئے ہوئے بکرے کی کھال اتارتا ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ بکرا اس تجربے سے گزرتے وقت بے جان ہو چکا ہوتا ہے جب کہ کرنل وشواناتھ زندہ سلامت تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

شاخوں اور پتوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے حولدار نے آنکھیں بند کر کے دہشت کی یلغار سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر خوف تو اس کے اندر، دل و دماغ پہ قابض تھا۔ بصارت کے وسیلوں کا کیا قصور؟ چنانچہ بند آنکھوں کے باوجود ہولناک منظر پوری وضاحت سمیت اس کے سامنے موجود رہا۔ رفتہ رفتہ دو شاخے پر اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ ہوش کی وادی سے رخصت ہو کر وہ عالم تسلیم و رضا کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔

کرنل وشواناتھ اور حوالدار اوم پرکاش علی الصبح اودھم پور کی چھاؤنی سے کشتواڑ کے لئے روانہ ہوئے تھے جو ایک فوجی ہوائی اڈا ہے۔ سری نگر کا ہوائی مستقر تو بین الاقوامی معیار کا ہے مگر اودھم پور اور کشتواڑ کے ہوائی اڈے صرف فوجی مقاصد کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ سول جہازوں کی آمدورفت ممنوع ہے۔

اوم پرکاش اور وشواناتھ میں فوجی تعلق کے علاوہ بھی ایک گہرا رشتہ تھا۔ دونوں بدنام زمانہ آر ایس ایس (راشٹریہ سیوک سنگھ) کے سرگرم کارکن تھے اور کشمیری نہتے مسلمانوں پر نت نئے ستم ایجاد کرنے میں مشہور تھے۔ وشواناتھ تو آر ایس ایس کے بانی کے بی ہیڈ گیوار کا خاص منظورِ نظر تھا۔ دونوں ایسے ایسے معرکے سر کر چکے تھے کہ ''دھرم سیوک'' کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ اودھم پور سے بنوت تک کا فاصلہ پہلے تو بخیر وخوبی طے ہوا پھر بیس میل کے بعد پہلی بدشگونی ہوئی۔ جیپ کا پچھلا ٹائر پھٹ گیا۔ پہیہ تبدیل کر کے آخری پانچ میل کا سفر طے کیا گیا۔ بنوت کشتواڑ روڈ پر ڈوڈہ کے قریب دوسری بدشگونی نے وشواناتھ کا خوشگوار موڈ تباہ کر کے رکھ دیا۔ سامنے سے آنے والی بس کا ٹائی راڈ کھل گیا، وہ بدمست شرابی کی طرح جھولتی چلی آ رہی تھی۔ بھگوان کی سہائتا میسر نہ آتی تو حادثہ یقینی تھا۔ فرائض کا سوال نہ ہوتا تو دونوں سفر ملتوی کر کے واپس ہو لیتے مگر کشتواڑ پہنچنا ضروری تھا۔ لہٰذا سفر جاری رہا۔

کشتواڑ پہنچنے سے پہلے ہی ایک ناقابل یقین بات ہوگئی۔ سڑک کے عین درمیان ایک گھوڑ سوار راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس کی سٹین گن کی اکلوتی آنکھ کا رخ وشواناتھ کی طرف تھا۔ وادیٔ کشمیر کے باشندے تو امن کی فاختہ کی طرح معصوم تھے مگر سامنے کھڑا سیاہ پوش ان کے سارے اندازے غلط ثابت کر رہا تھا۔ کلجگ تھا یا اندھیر نگری جو کچھ بھی تھا، ان کے سامنے تھا۔ سوار کا چہرہ زیرِ نقاب تھا مگر آنکھوں سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ حوالدار نے ہنگامی انداز میں بریک لگائی۔ وشواناتھ عالم طیش میں کود کر باہر نکلا۔ اس کا ہاتھ برق رفتاری سے پہلو میں لٹکے ریوالور کی طرف گیا مگر سٹین گن سے صرف ایک فائر ہوا اور وشواناتھ کی کلائی ناکارہ ہوگئی۔ حوالدار نے جیپ بھگا لے جانے کی ناکام کوشش کی۔ سوار کے گلے سے جنگلی درندے جیسی غراہٹ خارج ہوئی جیسے شیر ہر تنبیہہ کرنے والے انداز میں دہاڑتا ہے۔ ساتھ ہی سٹین گن کا مختصر سا قہقہہ بھی تھا۔ جیپ کے دونوں ٹائر

ہٹ گئے اور ڈرائیور منجمد ہو کے رہ گیا۔ سوار نے زبان ہلائے بغیر دونوں کے ذہنوں تک پیغام پہنچا دیا تھا، دونوں پیشہ ور جنگ جو تھے، وہ حریف کے ارادوں سے فوراً واقف ہو گئے۔ بظاہر بات ہو چکی تھی مگر مذاکرات کالاراستہ باقی تھا۔ کرنل اور حوالدار دونوں کے دلوں میں بیک وقت ایک ہی خیال آیا ''شبھ گھڑی'' کا انتظار کیا جائے۔

سیاہ پوش نے مناسب ترین جگہ کا انتخاب کیا تھا، سڑک سے تھوڑے فاصلے پر جنگل تھا۔ اس نے سٹین گن سے اشارہ کیا، دونوں اس کے آگے آگے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گئے، سوار بڑے اطمینان سے ان کے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ ''جب تک سانس تب تک آس'' کے مصداق دونوں فوجی، امید کا دامن تھامے، غلط حرکت کا ارتکاب کئے بغیر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہ انہیں ہتھیار کا خوف تھا یا سوار کی دہشت، اس بات کا بہرحال دونوں کو یقین تھا کہ غلط قدم اٹھتے ہی دونو گولیوں سے چھلنی ہو جائیں گے۔

''سٹین گن میں کم از کم بائیس گولیاں ابھی باقی ہیں''۔ وشواناتھ نے دھیمے لہجے میں حوالدار سے کہا۔ ''موقعے کا انتظار کرو''۔

''یہ سوار بالکل اناڑی معلوم ہوتا ہے، سنہری موقع تو خود فراہم کر رہا ہے''۔ حوالدار نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' کرنل نے کنکھیوں سے اپنے ساتھی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ درخت ہماری رکھشا کریں گے، اگر ہم مختلف سمتوں میں بھاگنا شروع کر دیں تو جان بچ سکتی ہے''۔

''بالکل ٹھیک''۔ کرنل نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ ''دس قدم کے بعد تم دائیں جانب، میں بائیں جانب بھاگوں گا، اب خاموش ہو جاؤ''۔

گیارہویں قدم پر دونوں چھلانگیں لگا کر درختوں کی آڑ میں ہو گئے۔ فائر کی آواز گونجی، نہ جنگلی درندے جیسی غراہٹ سنائی دی۔ دونوں کے دل موت کے منہ سے بچ جانے پر خوشی سے بلیوں اچھل رہے تھے۔

موت کی دہشت سے نجات ملی تو درد کی ٹیسوں نے وشواناتھ کو ہلا کے رکھ دیا۔ مسلسل بھاگ دوڑ سے خون کے اخراج میں تیزی آئی، کلائی کو اس نے رومال سے مضبوط باندھ لیا تاکہ خون کا ضیاع کم سے کم ہو۔ اسے بخوبی علم تھا کہ فوری طبی امداد بے حد ضروری ہے۔ بہرحال اس کی احتیاطی تدبیر کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ خون بہنا تقریباً بند ہوگیا۔ ایک تو انسانی خون میں منجمد ہو جانے کی ازلی صلاحیت موجود ہوتی ہے دوسرے بارود کی موجودگی بھی کسی نہ کسی حد تک زخم کے اندمال میں مدد دیتی ہے مگر درد کے طوفان کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ زخم آئے تو کس نوعیت کا درد ساتھ آتا ہے۔ بھاگ دوڑ میں اس کی ٹوپی کہیں گر چکی تھی۔ گنبدِ سر بے دستار ہوا تو توہین کا احساس جاگا مگر وہ وقت توہین محسوس کرنے کا نہ تھا، نقد جاں کے بچاؤ کا تھا۔ خوف کے زیر اثر بھاگنے کی وجہ سے جلد ہی اس کی سانس پھولنے لگی۔ پتا بھی ہلتا تو وہ چونک جاتا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ اسے سمت کا احساس نہ رہا۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ وہ دائرے میں بھاگ رہا ہے یا ایک سمت میں۔

وقت کے ساتھ ساتھ دہشت میں کمی واقع ہوئی تو ایک جگہ رک کر وہ اپنی سانسوں پر قابو پانے لگا۔ کچھ پیشے کے وقار کا خیال، کچھ تربیت کا اثر، پھر حاکمیت کا نشہ، سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ حوصلے کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا مل گیا۔

سب سے پہلے اس نے ریوالور نکال کر الٹے ہاتھ میں پکڑا۔ سیفٹی کیچ ہٹا کر انگلی ٹریگر پر رکھ لی، اب وہ ہر خطرے کا مقابلہ مردانہ وار کرنے کو تیار تھا۔ ہتھیار ایک

وہ منظر اس قدر ہولناک تھا کہ گھنے درخت کی شاخوں میں چھپے بیٹھے حوالدار اوم پرکاش کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ جسم و جاں کی ساری قوت سلب ہوگئی اور خوف و دہشت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایسا سفاکانہ فعل اس نے کبھی دیکھا، نہ سنا۔ دن کی اجلی روشنی میں اس کا کمانڈر کرنل وشوانا تھ ایک درخت سے الٹا لٹکا ہوا تھا اور سیاہ لباس میں ملبوس ایک چوبیس پچیس برس کا نوجوان بڑے ماہرانہ انداز میں اس کی کھال کھینچ رہا تھا بالکل ویسے ہی جیسے ایک قصاب ذبح کئے ہوئے بکرے کی کھال اتارتا ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ بکرا اس تجربے سے گزرتے وقت بے جان ہو چکا ہوتا ہے جب کہ کرنل وشوانا تھ زندہ سلامت تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

شاخوں اور پتوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے حولدار نے آنکھیں بند کر کے دہشت کی یلغار سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر خوف تو اس کے اندر، دل و دماغ پہ قابض تھا۔ بصارت کے وسیلوں کا کیا قصور؟ چنانچہ بند آنکھوں کے باوجود ہولناک منظر پوری وضاحت سمیت اس کے سامنے موجود رہا۔ رفتہ رفتہ دو شاخے پر اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ ہوش کی وادی سے رخصت ہو کر وہ عالم تسلیم و رضا کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔

کرنل وشوانا تھ اور حوالدار اوم پرکاش علی الصبح اودھم پور کی چھاؤنی سے کشتواڑ کے لئے روانہ ہوئے تھے جو ایک فوجی ہوائی اڈا ہے۔ سری نگر کا ہوائی مستقر تو بین الاقوامی معیار کا ہے مگر اودھم پور اور کشتواڑ کے ہوائی اڈے صرف فوجی مقاصد کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ سول جہازوں کی آمد و رفت ممنوع ہے۔

اوم پرکاش اور وشوانا تھ میں فوجی تعلق کے علاوہ بھی ایک گہرا رشتہ تھا۔ دونوں بدنام زمانہ آر ایس ایس (راشٹریہ سیوک سنگھ) کے سرگرم کارکن تھے اور کشمیری نہتے مسلمانوں پر نت نئے ستم ایجاد کرنے میں مشہور تھے۔ وشوانا تھ تو آر ایس ایس کے بانی کے بی ہیڈ گیوار کا خاص منظور نظر تھا۔ دونوں ایسے ایسے معرکے سر کر چکے تھے کہ ''دھرم سیوک'' کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ اودھم پور سے بٹوت تک کا فاصلہ پہلے تو بخیر و خوبی طے ہوا پھر تیس میل کے بعد پہلی بدشگونی ہوئی۔ جیپ کا پچھلا ٹائر پھٹ گیا۔ پہیہ تبدیل کر کے آخری پانچ میل کا سفر طے کیا گیا۔ بٹوت کشتواڑ روڈ پر ڈوڈہ کے قریب دوسری بدشگونی نے وشوانا تھ کا خوشگوار موڈ تباہ کر کے رکھ دیا۔ سامنے سے آنے والی بس کا ٹائی راڈ کھل گیا، وہ بدمست شرابی کی طرح جھولتی چلی آ رہی تھی۔ بھگوان کی سہائتا میسر نہ آتی تو حادثہ یقینی تھا۔ فرائض کا سوال نہ ہوتا تو دونوں سفر ملتوی کر کے واپس ہو لیتے مگر کشتواڑ پہنچنا ضروری تھا۔ لہٰذا سفر جاری رہا۔

کشتواڑ پہنچنے سے پہلے ہی ایک ناقابل یقین بات ہوگئی۔ سڑک کے عین درمیان ایک گھوڑ سوار راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس کی شین گن کی اکلوتی آنکھ کا رخ وشوانا تھ کی طرف تھا۔ وادیٔ کشمیر کے باشندے تو امن کی فاختہ کی طرح معصوم تھے مگر سامنے کھڑا سیاہ پوش ان کے سارے اندازے غلط ثابت کر رہا تھا۔ کلجگ تھا یا اندھیر نگری جو کچھ بھی تھا، ان کے سامنے تھا۔ سوار کا چہرہ زیر نقاب تھا مگر آنکھوں سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ حوالدار نے ہنگامی انداز میں بریک لگائی۔ وشوانا تھ عالم طیش میں کود کر باہر نکلا۔ اس کا ہاتھ برق رفتاری سے پہلو میں لٹکے ریوالور کی طرف گیا مگر شین گن سے صرف ایک فائر ہوا اور وشوانا تھ کی کلائی ناکارہ ہوگئی۔ حوالدار نے جیپ بھگا لے جانے کی ناکام کوشش کی۔ سوار کے گلے سے جنگلی درندے جیسی غراہٹ خارج ہوئی جیسے شیر ببر تنبیہہ کرنے والے انداز میں دہاڑتا ہے۔ ساتھ ہی شین گن کا مختصر سا قہقہہ بھی تھا۔ جیپ کے دونوں ٹائر

پھٹ گئے اور ڈرائیور منجمد ہو کے رہ گیا۔ سوار نے زبان ہلائے بغیر دونوں کے ذہنوں تک پیغام پہنچا دیا تھا، دونوں پیشہ ور جنگ جو تھے، وہ حریف کے ارادوں سے فوراً واقف ہو گئے۔ بظاہر بات ہو چکی تھی مگر مذاکرات والا راستہ باقی تھا۔ کرنل اور حوالدار دونوں کے دلوں میں بیک وقت ایک ہی خیال آیا ''شبھ گھڑی'' کا انتظار کیا جائے۔

سیاہ پوش نے مناسب ترین جگہ کا انتخاب کیا تھا، سڑک سے تھوڑے فاصلے پر جنگل تھا۔ اس نے شین گن سے اشارہ کیا، دونوں اس کے آگے آگے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گئے، سوار بڑے اطمینان سے ان کے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ ''جب تک سانس تب تک آس'' کے مصداق دونوں فوجی، امید کا دامن تھامے، غلط حرکت کا ارتکاب کئے بغیر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہ انہیں ہتھیار کا خوف تھا یا سوار کی دہشت، اس بات کا بہرحال دونوں کو یقین تھا کہ غلط قدم اٹھتے ہی دونو گولیوں سے چھلنی ہو جائیں گے۔

''سٹین گن میں کم از کم بائیس گولیاں ابھی باقی ہیں''۔ وشوانا تھ نے دھیمے لہجے میں حوالدار سے کہا۔ ''موقعے کا انتظار کرو''۔

''یہ سوار بالکل اناڑی معلوم ہوتا ہے، سنہری موقع وہ خود فراہم کر رہا ہے''۔ حوالدار نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' کرنل نے کنکھیوں سے اپنے ساتھی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ درخت ہماری رکھشا کریں گے، اگر ہم مختلف سمتوں میں بھاگنا شروع کر دیں تو جان بچ سکتی ہے''۔

''بالکل ٹھیک''۔ کرنل نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ ''دس قدم کے بعد تم دائیں جانب، میں بائیں جانب بھاگوں گا، اب خاموش ہو جاؤ''۔

گیارہویں قدم پر دونوں چھلانگیں لگا کر درختوں کی آڑ میں ہو گئے۔ فائر کی آواز گونجی، نہ جنگلی درندے جیسی غراہٹ سنائی دی۔ دونوں کے دل موت کے منہ سے بچ جانے پر خوشی سے بلیوں اچھل رہے تھے۔

موت کی دہشت سے نجات ملی تو درد کی ٹیسوں نے وشوانا تھ کو ہلا کے رکھ دیا۔ مسلسل بھاگ دوڑ سے خون کے اخراج میں تیزی آئی، کلائی کو اس نے رومال سے مضبوط باندھ لیا تاکہ خون کا ضیاع کم سے کم ہو۔ اسے بخوبی علم تھا کہ فوری طبی امداد بے حد ضروری ہے۔ بہرحال اس کی احتیاطی تدبیر کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ خون بہنا تقریباً بند ہو گیا۔ ایک تو انسانی خون میں منجمد ہو جانے کی ازلی صلاحیت موجود ہوتی ہے دوسرے بارود کی موجودگی بھی کسی نہ کسی حد تک زخم کے اندمال میں مدد دیتی ہے مگر درد کے طوفان کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ زخم آئے تو کس نوعیت کا درد ساتھ آتا ہے۔ بھاگ دوڑ میں اس کی ٹوپی کہیں گر چکی تھی۔ گنبد سر بے دستار ہوا تو توہین کا احساس جاگا مگر وہ وقت توہین محسوس کرنے کا نہ تھا، نقد جاں کے بچاؤ کا تھا۔ خوف کے زیر اثر بھاگنے کی وجہ سے جلد ہی اس کی سانس پھولنے لگی۔ پتا بھی ہلتا تو وہ چونک جاتا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ اسے سمت کا احساس نہ رہا۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ وہ دائرے میں بھاگ رہا ہے یا ایک سمت میں۔

وقت کے ساتھ ساتھ دہشت میں کمی واقع ہوئی تو ایک جگہ رک کر وہ اپنی سانسوں پر قابو پانے لگا۔ کچھ پیشے کے وقار کا خیال، کچھ تربیت کا اثر، پھر حاکمیت کا نشہ، سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ حوصلے کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا مل گیا۔

سب سے پہلے اس نے ریوالور نکال کر الٹے ہاتھ میں پکڑا۔ سیفٹی کیچ ہٹا کر انگلی ٹریگر پر رکھ لی، اب وہ ہر خطرے کا مقابلہ مردانہ وار کرنے کو تیار تھا۔ ہتھیار ایک

وہ منظر اس قدر ہولناک تھا کہ گھنے درخت کی شاخوں میں چھپے بیٹھے حوالدار اوم پرکاش کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ جسم و جاں کی ساری قوت سلب ہوگئی اور خوف و دہشت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایسا سفاکانہ فعل اس نے کبھی دیکھا، نہ سنا۔ دن کی اجلی روشنی میں اس کا کمانڈر کرنل وشواناتھ ایک درخت سے الٹا لٹکا ہوا تھا اور سیاہ لباس میں ملبوس ایک چوبیس پچیس برس کا نوجوان بڑے ماہرانہ انداز میں اس کی کھال کھینچ رہا تھا بالکل ویسے ہی جیسے ایک قصاب ذبح کئے ہوئے بکرے کی کھال اتارتا ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ بکرا اس تجربے سے گزرتے وقت بے جان ہو چکا ہوتا ہے جب کہ کرنل وشواناتھ زندہ سلامت تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

شاخوں اور پتوں کی اوٹ میں چھپے ہوئے حولدار نے آنکھیں بند کر کے دہشت کی یلغار سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر خوف تو اس کے اندر، دل و دماغ پہ قابض تھا۔ بصارت کے وسیلوں کا کیا قصور؟ چنانچہ بند آنکھوں کے باوجود ہولناک منظر پوری وضاحت سمیت اس کے سامنے موجود رہا۔ رفتہ رفتہ دوشاخے پر اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ ہوش کی وادی سے رخصت ہو کر وہ عالم تسلیم و رضا کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا۔

کرنل وشواناتھ اور حوالدار اوم پرکاش علی الصبح اودھم پور کی چھاؤنی سے کشتواڑ کے لئے روانہ ہوئے تھے جو ایک فوجی ہوائی اڈا ہے۔ سری نگر کا ہوائی مستقر تو بین الاقوامی معیار کا ہے مگر اودھم پور اور کشتواڑ کے ہوائی اڈے صرف فوجی مقاصد کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ سول جہازوں کی آمد و رفت ممنوع ہے۔

اوم پرکاش اور وشواناتھ میں فوجی تعلق کے علاوہ بھی ایک گہرا رشتہ تھا۔ دونوں بدنام زمانہ آر ایس ایس (راشٹریہ سیوک سنگھ) کے سرگرم کارکن تھے اور کشمیری نہتے مسلمانوں پر نت نئے ستم ایجاد کرنے میں مشہور تھے۔ وشواناتھ تو آر ایس ایس کے بانی کے بی ہیڈگیوار کا خاص منظورِ نظر تھا۔ دونوں ایسے ایسے معرکے سر کر چکے تھے کہ ''دھرم سیوک'' کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ اودھم پور سے بٹوت تک کا فاصلہ پہلے تو بخیر و خوبی طے ہوا پھر بیس میل کے بعد پہلی بدشگونی ہوئی۔ جیپ کا پچھلا ٹائر پھٹ گیا۔ پہیہ تبدیل کر کے آخری پانچ میل کا سفر طے کیا گیا۔ بٹوت کشتواڑ روڈ پر ڈوڈہ کے قریب دوسری بدشگونی نے وشواناتھ کا خوشگوار موڈ تباہ کر کے رکھ دیا۔ سامنے سے آنے والی بس کا ٹائی راڈ کھل گیا، وہ بدمست شرابی کی طرح جھولتی چلی آ رہی تھی۔ بھگوان کی سہائتا میسر نہ آتی تو حادثہ یقینی تھا۔ فرائض کا سوال نہ ہوتا تو دونوں سفر ملتوی کر کے واپس ہو لیتے مگر کشتواڑ پہنچنا ضروری تھا۔ لہٰذا سفر جاری رہا۔

کشتواڑ پہنچنے سے پہلے ہی ایک ناقابل یقین بات ہوگئی۔ سڑک کے عین درمیان ایک گھوڑ سوار راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس کی سٹین گن کی اکلوتی آنکھ کا رخ وشواناتھ کی طرف تھا۔ وادیٔ کشمیر کے باشندے تو امن کی فاختہ کی طرح معصوم تھے مگر سامنے کھڑا سیاہ پوش ان کے سارے اندازے غلط ثابت کر رہا تھا۔ کلجگ تھا یا اندھیر نگری جو کچھ بھی تھا، ان کے سامنے تھا۔ سوار کا چہرہ زیرِ نقاب تھا مگر آنکھوں سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ حوالدار نے ہنگامی انداز میں بریک لگائی۔ وشواناتھ عالم طیش میں کود کر باہر نکلا۔ اس کا ہاتھ برق رفتاری سے پہلو میں لٹکے ریوالور کی طرف گیا مگر سٹین گن سے صرف ایک فائر ہوا اور وشواناتھ کی کلائی ناکارہ ہوگئی۔ حوالدار نے جیپ بھگا لے جانے کی ناکام کوشش کی۔ سوار کے گلے سے جنگلی درندے جیسی غراہٹ خارج ہوئی جیسے شیر ببر تنبیہہ کرنے والے انداز میں دہاڑتا ہے۔ ساتھ ہی سٹین گن کا مختصر سا قہقہہ بھی تھا۔ جیپ کے دونوں ٹائر

پھٹ گئے اور ڈرائیور منجمد ہو کے رہ گیا۔ سوار نے زبان ہلائے بغیر دونوں کے ذہنوں تک پیغام پہنچا دیا تھا، دونوں پیشہ ور جنگ جو تھے، وہ حریف کے ارادوں سے فوراً واقف ہو گئے۔ بظاہر بات ہو چکی تھی مگر مذاکرات والا راستہ باقی تھا۔ کرنل اور حوالدار دونوں کے دلوں میں بیک وقت ایک ہی خیال آیا ''شبھ گھڑی'' کا انتظار کیا جائے۔

سیاہ پوش نے مناسب ترین جگہ کا انتخاب کیا تھا، سڑک سے تھوڑے فاصلے پر جنگل تھا۔ اس نے سٹین گن سے اشارہ کیا، دونوں اس کے آگے آگے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گئے، سوار بڑے اطمینان سے ان کے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ ''جب تک سانس تب تک آس'' کے مصداق دونوں فوجی، امید کا دامن تھامے، غلط حرکت کا ارتکاب کئے بغیر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہ انہیں ہتھیار کا خوف تھا یا سوار کی دہشت، اس بات کا بہرحال دونوں کو یقین تھا کہ غلط قدم اٹھتے ہی دونو گولیوں سے چھلنی ہو جائیں گے۔

''سٹین گن میں کم از کم بائیس گولیاں ابھی باقی ہیں''۔ وشواناتھ نے دھیمے لہجے میں حوالدار سے کہا۔ ''موقع کا انتظار کرو''۔

''یہ سوار بالکل اناڑی معلوم ہوتا ہے، سنہری موقع تو خود فراہم کر رہا ہے''۔ حوالدار نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' کرنل نے کنکھیوں سے اپنے ساتھی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ درخت ہماری رکھشا کریں گے، اگر ہم مختلف سمتوں میں بھاگنا شروع کر دیں تو جان بچ سکتی ہے''۔

''بالکل ٹھیک''۔ کرنل نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ ''دس قدم کے بعد تم دائیں جانب، میں بائیں جانب بھاگوں گا، اب خاموش ہو جاؤ''۔

گیارہویں قدم پر دونوں چھلانگیں لگا کر درختوں کی آڑ میں ہو گئے۔ فائر کی آواز گونجی، نہ جنگلی درندے جیسی غراہٹ سنائی دی۔ دونوں کے دل موت کے منہ سے بچ جانے پر خوشی سے بلیوں اچھل رہے تھے۔

موت کی دہشت سے نجات ملی تو درد کی ٹیسوں نے وشواناتھ کو ہلا کے رکھ دیا۔ مسلسل بھاگ دوڑ سے خون کے اخراج میں تیزی آئی، کلائی کو اس نے رومال سے مضبوط باندھ لیا تاکہ خون کا ضیاع کم سے کم ہو۔ اسے بخوبی علم تھا کہ فوری طبی امداد بے حد ضروری ہے۔ بہرحال اس کی احتیاطی تدبیر کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ خون بہنا تقریباً بند ہو گیا۔ ایک تو انسانی خون میں منجمد ہو جانے کی ازلی صلاحیت موجود ہوتی ہے دوسرے بارود کی موجودگی بھی کسی نہ کسی حد تک زخم کے اندمال میں مدد دیتی ہے مگر درد کے طوفان کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ زخم آئے تو کس نوعیت کا درد ساتھ آتا ہے۔ بھاگ دوڑ میں اس کی ٹوپی کہیں گر چکی تھی۔ گنبد سر بے دستار ہوا تو توہین کا احساس جاگا مگر وہ وقت توہین محسوس کرنے کا نہ تھا، نقد جاں کے بچاؤ کا تھا۔ خوف کے زیرِ اثر بھاگنے کی وجہ سے جلد ہی اس کی سانس پھولنے لگی۔ پتا بھی ہلتا تو وہ چونک جاتا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ اسے سمت کا احساس نہ رہا۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ وہ دائرے میں بھاگ رہا ہے یا ایک سمت میں۔

وقت کے ساتھ ساتھ دہشت میں کمی واقع ہوئی تو ایک جگہ رک کر وہ اپنی سانسوں پر قابو پانے لگا۔ کچھ پیشے کے وقار کا خیال، کچھ تربیت کا اثر، پھر حاکمیت کا نشہ، سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ حوصلے کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا مل گیا۔

سب سے پہلے اس نے ریوالور نکال کر الٹے ہاتھ میں پکڑا۔ سیفٹی کیچ ہٹا کر انگلی ٹریگر پر رکھ لی، اب وہ ہر خطرے کا مقابلہ مردانہ وار کرنے کو تیار تھا۔ ہتھیار ایک

مضبوط سہارا ہوتا ہے مگر سب سے بڑا ہتھیار ''حوصلہ'' ہے جو صرف خود اعتمادی سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اپنی ذات پر سے اعتماد اٹھ جائے تو سارے ہتھیار ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ وشواناتھ کی پشت پر ایک جھاڑی میں ہلچل سی ہوئی اس نے اچھل کر فائر داغ دیا پھر گھوم کر دوسرا فائر کیا۔ جھاڑی سے ایک خوف زدہ خرگوش نکل کر بھاگا۔ ''بلڈی باسٹرڈ'' تیسرا فائر اس نے جھنجھلاہٹ میں بھاگتے ہوئے معصوم جانور پر کیا۔ پھر اسے اچانک اپنی ہمالیہ پہاڑ جیسی غلطی کا احساس ہوا۔ تین گولیوں کا ضائع ہو جانا اور اپنی ''پوزیشن'' کا اعلان کرنا...... اسے اپنی حماقت پہ بہت غصہ آیا اور غصہ ایک راستے سے آئے تو عقل دوسرے راستے سے فرار ہو جاتی ہے، یہ ایک ازلی ابدی حقیقت ہے۔

کشتواڑ کا علاقہ وشواناتھ کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ پھلوں کی فراوانی کے لئے مشہور تھا لیکن ثمربار شاخوں تلے رنگ رلیاں منانا اور بات تھی، مہیب جنگل میں موت کا سامنا چیزے دیگر است۔

اس جنگل میں وشواناتھ کی اطلاع کے مطابق گیدڑ، لومڑ، باز اور کستوری ہرن بکثرت پائے جاتے تھے۔ یہاں تک تو بات تشویش ناک نہ تھی مگر ریچھ اور چیتے سے سامنا ہونا اسے قطعاً پسند نہیں تھا۔ اس روز کارکنانِ قضا و قدر بلکہ ہر شے نے وشواناتھ سے بے وفائی کی ٹھان رکھی تھی۔ ایک لومڑی اس کے قریب سے اس برق رفتاری کے ساتھ اچھل کر بھاگی کہ تربیت یافتہ فوجی ایک بار پھر سارے اسباق بھول گیا اور بوکھلاہٹ میں فائر پر فائر کرنے لگا۔ اس آواز کی بازگشت ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ قریب ہی قہقہے کی آواز گونجی۔

''بزدل کمینے سامنے آ''۔ وشواناتھ نے چیخ کر کہا۔ ''نرکھ میں جھونک دوں گا، پہلے میں بے خبری میں تیرے قابو میں آ گیا تھا۔ اب...... اب میں تجھے چیونٹی کی طرح مسلنے کے لئے تیار ہوں''۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ اپنی ہی آواز نے اسے ڈھارس بندھا دی۔ اس کا خوف زائل ہونے لگا۔ اس کی ہرزہ سرائی کے جواب میں جنگل خاموش تھا۔ فائر کی آواز کے بعد پرندوں کا شور جو اچانک ظہور پذیر ہوا تھا رفتہ رفتہ دم توڑ گیا۔ اس نے درختوں سے چھن چھن کر آنے والی دھوپ کی کرنوں سے سمت کا اندازہ لگایا اور ایک سمت کا تعین کر کے چلنے لگا۔

درختوں کا وجود اچانک ہی ختم ہو گیا۔ اب اس کے سامنے ایک وسیع دائرے میں میدان سا تھا جہاں صرف سرسبز اور نرم و ملائم گھاس اُگی ہوئی تھی۔ سامنے پہاڑی کی چوٹی سے پانی کی جھاگ اڑاتی ہوئی دھار گر رہی تھی۔ اس دائرے کی حدود سے باہر پھر گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ منظر بڑا ہی دلفریب قسم کا تھا مگر اس دلکشی میں زہر گھولنے کے لئے اس سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک اور شے بھی کھڑی تھی، وہی سیاہ پوش۔ اس کا سفید گھوڑا تھوڑی دور بڑی رغبت سے گھاس چر رہا تھا۔ سیاہ پوش کے ہاتھ میں سٹین گن تھی نہ چہرے پر نقاب۔ وہ پاؤں پھیلائے قدم زمین پر مضبوطی سے جمائے آنے والے کے گویا سواگت کو کھڑا تھا۔ اس کا رنگ دہکتے انگارے کی طرح سرخ، بال سنہری مائل گھنگھریالے، چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، جسم فولاد کی طرح ٹھوس دکھائی دے رہا تھا۔ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اس کی آنکھوں سے نکلتے ہوئے شعلوں سے لگا نہیں کھا رہی تھی۔

وشواناتھ نے طنزیہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا اور بغیر کچھ کہے بایاں ہاتھ بلند کر کے بڑے اطمینان سے فائر داغ دیا، ہدف حریف کا چوڑا چکلا سینہ تھا۔ فائر کی گونج کے بجائے ''کلک'' کی آواز آئی۔ اس نے پھر ٹریگر دبایا، نتیجہ وہی رہا۔ اس کے دل کی دھڑکن اچانک

ہو گئی، خوف کی ایک لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی تک سرایت کر گئی۔ خرگوشوں، لومڑیوں پر داغے ہوئے ''فائر'' ...ے کی شکل اختیار کر گئے۔ وہ منجمد، بے حس و ...ن کھڑا ہو گیا۔ ریوالور والا ہاتھ اس کے پہلو سے آ ...نشیں ہتھیار پر اس کی گرفت نہ ہونے کے برابر ...ی۔ ادھر سیاہ پوش قدم قدم اس کے قریب آ رہا تھا۔ ''شاید میرا ایک ہاتھ زخمی نہ ہوتا تو......'' اس ''تو'' کے ...اس کی سوچ کے سوتے خشک ہو گئے۔ ظالم اس وقت ...ی شیر ہوتا ہے جب تک وہ ظلم روا رکھنے کی حیثیت میں ...ے۔ یہ حیثیت چھن جائے تو اس سے بڑے بزدل کا ...ور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی حالت وشواناتھ کی ہو رہی تھی۔

سیاہ پوش اس سے ایک قدم کے فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ملٹری قوانین کی خلاف ورزی تھی۔ فوج میں ...ن قدم ہٹ کر بات کرنے کا دستور ہوتا ہے۔ اس سے ...م فاصلہ، مخاطب کے حصار میں دخل در معقولات کے ...ے میں آتا ہے مگر یہ فوجی قوانین کے احترام کا وقت ...تھا۔ ادھر سیاہ پوش کی ہر حرکت ناقابل فہم سی ہو رہی ...تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وشواناتھ کے ماتھے پر دائیں ...ب زخم کے نشان کو انگشت شہادت کی پور سے چھوا پھر ...پور کو انگوٹھے سے مل کر دیکھا۔ اگر اس سے زخم کے ...ن کی جانچ پڑتال مقصود تھی تو یہ بھی ناقابل فہم سی بات ...۔ پھر سیاہ پوش انگلی کی پور کو مقابل کھڑے شخص کی ...ے صاف کرنے لگا جیسے وشواناتھ کی پیشانی سے ...ہو جانے کی صورت میں اس کی انگشتِ شہادت ...ے لتھڑ گئی ہو۔ حیران کن بات یہ تھی کہ فوج کا ...کار آفیسر اس چوہے کی طرح سحر زدہ سا ہو چکا تھا جو ...ناگ کی نگاہوں کے طلسم میں جکڑا جا چکا ہو۔

''تم کیا چاہتے ہو اور...... اور کیا دیکھ رہے ہو؟'' ...نے لرزیدہ لہجے میں پوچھا۔ ''یہ زخم بڑا پرانا ہے۔ بچپن میں ایک بار......'' وشواناتھ کو فقرہ مکمل کرنے کی حسرت ہی رہی۔ سیاہ پوش نے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا تو اس نے خاموش ہو جانا مناسب خیال کیا۔

''وشواناتھ...... یہی نام ہے نا تمہارا؟'' سیاہ پوش نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

''پھر سب کچھ آناً فاناً ہی ہو گیا۔ بظاہر پُرسکون سا دکھائی دینے والا سیاہ پوش زخم خوردہ چیتا بن گیا۔ اس کا سیدھا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اور حریف کے بائیں بازو سے ٹکرایا۔ ہتھیلی کا وار اتنا شدید تھا جس نے ہدف کو تباہ کر دیا۔ حریف کا سلامت بازو کمزور لکڑی کی طرح تڑاخ سے ٹوٹ گیا۔ پھر اس نے اسی برق رفتاری سے کھڑے ہاتھ کا وار وشواناتھ کی پیشانی پہ کیا۔ حریف کو حیران ہونے کا موقع بھی نہ مل سکا اور وہ ٹوٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر آ رہا۔ اسے ہوش آیا تو ہر چیز تہہ و بالا ہو چکی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور وہ درخت سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کا سر زمین سے فٹ بھر کے فاصلے پر جھول رہا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی جس آسمان کو وہ سر پر سایہ فگن دیکھنے کا عادی تھا اسے وہ اپنے قدموں کی جانب دکھائی دے رہا تھا۔ سیاہ پوش کے ہاتھ میں بکرا ذبح کرنے والا چھرا تھا۔ ایک چھوٹی سی تیز دھار نوکیلی چھری، اس نے دانتوں میں دبا رکھی تھی۔

پہلے تو مضبوط رسّے کے سہارے درخت سے الٹے لٹکے ہوئے وشواناتھ کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ سکا مگر رفتہ رفتہ ساری صورتِ حال جب اس پر آشکارا ہوئی تو وہ دھک سے رہ گیا۔ ''یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے بلند آواز میں سوچا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟'' یہ سوچ تو اس کے ذہن میں تشکیل پا رہی تھی مگر بے خبری میں اپنی سوچ کو وہ الفاظ کا لباس بھی پہنا رہا تھا۔ یہ دہشت کی انتہا تھی۔ ''تم...... تم کون ہو؟ آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟'' اس نے مکمل بے بسی سے سوال کیا۔

''تم نے مجھے بے سروسامان کر دیا۔ میری ایک جنت کو پامال کیا، دوسری...... دوسری کو جلا کر راکھ کر ڈالا''۔ سیاہ پوش نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا اور ساتھ ہی اس کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اس نے چھرے کی نوک سے وشواناتھ کے لباس پر عموداً لکیر کھینچی۔ اس کا جنوں اب انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد الٹا لٹکا ہوا کرنل بے لباس جھول رہا تھا، خوف اس کے روئیں روئیں سے پھوٹ رہا تھا۔

''تم کیا کرنے لگے ہو میرے ساتھ؟ میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں''۔

''میں صرف تمہاری کھال اتار رہا ہوں''۔ سیاہ پوش نے مختصر سا جواب دیا۔

''مگر کیوں؟'' وشواناتھ کی آواز اب بے کھنک ہو چکی تھی۔ صدا کے سارے تار بے آواز ہو چکے تھے۔ جواب دینے کے بجائے سیاہ پوش نے اس کے ٹخنوں کے قریب تیز دھار چھری سے دو گول دائرے لگائے اور ماہر قصائی کی طرح، بڑی نفاست سے جسم کی کھال اتارنے لگا۔ وشواناتھ نے بڑے ظلم ڈھائے تھے مگر یہ وحشت کی انتہا تھی جس کا وہ خود شکار ہو رہا تھا۔ ایسا وحشی پن تو اس کے خواب و خیال میں نہ تھا۔ دہشت کی آخری حد، اس کے خلیوں تک کو متاثر کر گئی جس کے نتیجے میں اس کی قوتِ برداشت ختم ہو گئی۔ اوپر والا دھڑ، جواب نیچے والا بن چکا تھا۔ بول و براز سے لتھڑ گیا۔ وہ تھوڑی دیر تڑپا پھر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ سیاہ پوش نے چھرا اس کی ران میں گھونپ دیا جیسے قصاب مذبوحہ جانور کی کھال کھینچتے وقت چھری کو زمین پر رکھنے کے بجائے گوشت میں گھونپ دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہاں عجیب دہشت ناک منظر تھا۔ ایک طرف انسانی کھال پڑی تھی، دوسری طرف ''بے کھال'' لاش درخت سے الٹی لٹکی تھی۔ عین اس وقت قریبی درخت پہ چھپا بیٹھا حوالدار اوم پرکاش، خوف کی شدت سے بے ہوش ہو کر دھم سے نیچے گرا۔ سیاہ پوش نے چونک کر اسے دیکھا اور بڑے اطمینان سے چلتا ہوا بے ہوش شخص کے قریب گیا جیسے اسے پورا یقین تھا کہ گرا ہوا شخص، بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔

اوم پرکاش کو ہوش آیا تو پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس نے سفاک قاتل کی طرف دیکھا جو خود بڑے غور سے اسے تک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ سیاہ پوش کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا ہوئی۔ یہ چمک کسی دل گداز جذبے کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اس ''شناسائی'' سے اس کی نگاہوں سے پھر ''لیزر بیم'' جیسی شعاعیں خارج ہونے لگیں جو فولاد کو موم کی طرح کاٹ کے رکھ دیتی ہیں۔ اوم پرکاش کو وہ نگاہیں سینے کے آر پار ہوتی محسوس ہوئیں۔ اس کی یہی آرزو تھی کہ کاش وہ ہوش و حواس سے بیگانہ، نہ ہوا ہوتا اور اگر ایسا ہو گیا تھا تو پھر اسی عالم میں رہتا۔ اس نے صرف ایک بار، پل بھر کے لئے اپنے کمانڈر کی جھولتی ہوئی لاش کو دیکھا تو اس کے چہرے پر زردیوں کے میلے لگ گئے۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' سیاہ پوش نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''جی، اوم پرکاش جی''۔

''مجھے پہچانتے ہو؟'' سیاہ پوش نے عجیب سا سوال کیا۔

''جناب! میں نے آپ کو زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے''۔ اوم پرکاش خوف کی حدود عبور کر چکا تھا جہاں سے پھر بے خوفی کی حد کا آغاز ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا لہجہ قدرے صاف تھا۔

''آج سے تقریباً بیس برس پیشتر تم وردی میں نہیں تھے مگر تمہارا چہرہ میرے دل پہ پتھر کے نقش کی طرح موجود ہے، کچھ یاد آیا؟''

''میں بھگوان کی سوگندھ کھا کر کہتا ہوں، میں نے...... میں نے...... آپ کو کبھی نہیں دیکھا''۔

''یاد کرو، اننت ناگ میں شہاب الدین ٹھیکیدار کا مکان''۔ پھر اس نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے ساتھ ظلم کے چھ نمائندے اور بھی تھے، میں ان کے لئے جہنم کا عذاب ہوں، تم لوگوں نے صرف ایک غلطی کا ارتکاب کیا''۔ سیاہ پوش کا لہجہ بہت دھیما ہو گیا۔ ''پانچ برس کے وقار شہاب الدین کو تم لوگوں نے زندہ چھوڑ کر اپنی زندگیوں میں کانٹے بو لئے''۔ اس کی آواز اب سرگوشی میں بدل گئی۔

اوم پرکاش کو بھی سب کچھ یاد آ گیا۔ آٹھ اگست 1965ء کو جی ایم صادق، کٹھ پتلی وزیراعظم وادیٔ کشمیر کے ایماء پر جب کشمیری مجاہدین کی سرکوبی کے لئے مزید فوج تعینات کی گئی تھی۔ بھارتی سورما نہتے کشمیریوں پر خونخوار بھیڑیوں کی طرح پل پڑے تھے۔ پوری فلم اس کی نگاہوں کے سامنے چلنے لگی۔

''ہاں، ایک بچہ تھا تو سہی، کمانڈر جگن ناتھ نے......'' یہ سوچ اوم پرکاش کے دل میں تھی مگر اپنے عالم میں بھی وہ اس واقعے کو دہرانے سے گریز کر رہا تھا۔

''میں تم لوگوں کی نسلوں سے انتقام لوں گا''۔ سیاہ پوش نے اپنے سینے کی طرف انگشت شہادت سے اشارہ کیا۔ ''میں وقار شہاب الدین، اپنی جنت کے سوز کا ماتم کرتا ہوں، مگر اب یہ ماتم منفرد انداز کا حامل ہو گا''۔ سیاہ پوش خود کلامی کے سے انداز میں کہہ رہا تھا، پھر اس نے چھرے کی طرح سینے سے آر پار ہو جانے والی نگاہوں سے اوم پرکاش کو دیکھا۔ ''میں تم لوگوں کے حالات سے اچھی طرح واقف ہوں کیوں کہ یہی میری زندگی کا نصب العین رہا ہے۔ جو کچھ تم جانتے ہو فرداً فرداً سب کے متعلق بتاؤ۔ اپنے اس دور کے کمانڈر جگن ناتھ سے شروع ہو جاؤ''۔ اس کا سرسری لہجہ ہر نوعیت کے حکم پر بھاری تھا۔ اوم پرکاش سامنے کھڑے ''راکھشس'' سے متعارف ہو چکا تھا۔ لہٰذا ریکارڈ کی طرح بجنے لگا۔ کون کہاں ہے، کیا ہے، کس مقام و مرتبے کا ملک ہے وغیرہ وغیرہ۔ وقار بڑے غور سے اس کی ایک ایک بات کو سن رہا تھا۔ چند باتیں اس کے علم میں اضافے کا باعث ہوئیں۔

''اُس پوتر کنیا کی ہتیا کرنے میں میرا ہاتھ نہیں تھا...... میں، میں نردوش ہوں''۔ اوم پرکاش نے دست بستہ عرض کی۔

''اسی لئے تو آسان موت سے ہمکنار ہو رہے ہو''۔ وقار نے دو کھڑی انگلیاں حریف کی شہ رگ پر ماریں اور برچھی کی طرح پرو کر اسے زمین سے اوپر اٹھا لیا۔ اوم پرکاش، بند منہ کی وجہ سے چیخ بھی نہ سکا۔ سیاہ پوش کی فولادی انگلیوں نے واقعی برچھی کا کام کیا تھا۔ چند لمحے تڑپ کر اوم پرکاش بھی اپنے کمانڈر کی تقلید میں، سفرِ آخرت پر روانہ ہو گیا۔

خاموش طبع اور فولادی جسم کا مالک وقار شہاب الدین جو اپنی ذات میں ایک انجمن کا مالک تھا، اپنے مختصر حلقہ احباب میں ''وِکی'' کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اپنے ''فرض'' کی ادائیگی کے بعد وہ اداس اداس سا قدرتی چشمے کے قریب آیا اور ''اوک'' سے اپنی پیاس بجھانے لگا۔ پہلے گھونٹ سے اسے محسوس ہوا جیسے وہ جنم جنم کا پیاسا ہے۔ جی بھر کے تشنگی دور کرنے کے بعد وہ نرم گھاس پر لیٹ گیا۔ ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کر کے اس نے سر سے بلند کیا اور سر کو سہارا دے کر سوچوں میں گم ہو گیا۔ سارا لائحہ عمل ذہن میں ترتیب دینے کے بعد وہ پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ گھوڑے نے کنوتیاں کھڑی کر کے اپنے مالک کی طرف دیکھا۔ وفادار اسپ تازی سے اس کا مکمل ذہنی رابطہ تھا جس کے

زیرِ اثر وہ گھاس سے منہ موڑ کر وکی کی طرف آنے لگا۔ وکی نے خرجی سے سادہ لباس نکالا۔ تھوڑی دیر بعد وہ عام سے معصوم شہری کے روپ میں کشتواڑ کی طرف گامزن ہو گیا۔ اب اس کے چہرے پر بلا کا ''بھولپن'' تھا۔ اس کی منزل کشتواڑ کے مشہور زمانہ درویش شاہ فریدالدینؒ کی خانقاہ تھی۔ اسی علاقے میں ایک اور درویش بے ریا شاہ اسرارؒ کی درگاہ بھی معقول پناہ گاہ تھی مگر اوّل الذکر بزرگ سے وکی کو خاص دلی لگاؤ تھا۔ یہ ایسی ہستیاں تھیں جن کی مساعی جمیلہ کے طفیل کشتواڑ کے اندھیرے میں کلمہ حق سے اجالا ہوا۔ سیاہ پوش جو چند گھڑیاں پیشتر موت کا ہرکارہ بنا ہوا تھا ان بزرگوں کے تصور سے سراپا عجز و نیاز بن گیا۔ غاصب لوگ اگر اس علاقے سے آشنائی کا دعویٰ کرتے تھے تو وکی بھی اپنی وادی کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اس سرزمین کی مکمل تاریخ کا ایک ایک باب اس کے سینے میں محفوظ تھا۔ وقار جب مزار شاہ فریدالدینؒ کے احاطے میں داخل ہوا تو ایک درویش نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

''بیٹا! حالات ٹھیک نہیں، چند دنوں کے لئے منظر سے غائب ہو جاؤ''۔ درویش نے سرگوشی کی۔

''حالات تو صدیوں سے خراب ہیں بابا جانی!'' وکی نے اداس مسکراہٹ سے کہا۔ ''چھپنے کا نہیں، ظاہر ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ ستم توڑنے کی گھڑی در پر دستک دے چکی ہے''۔

دونوں نے بغور ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کی سوچ ایک تھی مگر طریق کار میں اختلاف تھا۔ وہی اختلاف جو ہوش اور جوشِ جنوں میں ہوتا ہے۔

''میں علی الصبح شکار پر نکل جاؤں گا''۔ وکی نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''درندوں کے ٹھکانے کا پتا چل گیا ہے''۔ سرسری لہجے میں بھی طوفانی عزم کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ عزم جو ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔

***

شہاب الدین خان، اننت ناگ کا ایک معزز شہری تھا۔ یہ توقیر حکام وقت کی عطا کردہ نہ تھی بلکہ اس کی اپنی صفات کی بناء پر خلقِ خدا اسے صاحب شرف و ظرف گردانتی تھی۔ اس کی حویلی سرنل سے تھوڑے ہی فاصلے پر بستی ''مٹن'' میں تھی جس کا دوسرا نام ''بھون'' ہے۔ (سرنل کی وجہ شہرت کشمیری لیڈر افضل بیگ مرحوم کی جائے رہائش ہے) مٹن اور سنگھ پورہ دونوں بستیوں کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ان میں قیام پذیر تھے۔ مٹن بطور خاص مخلوط رہائش کی بناء پر مشہور تھا۔

شہاب الدین کا خاندان مختصر سا تھا۔ سولہ برس کی چندے آفتاب، چندے ماہتاب ایک بیٹی ناہید، ایک پانچ برس کا بیٹا وقار۔ اس سے بڑے لڑکے نثار کی عمر دس برس تھی۔ بیگم شہاب الدین خاوند اور بچوں پر جان چھڑکنے والی سگھڑ خاتون تھی۔ پاس پڑوس میں عزت و وقار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ علمی و ادبی گھرانا ہونے کے علاوہ، بیگم شہاب اپنے مجازی خدا کی طرح حساس اور دردمند دل کی مالک تھی۔

بہن بھائی میں پیار محبت کوئی اچنبھے کی بات نہیں مگر ناہید اپنے پانچ سالہ بھائی وقار پر جان چھڑکتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنے گل گوتھنے سے بھائی کے لئے شفقت کا جو بے کراں سمندر اس کے سینے میں موجزن تھا اسے الفاظ کا لباس پہنانا ممکن ہی نہیں۔ اس کے بے جا لاڈ پیار نے وکی کو خودسر اور ضدی بنا ڈالا تھا۔ انتہا یہ کہ ماں باپ تک کی جرأت نہ تھی کہ بچے کو سرزنش کرتے۔ عام حالات میں وہ فرماں بردار قسم کی لڑکی تھی مگر وکی کے معاملے میں جائز و ناجائز میں تمیز کی قائل نہ تھی۔ وہ

اپنی عاشق زار ماں کے سامنے بھی ڈٹ جاتی اور شیرنی کی طرح اس کا دفاع کرتی۔ مختصر یہ کہ وہ اس ''معصوم فتنے'' کے لئے کڑی دھوپ میں گھنے پیڑ کا سایہ بھی تھی اور زمستانی ہوا میں سکون بخش حرارت بھی۔

جب وکی حد سے زیادہ تنگ کرتا تو وہ اسے ''شیطانوں کی ٹونٹی'' کا خطاب دے ڈالتی۔ ''بُری بات، شیطان کی ٹونٹی'' یہی اس کی سرزنش کا انداز تھا اور یہی، کردہ گناہوں کی سزا۔ وہ دنیا کے لئے صرف وکی کی بہن تھی مگر حقیقت میں وہ بھائی کی ذات میں فنا ہو چکی تھی۔ یہ ایک ایسا تعلق تھا جو نہ کسی نے کبھی دیکھا، نہ سنا۔

اس رات وکی کی ''چندا آپی'' اپنے چندا کو حسب معمول کہانی سنا رہی تھی۔ ''حوض میں لوہے کا صندوق تھا، صندوق میں لوہے کا پنجرہ، پنجرے میں ایک طوطا بند تھا۔ طوطے کے دماغ میں ایک مکھی تھی اور اس مکھی میں کالے دیو کی جان تھی''۔ وکی کا ذہن اس گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ گیا۔

''چندا آپی! دیو کی جان مکھی میں کیوں تھی؟''

'حفاظت کے لئے''۔ نہادی نے جواب دیا۔

''آپ کی جان کس میں ہے؟'' وکی نے بڑا مشکل سوال کیا۔

''تم میں''۔ آپی نے فوراً جواب دیا۔

وکی کے معصوم ذہن نے سب کچھ فوراً تسلیم کر لیا اور وہ اس قیمتی سرمائے کی حفاظت کے متعلق سوچتا سوچتا خوابوں کی وادی میں جا نکلا۔ خوابوں کے دیس پر اس کی اپنی حکمرانی تھی، رنگ و نکہت کی یہ وادی اتنی حسین تھی کہ وہ اس کے حُسن کو کبھی بھی احاطہ الفاظ میں نہ لا سکا پھر اچانک ایک دہشت ناک چیخ سنائی دی۔ وادی کے رنگ بکھر گئیں نور و نکہت کی وادی ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ وکی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ رنگین خواب کی جگہ اس کے سامنے خونی ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا اور وہ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھنے پر مجبور تھا۔ کمرے میں پانچ بندوق بردار کھڑے تھے۔ دو دروازے کے باہر تھے۔ خوفناک کھیل کے دوران وہ بھی اندر آ گئے مگر بڑی بڑی مونچھوں والے نے ان کو ڈانٹ کر باہر بھیج دیا۔ ایک کرسی پر اس کا باپ رسّی میں جکڑا ہوا تھا۔ دو خوفناک شکلوں والے بڑی بے رحمی سے اس کے باپ کو پیٹ رہے تھے۔ ایک نے اس کی شفیق ماں کی دبوچ رکھا تھا۔ ایک نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ چندا آپی کی کلائی دبوچ رکھی تھی۔ پانچواں، خونخوار آنکھوں سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ دروازے پر کھڑے وردی پوش اس کے بھائی کو گھسیٹ کر اندر لائے۔ اس بار مچھندر نے ڈانٹنے کے بجائے ان کو مسکراہٹ سے نوازا۔

''ارے، ایک اور ''سنپولیا؟ یہ کس بل میں چھپا بیٹھا تھا؟'' پھر مچھندر نے گرج کر اس کے باپ کو مخاطب کیا۔ ''بابو، شہاب الدین غور سے دیکھ، تیرے خاندان کو آزادی نصیب ہونے والی ہے مگر تجھے ابھی زندہ رہنا ہو گا۔ تجھ جیسے غدار کو اتنی آسان موت مہیا کرنا ہمارے دھرم میں مہا پاپ ہے۔ یاد رکھ، شیو دیوتا کی تیسری آنکھ کھل چکی ہے۔ نسل کشی میں ہمیں وقت تو لگے گا مگر کشمیر سمیت پورے بھارت سے ہم، تم لوگوں کا صفایا کر کے دم لیں گے''۔

وکی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے چندا آپی سے چمٹنے کی کوشش کی مگر بالوں بھری کلائی کا تھپڑ اس کے منہ پر لگا۔ تھپڑ کی تکلیف سے زیادہ کلائی کے پسینے کی بو نے اس کے دماغ میں ہلچل مچا دی۔ بمشکل اس نے ابکائی پہ قابو پایا۔ ایک شخص کے ہاتھ میں عجیب و غریب شکل کا چھرا تھا۔ وہ ہاتھ بلند ہوا، دوسرے لمحے اس کی شفیق ماں کا سر تن سے جدا ہو کر لڑھکتا ہوا اس کے باپ، شہاب الدین کے بندھے قدموں کے قریب جا کر رک گیا۔ وکی کا خوفزدہ ذہن بالکل سن ہو کے رہ گیا

تھا۔ رفتہ رفتہ خوف کی کیفیت بھی نہ رہی۔ دل و دماغ پر مکمل سناٹا چھا گیا۔ ذہن بیدار ہوا تو ماں کے سر پر اس کی نگاہ پڑی۔ اس کے ذہن میں عجیب و غریب خیال آیا۔ دو روز قبل اس کی چندا آپی نے دھجیوں سے ایک گیند بنا کر اسے دی تھی۔ جس پر سرخ دھاگے سے مربع کی شکل کی ڈبیاں سی بنی تھیں۔ وہ بھی اسی انداز میں لڑھکتی تھی۔ پھر اس کی نظر سر بریدہ لاشے پر پڑی۔ پچھلی بقر عید پر ذبح کئے ہوئے بکرے کی گردن سے، بالکل اسی انداز میں ابل ابل کر خون گرا تھا۔ پھر یہ سرخی ہر سمت پھیل گئی اور اس کے ذہن میں ہر چیز گڈمڈ سی ہونے لگی۔ سکتے کی یہ کیفیت چندا آپی کی چیخ نے توڑی۔ وہی بالوں بھری کالی،، آپی کو گھسیٹ رہی تھی۔ گندی کلائی اس کی آنکھوں کے اس قدر قریب تھی کہ اس کی بو نے پھر اس کے دماغ پر حملہ کر دیا۔ سڑاند نے دماغ ماؤف کرنے کی کوشش کی مگر آنکھیں اس ہتھیلی کی پشت پر زخم کے پرانے نشان پر جم کر رہ گئیں۔

''اس ظلم سے پہلے مجھے موت دے دو''۔ اس کے باپ نے چیخ کر کہا۔ ''میری آنکھیں پھوڑ ڈالو یا مجھے آزاد کر کے دیکھو''۔ اس کا باپ جوش جنوں میں کرسی سمیت جس پر اسے باندھ دیا گیا تھا، اٹھ کھڑا ہوا مگر اس کے قریب کھڑے ڈراؤنی شکل والے نے بندوق کا ''بٹ'' اس کے کندھے پر مارا۔ کرسی اپنے کرسی نشین سمیت پھر اصلی حالت میں آ گئی۔ ''کون ہو تم لوگ؟ میری تمہاری دشمنی کیا ہے؟''

''شہاب الدین، تُو سوال کرنے کی حیثیت میں نہیں، ہم تمہاری آتماؤں کو آزاد کر رہے ہیں مگر اس سے پہلے تیری لاڈلی بیٹی کو دوسروں کے لئے درس عبرت ضرور بنائیں گے۔ آزادی کی قیمت تو ادا کرو''۔ یہ باتیں مچھندر نے کیں۔ ''میرا نام جگن ناتھ ہے، غور سے سن، میں تم لوگوں کی موت ہوں''۔ اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا پھر اس نے ''چھرا بردار'' کو اشارہ کیا۔ دس برس کے نثار کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ شہاب الدین نے آنکھیں بند کر لیں مگر وکی کی آنکھیں مزید کھل گئیں۔ کمرے میں تھوڑی دیر تک سکوتِ مرگ چھا گیا۔ شہاب الدین نے آنکیں کھول کر بیوی بچے کے سروں کو دیکھا پھر اس کی بے بس نگاہیں پانچ سالہ وکی پر آ کر ٹک گئیں۔ مچھندر کی خونی آنکھوں نے بھی شہاب الدین کی نگاہوں کا تعاقب کیا، مبہوت سہمے ہوئے بچے پر شعلے برساتی ہوئی یہ نگاہیں بھی مرکوز ہو گئیں۔ بس وہ چہرہ، پھیلے ہوئے نتھنے، ماتھے کی لکیریں، بڑی بڑی مونچھیں، ہر چیز وکی کے ذہن پر نقش ہو گئی۔ جیسے پتھر پر نقش تصویر۔ جیسے لوحِ مزار پر کندہ تحریر اور اس شخص کا نام جگن ناتھ......

آخری منظر جو وکی کی چشم حیراں میں محفوظ ہوا وہ اس کے باپ کی شدتِ کرب سے بند ہونے والی آنکھیں تھیں اور چندا آپی کا برہنہ جسم جسے ایک درندہ پامال کر رہا تھا۔ آپی کی بے بس چیخ کے ساتھ ہر چیز دھند میں ڈوب گئی۔ معصوم آنکھیں ضرورت سے زیادہ دیکھ چکی تھیں۔ چند گھڑیوں کے منظر کی سیاہی، صدیوں کو تاریک کرنے کے لئے کافی تھی۔

لوگوں کے شور شرابے سے اسے ہوش آیا۔ کسی ادھیڑ عمر عورت نے اسے میں اٹھا رکھا تھا۔ اس کی جنت، چندا آپی ناہید کے سینے میں خنجر پیوست تھا۔ سفید چادر سے برہنہ جسم کو ڈھانپ دیا گیا تھا۔ خنجر کا ابھار، مسجد کے مینار کی طرح آسمان کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ شہاب الدین اس تذلیل کو برداشت نہ کر سکا۔ اس کی آنکھیں چھوٹے سے بچے کو بہت بڑا پیغام دے کر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی تھیں۔ بیٹا اس پیام کو وصول کر چکا تھا۔

مذہبی رواداری کے مینارِ نور ہردی بابا کی نگری میں یہ سفاکانہ کارروائی اس بات کا بین ثبوت تھی کہ مسلمان اور ہندو اب ایک نیام میں دو تلواروں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ دو قومی نظریہ نئے انداز میں کروٹ لے کر بیدار ہو گیا۔

جگن ناتھ جب ستم کی کارروائی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد شہاب الدین کی حویلی سے رخصت ہونے لگا تو پانچ سالہ وکی نے سکتے کے عالم میں صرف ایک بار بڑے غور سے اسے دیکھا اور بڑے عجیب و غریب لہجے میں صرف دو الفاظ ادا کئے۔ ''زدن دید'' (کشمیری زبان میں دیدی کا تلفظ ''دد'' بمعنی آپا یا آپی زدن بمعنی چاند، اس طرح زدن دید کا مفہوم چندا آپی ہوا)

بچے کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ اس کے دلی جذبات کی مکمل ترجامین کرتے تھے۔ یہ اس بات کا بھرپور اظہار تھا کہ اہمیت کے اعتبار سے اس کی چندا آپی ناہید سرفہرست تھی۔ جگن ناتھ کے ایک حواری نے اس کی توجہ اس بچے کے عجیب و غریب رویے کی طرف مبذول کرائی تو اس نے جواب بھی بڑا عجیب و غریب دیا۔ ''یہ بچہ تا زندگی دوسروں کے لئے سامان عبرت کا چلتا پھرتا اشتہار ہو گا۔ میں نے عمداً یہ چراغ جلتا رہنے دیا ہے۔ یہ کشمیری عوام کو بے بسی کی داستان سنا سنا کر راہ راست پر لے آئے گا۔ اس طرح اکھنڈ بھارت کی بنیاد استوار ہو گی''۔

جگن ناتھ کے الفاظ وادی کشمیر کی فضاؤں میں محفوظ ہو گئے۔ ان کا اثر فکر ہنود کے برعکس ہوا۔

ریشہ مول کا ایک غیر مسلم عقیدت مند گیانی شیر سنگھ پہلا فرد تھا جو اس قتل گاہ میں بطور ''تماشائی'' داخل ہوا۔ اس کی چشم تماشا نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابل یقین تھا مگر بصارت کے وسیلے سے اس کی دونوں آنکھیں معتبر گواہ تھیں۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ''افسوس! بنیا مہاراج کی مت ماری گئی''۔ اس نے زیر لب کہا۔ ''اب بپھرے ہوئے طوفان کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی''۔

گیانی شیر سنگھ، شہاب الدین کو ایک عظیم انسان تصور کرتا تھا۔ جانے والے کی عظمت کو سلام کرنے کا یہی طریقہ تھا کہ اس کے لختِ جگر کو وقتی تحفظ فراہم کیا جائے۔ وہ وکی کو ناگر بل کے قریب اپنی رہائش گاہ پر لے گیا۔ بچے پر بدستور سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ گیانی کی سر توڑ کوششوں کے باوجود، وقار شہاب الدین کی آنکھوں سے ایک آنسو تک نہ گر سکا۔ یہ بڑی ہی تشویشناک بلکہ خطرناک صورتِ حال تھی۔ آنکھوں سے بہنے والا پانی، سن و سال کی تمیز کے بغیر سوزِ دل کا مؤثر ترین علاج ہوتا ہے۔ قصر دل میں بھڑکتی آگ کو اگر کوئی چیز ٹھنڈا کر سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف آنسو ہیں۔ یہ پانی کی ایک انوکھی قسم ہے جو آگ لگاتی بھی ہے اور بجھاتی بھی ہے۔ اس بات کا انحصار کہ آنسو کیا گل کھلاتا ہے، فصیل جاں پہ طاری کیفیت پر ہوتا ہے۔ اگر یہ سرمایہ ختم ہو جائے تو حشر بپا ہو جاتا ہے ؎

سوزِ دل بے آنسوؤں کے ایک قیامت ہے قمر
اس سے پوچھو جس کا گھر جلتا ہو اور پانی نہ ہو

چند روز تو گیانی شیر سنگھ نے یہی مشہور کئے رکھا کہ وکی اس کے عزیزوں کا لختِ جگر ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ گوردوارے میں لے جانے لگا مگر بچے نے نہ گرنتھ کے پاٹ میں دلچسپی لی نہ ''کیرتن'' میں (کیرتن سکھوں کی وہ محفل موسیقی جس میں عارفانہ کلام پیش کیا جاتا ہے جیسے ہمارے ہاں قوالی)۔ مگر یہ بات زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہ رہ سکی۔ شہاب الدین کوئی غیر معروف شخصیت نہ تھا۔ سرنل، مٹن، سنگھ پورہ جموں (سنگھ پورہ سے اگلی بستی) عیش مقام (مزار شیخ زین الدین کا علاقہ) حتیٰ کہ لدھر اور پہل گام تک لوگ اسے جانتے اور پہچانتے تھے چنانچہ یہ قیامت صغریٰ جو اس بدنصیب خاندان پر گزری،

چھپی نہ رہ سکی۔ اس کی مکمل تفصیل جنگل کی آگ کی طرح چہار سو پھیلی۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ خاندان شہاب کا آخری چشم و چراغ زندہ سلامت موجود ہے۔ ادھر شیر سنگھ کے اہل خانہ ایک اور ہی مصیبت میں مبتلا تھے۔ گھر کا کوئی فرد وکی کے جسم کو چھو نہیں سکتا تھا۔ بچے کی یہ عادت نہ صرف عجیب و غریب بلکہ نا قابلِ فہم سی تھی۔

چندا آپی کے علاوہ اس کے اپنے گھر کا کوئی فرد اس کے جسم کو چھونے کی جرأت نہیں کرتا تھا، ایک اجنبی لمس کو وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ بچہ اس لحاظ سے منفرد تھا کہ وہ جو گل نوخیز تھا حالات کی ستم ظریفی سے زہریلا کانٹا بن گیا اور خار کی نوک تو پیدائشی نوکیلی ہوتی ہے۔ وکی ایک ایسا آتش فشاں ثابت ہوا جس نے اوائل عمری ہی سے گویا لاوا اگلنا شروع کر دیا۔ خوش قسمتی سے ''عیش مقام'' کے ایک نابغہ روزگار شخص نے جو شہاب الدین کا یارِ غار تھا، بچے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ اس عظیم ہستی کا نام ضراب خان ملدیال تھا۔ اس میں یقیناً تقدیر کا زبردست ہاتھ کارفرما نظر آتا ہے کہ وکی کو ملدیال جیسا ہر فن مولا راہبر میسر آیا۔ حسن اتفاق کہ ضراب خان اولادِ نرینہ سے محروم تھا۔ اس کی تین بیٹیاں، زرینہ، ریشماں اور عذرا تھیں۔ عذرا، وکی کی ہم عمر تھی۔ وکی ایک ناتراشیدہ ہیرا تھا جو ضراب خان جیسے فنکار کے ہاتھ آ گیا اور ضراب خان نے بھی اپنا سارا فن وکی کو اس اندازا میں منتقل کرنا شروع کیا کہ وہ بچے کی ذات میں گویا فنا ہو گیا۔

ملدیالی نسل کے لوگ مغل قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ضلع باغ اور پونچھ میں آج بھی ان کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔ شہنشاہ جہانگیر کے دور میں ایک شخص مرزا مولود بیگ، وادیٔ کشمیر میں آیا اور پونچھ کے بلند و بالا سرسبز و شاداب پہاڑوں، گھنے جنگلات، حسین وادیوں سے ایسا مسحور ہوا کہ ''دیگوار'' کے علاقے میں اقامت گزیں ہو گیا (آج کل یہ علاقہ پونچھ کی تحصیل ''حویلی'' میں آتا ہے۔ اسی جگہ مرزا مولود بیگ ایک کشمیری دوشیزہ کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوا۔ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ اس کی نسل اس علاقے میں، اپنے جنگجو مورثِ اعلیٰ کے نام کی مناسبت سے ملدیال کہلائی۔ پونچھ کا عظیم سپوت سردار شمس خان ملدیال اسی مرزا مولود بیگ کی نسل سے تھا جس نے رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں ''سکھا شاہی'' کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ گلاب سنگھ سکھوں کا لشکر جرار لے کر شمس ملدیال کی سرکوبی کو پہنچا مگر قدم قدم پر اسے منہ کی کھانا پڑی۔ شمس خان ملدیال کے دو ساتھی ملی خان اور سبز علی خان، سکھ لشکر کے ہتھے چڑھ گئے چنانچہ ان کو مصلوب کیا گیا۔ یہ دونوں شہ زور شمس خاں کے دست و بازو تھے۔ بازو نہ رہے تو وہ تن تنہا تین ماہ تک سکھ لشکر کو ناکوں چنے چبواتا رہا۔ یہ زخمی چیتے کی طرح اپنے چند ساتھیوں سمیت گلاب سنگھ کے لشکر پہ شب خون مارتا رہا اور کشمیری حریت پسندوں کے لئے ''ہٹ اینڈ رن'' قسم کی گوریلا جنگ کا نصاب تحریر کر گیا۔ دشمنوں کا کوئی ہتھیار، ان کی کوئی چال اس جواں مرد کا بال بھی بیکا نہ کر سکی۔ آخرکار اپنے ہی ایک بدبخت دوست نے انعام و اکرام کے لالچ میں، آدابِ مہمان نوازی کا حق اس طرح ادا کیا کہ ایک رات جب یہ شیر نر محوِ خواب تھا اس کا سر قلم کر دیا اور اپنی نسلوں کے لئے عذابِ جہنم کا سامان کر گیا۔

ضراب خان ملدیال کو وکی میں وہ تمام اوصاف نظر آئے جو وہ اپنی ذات میں یا اپنی نسل میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے اولادِ نرینہ کی عدم موجودگی میں وکی کو اپنا سب کچھ مان لیا ور اسے ''نسلی انتقام'' کے لئے تیار کرنے لگا۔ یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتی جو صرف جینے کی آرزو میں مرے جا رہے ہیں اور قربان ہو

جانے کو حماقت تصور کرتے ہیں۔ وکی کو جو پہلا سبق ملا وہ یہ تھا کہ اہمیت اس بات کی نہیں کہ کوئی کتنی دیر زندہ رہا۔ اہم بات صرف یہ ہے کہ زندگی کا انداز کیسا رہا۔ موت کو صرف جذبۂ ایثار و قربانی ہی سے شکست دی جا سکتی ہے۔ ضراب خان نے یہ سبق ایک بہترین عملی مثال سے وکی کو ذہن نشین کرایا۔ اس نے ''ترال منڈی'' میں بچے کو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ دکھا کر عجیب و غریب سوال کیا۔

''وقار بیٹا! غور سے ان کی کثرت کو دیکھ اور بتا بکری، بھیڑ، گائے، بھینس ایک وقت میں کتنے بچے جنتی ہے''۔

''ایک یا دو''۔ وکی نے اپنی عقل کے مطابق جواب دیا۔

''اور کتیا؟'' ضراب خان نے دوسرا سوال کیا۔

''ڈھیر سارے''۔ وکی نے فوراً جواب دیا۔

''مگر جان ضراب! ریوڑ صرف قربان ہو جانے والے جانوروں کے دکھائی دیتے ہیں بکری دو بچے جنتی ہے وہ بھی قربان ہو جاتے ہیں مگر ان کی کثرت دیکھو، کیا کتے ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟''

''ہرگز نہیں''۔ وکی کے ذہن میں فلسفہ قربانی نقش ہو گیا۔

مقبوضہ کشمیر میں گائے کشی کی سزا اب بھی وہی ہے جو ڈوگرہ راج میں ہوا کرتی تھی یعنی موت مگر مسلمانوں کو دوسرے جانور ذبح کرنے کا لائسنس مل جاتا ہے۔ اگر گائے چوری چھپے ذبح ہو جائے اور اس کی رپورٹ حکام بالا تک پہنچ جائے تو سزا یقینی ہے۔ عملی طور پر اگرچہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ بہرحال قانون موجود ہے اگر ہندو اس مسئلے کو اچھالنے پر اتر آئیں تو گائے ذبح کرنے والے کی خیر نہیں۔ اسلام آباد (اننت ناگ) میں عیش مقام اور 'شترال'' دو جگہوں پر مذبوحہ جانور بکتے ہیں یعنی بھینس اور بکرے کا گوشت مل جاتا ہے۔

پہلی بار وکی نے درندگی کا اظہار کیا، اس وقت اس کی عمر تقریباً دس برس کی تھی اور وہ مقامی ہائی سکول کی چھٹی جماعت کا ذہین ترین مگر کم گو طالب علم تھا۔ ضراب خاں کی مساعی جمیلہ کے طفیل وہ ایک برس میں دو جماعتوں کا امتحان پاس کر لیا کرتا تھا۔ کم عمری کے باوجود، قد کاٹھ کے اعتبار سے وہ اکثر طلباء میں امتیازی حیثیت کا مالک تھا۔ آتشیں مزاج کا مالک ہونے کی وجہ سے اکثر دُگنی عمر کے لڑکوں سے الجھ پڑتا، شروع شروع میں اس کی پٹائی بھی ہوئی مگر رفتہ رفتہ وہ نہ صرف اپنا دفاع کرنا سیکھ گیا بلکہ اس خونخواری سے حریف کے نازک ترین جسمانی حصوں کو نشانہ بناتا کہ غنیم کو جان بچانا مشکل ہو جاتا۔ نامساعد حالات ہی اس کی تربیت گاہ تھے۔ محلے کا ایک جسیم آوارہ کتا اکثر اس کے ساتھ ہوتا۔ اس روز وہ دونوں گوشت خریدنے بازار گئے۔ وہ جب بھی ''بوچڑ'' خانے جاتا، اس کی کیفیت عجیب سی ہونے لگتی۔ گھنٹوں کھڑا محویت کے عالم میں جانوروں کو ذبح ہوتے دیکھتا رہتا۔ گوشت کی دکانیں کتے کی بھی پسندیدہ جگہ تھی۔ اندر تو اسے کوئی گھسنے نہ دیتا البتہ اس سے باہر وہ وکی کے ہمراہ ضرور ہوتا۔ وکی اپنی منفرد صفت سے اس زمانے میں قطعاً بے خبر تھا کہ وہ وحشی درندوں کے وحشی دماغ میں تشکیل پانے والے خیالات تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ اس کے نزدیک یہ ایک عام سی بات تھی اور یہ کہ ہر شخص ایسا ہی ہوتا ہے یا اسے ہونا چاہئے۔ کتے نے کہیں سے ایک ہڈی حاصل کی، بیٹھ کر چبانے لگا۔

''چھوڑو اس فضول کام کو''۔ وکی نے اپنے دوست سے کہا۔ ''چلو اب گھر چلیں''۔ اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے ہڈی دور پھینک دی۔ کتے نے غرا کر ہڈی دوبارہ دبوچ لی اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اس نے پھر ٹھوکر رسید کی۔ اس مرتبہ آوارہ مزاج کتے نے باقاعدہ بھونک کر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ وکی نے حیران ہو کر

دیکھا کہ نیچ ذات کتا تو اعلانِ جنگ کر رہا ہے۔ کتے کی نفسیات کے متعلق تو کچھ کہا نہیں جا سکتا، البتہ وکی کی ''نفسیات'' کھل کر سامنے آ گئی۔

وکی نے بھاگ کر قریب ترین قصاب کی دُکان سے چھرا اٹھا لیا۔ محوِ کار قصاب شور مچاتا رہ گیا۔ کتا اپنے پسندیدہ شغل میں مصروف تھا کہ اس نے جاتے ہی چھرا اس کی پسلی میں گھونپ دیا۔ کتا تڑپ کر اٹھا۔ اس نے بھی دوستی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وکی پر حملہ کر دیا۔ اردگرد سے قصاب کام چھوڑ چھاڑ کر بھاگتے ہوئے آئے مگر کسی کے نزدیک آنے سے پیشتر وکی نے جسیم کتے کو درندے کی طرح وحشت ناک انداز میں چیر پھاڑ کے رکھ دیا۔ اس کی اپنی ٹانگ اور دونوں بازو زخمی تھے مگر جب اس کا چھرا ''کچ'' سے فربہ کتے کے جسم میں داخل ہوتا تو اس کے ذہن میں پڑی ہوئی ایک گرہ سی کھل جاتی اور وہ اپنے وجود کو نسبتاً ہلکا پھلکا محسوس کرتا۔ اس طرح اس کے غصے میں دل کی رغبت بھی شامل ہوتی گئی۔

''کتے کا زخم اچھا نہیں ہوتا''۔ ایک بڑی بڑی مونچھوں والے قصاب نے آگے بڑھ کر اسے روکا اور از راہِ ہمدردی زخم کا معائنہ کرنے کی کوشش کی۔ ''ہسپتال جا کر ٹیکے لگوا لو''۔

بپھرے ہوئے وکی نے قہر آلود نگاہوں سے مچھندر قصاب کو دیکھا۔ چار سُو خون کی سرخی، ادھر بڑی بڑی مونچھیں، اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اس نے قصاب پر بھی حملہ کر دیا۔ پیٹ کی جانب بڑھنے والے چھرے کی نوک کو قصاب نے کمال پھرتی سے روکا۔ پیٹ کے حصے کا زخم ہاتھ نے کھایا۔ کئی مضبوط ہاتھوں نے وکی کو قابو کرنے کی کوشش کی مگر جانے کون سی جناتی قوت اس کی فصیل جاں میں سرایت کر چکی تھی کہ سپرنگ کی طرح اچھل اچھل کر وہ ان کے ہاتھوں سے آزاد ہو جاتا۔ چھوٹے ہاتھوں میں بڑا چھرا مسلسل اپنا کام دکھا رہا تھا۔ آخر ہتھوڑے جیسا ایک ہاتھ اس کے سر پر پڑا اور اس کا ذہن اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ آخری آواز جو اس کی سماعت سے ٹکرائی وہ کچھ اس طرح کی تھی۔ ''ارے! یہ تو ضراب خان کا بیٹا ہے''۔

ہوش آیا تو زرینہ، ریشماں، عذرا اس کے پلنگ کے گرد سوگوار بیٹھی تھیں۔ بیگم ضراب کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ عذرا کا تو رو رو کر بُرا حال ہو چکا تھا۔ وکی کے دونوں بازوؤں اور ٹانگ میں آگ سی لگی تھی۔ اس نے تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کی۔

''نہ چندا لیٹے رہو، سب ٹھیک ہے''۔ بیگم ضراب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی رسان سے کہا۔ ''چندا'' کا لفظ سن کر وکی کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے چونک کر مہربان خاتون کے سرخ و سپید چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ ''درد زیادہ ہے چندا؟'' شفقت بھری آواز کانوں میں رس گھولنے لگی۔ بہت دور ماضی کی دھندلی وادی میں سے رسیلی آواز، گھنٹیوں کا سا ترنم، سماعت سے ٹکرانے لگا۔ ''چندا'' ''میرا چاند'' تنا ہوا جسم پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ انجانے میں بیگم ضراب نے اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''نہیں 'آپی' مجھے درد بالکل نہیں ہو رہا''۔ بیگم ضراب خاں کو اس نے ''آپی'' کہا تو سب نے اسے چونک کر دیکھا۔ وکی نے آنکھیں بند کر کے تکیے پر سر ٹکا دیا۔

''بیگم! لڑکے کو ہوش آ گیا؟'' ضراب خان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہوش بھی آ گیا اور اس نے مجھے نئے رشتے کے بندھن میں بھی جکڑ لیا''۔

بیگم سے تفصیل سن کر پہلے تو ضراب خاں متفکر سا ہوا پھر وہ مسکرانے لگا۔ ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

''میں نے اس کے زخموں پر مرچیں چھڑک کر پٹی باندھ دی''۔

بیگم ضراب نے تفکیر بھرے لہجے میں کہا۔ ''زخموں پر نمک چھڑکنا تو سنا کرتے تھے، آپ نے تو حد کر دی، مرچیں چھڑکنے کا حکم دیا''۔

''بیگم! میں اس کا دشمن نہیں، کتے نے اس کے جسم میں دانت گاڑ دیئے تھے یہی اس کا فوری علاج تھا۔ ضراب خان نے بیوی کو تسلی دی۔ ''چلو، اس نے تمہیں ماں کے بجائے، بہن کا درجہ دے دیا۔ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے''۔ پھر اس نے وکی اور اس کی ہمشیرہ ناہید کے درمیان شفقت کے اس مضبوط رشتے کا ذکر کیا جس کے سامنے دنیا کے سب رشتے ہیچ تھے۔ اس کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی۔

''ابو! مجھے اس شخص کا پتا درکار ہے جس نے وکی کے سر پر ''ہتھوڑا'' مارا تھا''۔ عذرا نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''بیٹا! وہ اس کا دشمن نہیں تھا''۔ ضراب خاں نے بیٹی کی تفکیر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ ایسا نہ کرتا تو تمہارا یہ بھائی جانے کتنوں کی جان لے کر بس کرتا''۔

''چلئے، وہ اس کا ہمدرد ہی سہی مگر میں بھی اس شہ زور سے ایسا ہی ہمدردانہ سلوک کرنا چاہتی ہوں۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے''۔ عذرا نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔ ضراب خان اس ''ہمدردانہ سلوک'' کا مفہوم سمجھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

''تو آیئے، انا یہ شوق بھی پورا کر لیجئے''۔ ضراب خان نے مہمان خانے کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ ظالم سفاک، آپ کے معصوم وکی سے ملاقات کرنے خود تشریف لے آیا ہے اور یہ میرے لئے ایک اعزاز ہے جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا''۔

''ابو! کیا بات ہے؟ وہ کون خوش نصیب ہے جسے آپ اس طرح آسمان پر چڑھا رہے ہیں؟ کیا وہ کوئی رستم ہے؟'' عذرا نے باپ کی افتادِ طبع کے مدنظر رستم کا نام لیا۔

''رستم...... بیٹی! وہ رسم رستماں ہے۔ پُراسرار قوت کا مالک اور مارشل آرٹ جیسے فنون کا نصاب مرتب کرنے والا رگ زانگ، شاؤلین ٹیمپل میں اعلیٰ ترین مقام و مرتبے کا مالک۔ اگر اپنا وکی اس کے معیار پر پورا اتر آیا تو وہ ناقابلِ شکست بن جائے گا۔ میرے پاس تو رگ زانگ کے علم کا عشر عشیر بھی نہیں''۔

اس طرح وکی رگ زانگ جیسی نابغۂ روزگار ہستی کے سپرد ہوا۔ رگ زانگ نے پہلی نگاہ ہی میں اسے ''پسندیدگی'' کی سند عطا کر دی پھر وہ اسے اپنے ہمراہ لداخ کے دور دراز علاقے میں لے گیا۔ مکمل تین برس اس کی تربیت کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ اسے شاؤلین ٹیمپل کی تبتی شاخ میں لے گیا اور چند سال کے مختصر تربیتی عرصے میں اسے ایک شہکار میں بدل ڈالا۔ وکی واپس آیا تو وہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ وہ خوداعتمادی کا منہ بولتا اشتہار دکھائی دیتا تھا۔

عذرا نے بھی اس دوران خوب پر پُرزے نکالے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو عرصۂ دراز کے بعد دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔

ضراب خان کے گھر میں وکی کو وہی مقام و مرتبہ حاصل تھا جو ایک حکمران کی سلطنت میں ولی عہد کا ہوتا ہے۔ فاطمہ، بیگم ضراب خان نے بھی ممتا بھرے دل کے سارے دروازے اس کے لئے کھول دیئے تھے۔ دونوں اس کی تاریک زندگی کو آفتاب و مہتاب کی طرح روشن کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتے مگر وکی کے سینے میں ایسا خلا پیدا ہو چکا تھا جس میں ہزاروں چاند سورج ڈوب جائیں۔ عذرا چونکہ اس کی ہم عمر تھی وہ اپنے رشتے

کا بھرپور فائدہ اٹھاتی۔ ہنسی مذاق میں اس کا ناک میں دم کئے رکھتی۔ اسے ماں کی سرزنش کی پروا تھی نہ باپ کی ڈانٹ ڈپٹ کا خیال۔ وکی بس مسکرا کے رہ جاتا۔ جب اندر سناٹا طاری ہو، ڈال ڈال پھدکنے والی ساری خوش رنگ بلبلیں دم توڑ جائیں تو قہقہہ لگانا بڑا دشوار مرحلہ بن جاتا ہے۔

شہاب الدین کی حویلی کرائے پر اٹھا دی گئی تھی۔ وکی جب بھی عیش مقام سے دس بارہ میل کا فاصلہ طے کر کے اپنی ''چندا آپی'' اور سارے خاندان کے مقتل کی زیارت کرنے آتا تو اس کے زخم ہرے ہو جاتے۔ اس کا حافظہ تو ویسے بھی بلا کا تھا۔ دیکھی سنی یا پڑھی ہوئی باتوں کو یاد رکھنا اس کے لئے کوئی مسئلہ ہی نہ تھا بلکہ غیر ضروری باتوں کو بھلانا اس کے لئے البتہ بڑا مشکل کام تھا۔ اس کی صلاحیت ہی اب جان لیوا عذاب بنتی جا رہی تھی۔ رگ زانگ کی تربیت کا یہ اثر ہوا کہ وہ نہ صرف ٹوٹ کر بکھرنے سے بچ گیا بلکہ اپنے کرب کو چھپانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ وہ ایک ایسا بپھرا ہوا دریا تھا جسے کناروں میں پابند کر کے مفید ترین بنا دیا گیا ہو۔

اس رات فاطمہ ممتا کی ماری نے، شفقت بھرے لہجے میں اسے زین الدین ولی کے مزار پر حاضری دینے کی تلقین کی جو کشمیر میں زینہ رشی کے نام سے مشہور ہیں۔

''بیٹا! زینہ رشی کے مزار پر صدقِ دِل سے مانگی ہوئی ہر دعا قبول ہو جاتی ہے''۔ فاطمہ نے بڑی عقیدت سے کہا۔

''امی! یہ تو پکا وہابی ہے''۔ عذرا نے جھٹ لقمہ دیا۔ ''مزاروں پہ جا کر دعائیں مانگنا اپنی توہین سمجھتا ہے''۔

''اے لڑکی! کبھی تو اپنی زبان کو قابو میں رکھا کر''۔ فاطمہ نے سرزنش کی۔

''امی! کیا یہ سچ ہے کہ زین الدین ولی، پہلے غیر مسلم تھے''۔ عذرا نے سنجیدگی اختیار کی۔

''ہاں، بیٹی! زینہ رشی، کشتواڑ کے رہنے والے تھے اور ان کا اصل نام زین سنگھ تھا''۔ فاطمہ نے بزرگ کا تعارف پیش کیا۔ ''پھر یوں ہوا کہ نورالدین ولی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ بس نندہ رشی کی ایک نظر نے زین سنگھ کی کایا ہی پلٹ دی انتہا یہ کہ یہی بزرگ ان کے خلیفہ بنے، یہ شیخ العالم کی نظر کا کمال تھا۔ مرشد نے ان کو تبت بھیجا کہ وہاں کی سرزمین پر بھی سچائی کی روشنی پھیل سکے۔ تبلیغ سے فراغت کے بعد زینہ رشی نے وچھن پارہ کے ایک غار میں سکونت اختیار کر لی۔ چنانچہ بارہ برس یادِ الٰہی میں مصروف رہنے کے بعد ایک روز وہ غار سے نکلے اور عقیدت مندوں سے مخاطب ہوئے کہ ان کے وصال کا وقت آ گیا ہے اور یہ کہ ان کو تلاش نہ کیا جائے''۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟'' عذرا نے جھٹ سوال کیا۔

''ان کا جسد خاکی غائب ہو گیا تھا''۔ فاطمہ نے تشریح کی۔ ''اور ان کی ہدایت کے مطابق جہاں ان کا عصا پڑا ملا وہیں ان کا مزار بنا دیا گیا''۔

ضراب خان گھر میں داخل ہوا تو وہ بھی شریک گفتگو ہو گیا۔ اس کا طریقۂ تعلیم منفرد نوعیت کا حامل ہوا کرتا تھا۔ وکی تو جسمانی مشقت سے گزر کر اس کے خوابوں کی تعبیر بن چکا تھا۔ بچوں کی ذہنی نشوونما کا بھی وہ بطورِ خاص خیال رکھتا۔ وادیٔ کشمیر کے ماضی بعید پر وہ داستان کے انداز میں گفتگو کرتا۔ وکی اگرچہ خاموش سامع ہوا کرتا مگر ضراب خان جانتا تھا کہ اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ وکی کے ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔

''ابو! آج ہمیں کشمیر کی کہانی سنائیں''۔ عذرا نے سنجیدگی سے فرمائش کی۔ ضراب خان کا بھی خیال تھا کہ یہ کہانی ہر کشمیری کو ازبر ہونی چاہئے۔ لہٰذا وہ اپنے خاص

کوئی مرض لاعلاج نہیں (القرآن)

سوائے موت کے

ماہنامہ ''حکایت'' کے شعبہ ''دست شفاء'' کے مستند و ماہر ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ) کی جدید تحقیقات اور ماہرانہ خدمات سے مستفید ہوں اور پرانے، ضدی اور لاعلاج امراض، خصوصاً درج ذیل امراض کے تیز ترین اور بے ضرر علاج کے لئے رجوع فرمائیں:

پولیو
الرجی
ذہنی معذور بچے
یادداشت کی خرابیاں
ہاتھوں کی جلد کی خرابیاں
ہائی بلڈ پریشر
ناک و گلے کے غدود کا بڑھ جانا
اعضاء کی بے حسی یا کنٹرول نہ ہونا
پھیپھڑوں کے امراض
احساسِ کمتری، جھجک
مردانہ، زنانہ امراض
اعضاء کا پیدائشی (یا بعد میں) ٹیڑھا پن

رابطہ کے لئے

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ) 0321-7612717
0312-66250[illegible]6

عارف محمود 0323-4329344

بالمشافہ ملاقات کے لئے پہلے وقت لیں۔

دست شفاء حکایت 26 پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور

دلکش انداز میں لب کشا ہوا اور علم کا دریا بہانے لگا۔

***

وکی مقامی ہائی سکول سے دسویں درجے کا امتحان پاس کر کے کشمیر یونیورسٹی میں داخلہ لے چکا تھا۔ عذرا حقیقی معنوں میں کشمیری دوشیزہ کا روپ دھار چکی تھی گہری نیلی آنکھیں، سنہرے بال دل میں اتر جانے والے نقوش، غرض اسے دیکھ کر زاہد شب زندہ دار بھی بہک جانے کھانے پر مجبور ہو سکتا تھا۔ عذرا اور وکی دونوں کی پرورش ایک ہی گھر میں ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے مزاج آشنا تھے۔ زندگی اتنی ہی پُرسکون تھی جتنی اس پُرآشوب زمانے میں ہو سکتی تھی۔ قدم قدم پہ غلامی کے چنگل کا احساس۔ ادھر خاکستر ماضی میں دبی ہوئی چنگاریاں وکی کو بے چین کئے رکھتیں جسے محسوس کر کے عذرا بھی سپرد اضطراب ہو جاتی۔ اگر ماحول کی تلخی ان چنگاریوں کو ہوا نہ دیتی تو شاید وہ بجھ ہی جاتیں۔

عیش مقام، وادی لدر کی خوبصورت بستی، پہاڑی ڈھلوان پر واقع ہے۔ یہ جگہ اتنی حسین ہے کہ وہاں کی خوبصورتی کو تلاش نہیں کرنا پڑتا۔ آنکھ کھول کر جدھر بھی نگاہ کی جائے مسحور کر دینے والا حُسن، آنکھ کے دریچوں پر دستک دینے خود آموجود ہوتا ہے۔ یہی ملدیال خاندان کی رہائش گاہ تھی۔

حالات روز بہ روز بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے تھے، گھر میں ضراب خان اور وکی کی موجودگی بڑی تقویت کا باعث تھی مگر بھارتی درندے ہر بھیس میں شب خون مارنے کے عادی ہو چکے تھے۔ کسی کی عزت محفوظ تھی نہ جان و مال۔ ان غنڈوں نے صورتِ حال کو مزید خراب کر رکھا تھا جو بھارت کے مختلف شہروں سے کشمیریوں کو لوٹنے وادی کا رخ کر رہے تھے۔ اس لوٹ کھسوٹ میں جن سنگھ، شیوسینا، راشٹریہ سیوک سنگھ اور وادی کے سرحدی شہروں کے فسادی مفادی سرفہرست تھے۔ عدم تحفظ کا یہ احساس، جان لیوا عذاب سے کم نہ تھا۔

وکی کی سولہویں سالگرہ پر ضراب خان کے ایک لداخی دوست نے اپنے بھتیجے کو ایک منفرد تحفہ عطا کیا۔ یہ ایک قدآور خونخوار کتا تھا جس کا نام بھی بڑا عجیب و غریب تھا یعنی ''ماگیر''۔ یہ وحشی درندہ وکی کا ایسا گرویدہ ہوا کہ بس اس کا سایہ بن کر رہ گیا۔ حد یہ کہ مالک ہی کے کمرے میں ایک آنکھ کھلی رکھ کر سوتا۔ چند ماہ کی رفاقت سے ماگیر، وکی کا ایسا مزاج آشنا ہو گیا کہ عذرا تک کو رشک آنے لگا۔ درندے نے گویا اپنے سارے فیصلے مالک کے سپرد کر دیئے۔ یہ حُبِ اختیاری کی انتہا تھی۔

***

''فقیہ وقت نے دی ہے ضمانت امن عالم کی......
مگر پھر بھی اے لوگو! احتیاطاً جاگتے رہنا'' کے مصداق شب بیداریاں کشمیریوں کا مقدر بن چکی تھیں۔ ویسے تو کشمیریوں کی ہر رات، شب تاریک اور ہر روز، روزِ سیاہ تھا مگر یکم جولائی 1974ء سری نگر کے قریب ایک جلسے میں جب شیخ عبداللہ نے بہانگ دہل اعلان کیا کہ کشمیر کا الحاق بھارت کے ساتھ قطعی ہے تو حالات مزید تاریک راہوں پر رواں دواں ہوئے۔ تمام سیاسی جماعتوں نے اس کی کھل کر مخالفت کی۔ مسلم کانفرنس، محاذ رائے شماری، آزاد مسلم کانفرنس، لبریشن لیگ، جمعیت علماء جموں و کشمیر، تحریک عمل اور جموں و کشمیر عوامی تحریک نے احتجاج کیا اور حالات روز بہ روز بگڑتے چلے گئے۔ ضراب خان کشمیر سے ہجرت کے متعلق سوچنے لگا مگر وکی نے اس کی سخت مخالفت کی۔

وہ رات ماضی بعید کی شب جیسی شب سیاہ ثابت ہوئی۔ آدھی رات ڈکیت گھڑی کا عمل تھا۔ وکی اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ ہولناک چیخ سے اس کی آنکھ

کھل گئی۔ اب وہ شفقت ہمشیر اوڑھ کر سونے والا معصوم بچہ نہیں تھا کہ سہم کر سکتے میں آ جاتا۔ وہ ایسا آتش فشاں بن چکا تھا جس کا کام صرف اور صرف جلا کر راکھ کر دینا ہوتا ہے اور پھر جلی ہوئی راکھ کا وجود بھی مٹا دینا۔ لاوے کی حدت جمادات و نباتات تک کے لئے یکساں طور پر تباہ کن ہوا کرتی ہے۔ حیوانات کس شمار میں ہیں۔ وہ اچھل کر پلنگ سے نیچے اترا، ادھر ماگیر نے کان کھڑے کر کے مالک کی طرف دیکھا۔ اس کے گلے سے غراہٹ خارج ہوئی مگر وکی کی سرزنش سے گلے ہی میں دم توڑ گئی۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی مڈبھیڑ ایک بندوق بردار سے ہوئی۔ بندوق کی اکلوتی آنکھ کو اس کے سینے کی طرف اٹھنے کی حسرت ہی رہی۔ وکی نے پوری قوت سے کھلی ہتھیلی کا وار بندوق بردار کی گردن پہ کیا۔ مضروب کو مقتول ہونے میں ایک پل بھی نہ لگا۔ مقتول کی بندوق روس کی بنی ہوئی جدید قسم کی کلاشنکوف تھی۔ اس نے بندوق ہاتھ میں لیتے ہی اسے ''آٹو'' پہ رکھا اور بگولے کی طرح زرینہ، ریشماں اور عذرا کے کمرے میں پہنچا۔

مٹن والی حویلی جیسی صورتِ حال تھی۔ سٹیج وہی تھا، کردار مختلف تھے۔ دستِ ستم وہی تھا، خنجر اور قسم کے تھے۔ کمرے میں چار بندوق بردار تھے، ایک نے ضراب خان کو زد پہ لے رکھا تھا، تین گھر کی خواتین کے گرد کھڑے تھے۔ وکی کو دیکھتے ہی عذرا نے دلدوز چیخ ماری۔

''سب لوگ منجمد ہو جائیں''۔ وکی نے گرج کے کہا۔ ''میری گن گروپ فائرنگ پر ہے اور انگلی ٹریگر پر''۔ اس کی آواز نے جادوئی اثر دکھایا۔ وہ تمام پیشہ ور فوجی تھے اور صورتِ حال کو فوراً سمجھنے کی صلاحیت سے مالا مال بھی تھے۔ ضرورت سے زیادہ جاننا بھی نقصان دہ ہوتا ہے۔ جو کام جستِ جنوں خیز، سرانجام دے سکتی ہے وہ منصوبہ بندیوں کے بس کی بات نہیں۔ محیر العقول کارنامے جنون ہی کا نتیجہ رہے ہیں۔ سب نے اپنے اپنے ہتھیار فوراً پھینک دیئے۔ ضراب خان اپنی اولاد کو زد پر دیکھ کر مفلوج ہوا تھا ورنہ منظر کچھ اور ہوتا۔

''عذرا، لرزنا چھوڑ دو اور بندوقوں پر قبضہ کرنے میں چچا جان کی مدد کرو''۔ وکی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''میں ان حرام زادوں کا خون پی جاؤں گا''۔ ضراب خان نے دانت پیس کر کہا۔ باپ بیٹی نے بندوقوں پر قبضہ کر لیا۔ سانپوں کے دانت جڑوں سے اکھڑ گئے تو وہ بے ضرر کیچوے بن گئے۔ باقی صرف ان کی دہشت رہ گئی۔

''تم لوگ سرکار سے ٹکر لے رہے ہو''۔ حملہ آوروں کے انچارج نے یاددہانی کرائی۔ اس کے لہجے میں خوف و ہراس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ یہی حکمرانی کا کرشمہ ہے کہ بزِغالہ بھی شیرِ نر کی طرح دھاڑ سکتا ہے۔ ''ہم سپیشل فورس کے آدمی ہیں اور اس گھر کی تلاشی لینے آئے ہیں''۔

''آدھی رات کو تلاشی؟'' عذرا کے جسم پر طاری لرزہ ختم ہو چکا تھا۔ ''کس کے حکم سے لی جا رہی ہے تلاشی؟'' اس نے انچارج کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپی جان! آپ لڑکیوں کو لے کر میرے کمرے میں چلی جائیں''۔ وکی نے بیگم ضراب خان سے کہا۔ ''اب یہ جگہ آپ کے لئے مناسب نہیں رہی''۔

''اس مردود کو ہرگز معاف نہ کرنا''۔ فاطمہ نے انچارج کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ عذرا کو اغوا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے...... اس نے......'' فاطمہ ایک ماں تھی، کوشش کے باوجود باعث شرم الفاظ زبان پر نہ لا سکی۔

وکی کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ بندوق اس

نے ضراب خان کو تھما دی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا انچارج کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں وہ ناپاک زبان دیکھنا چاہتا ہوں جس سے تُو نے نازیبا الفاظ ادا کئے''۔ اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔ مقابل کھڑا شخص اُس کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

وکی کے حلق سے دھاڑ سی نکلی اور ساتھ ہی اس کا سیدھا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اکڑی ہوئی انگلیاں حریف کے پیٹ میں یوں گھس گئیں جیسے فولادی سلاخیں پگھلے ہوئے موم میں گھس جاتی ہیں۔ وہ شخص ''اوچ'' کر کے آگے کی طرف جھکا۔ وکی کا الٹا ہاتھ وزنی ہتھوڑے کی طرح اس کی گردن پر پڑا اور وہ کبھی نہ اٹھنے کے لئے زمین پر گر گیا۔ اس کے تینوں ساتھیوں کا رنگ فق ہو چکا تھا۔

''لیجئے آپی! مجرم اپنی سزا کو پہنچا''۔ وکی کے لہجے میں سکون ہی سکون تھا۔ ''میرا ایک ہاتھ ناپاک ہو گیا ہے''۔ اس نے اپنے خون آلود ہاتھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ضراب خان کے خوابوں کی تعبیر کا یہ عملی مظاہرہ اس کے لئے باعث اطمینان تھا۔

''امی، چلئے یہاں سے''۔ عذرا ان سب کو لے کر وکی کے کمرے کی طرف چل دی۔

''ماگیر، تم دروازے پر جا کر پہرہ دو''۔ وکی نے کتے سے کہا اور وہ عذرا کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

''وقار بیٹے! تم بھی جاؤ''۔ ضراب خان نے بقیہ تین مجرموں پر بندوق تانتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے ہاتھوں سے انہیں واصل جہنم کرنا چاہتا ہوں''۔

''نہیں چچا جان! آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا''۔ وکی نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ ''دوسرے اس کام میں خون بہنا اور شور، دونوں نامناسب ہیں''۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ تین تھے مگر چند لمحے پیشتر ان کی بصارتیں جس درندگی کا مشاہدہ کر چکی تھیں وہ ناقابل یقین تھا۔ مگر سب کچھ ان کے سامنے ہوا تھا۔ تینوں کی ہمتیں جواب دے چکی تھیں۔ صرف ایک نے حوصلے کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینا چاہا اور اچانک اچھل کر وکی پر حملہ کر دیا۔ انسان کی زندگی میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب وہ انجام سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

وکی کا ذہن پوری طرح بیدار تھا۔ اس نے حملہ آور کو دبوچ کر یوں سر سے بلند کیا جیسے وہ روئی کا بے وزن پتلا ہو پھر اس نے پوری قوت سے حریف کو زمین پر پٹخ دیا۔ حملہ آور نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی مگر وکی نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی اور اس وقت تک دبوچے رکھی جب تک اس کی آتما، شریر (بدن) کے پنجرے سے پرواز نہ کر گئی۔ پھر وہ بقیہ دو خوف زدوں کی طرف متوجہ ہوا۔ دونوں نے جاں بخشی کی استدعا کی مگر اب فرار کے سب راستے بند ہو چکے تھے۔ وکی کے اندر کا درندہ کروٹ لے کر بیدار ہو چکا تھا۔ خطرناک بات یہ تھی کہ اسے جان لینے میں لطف آ رہا تھا۔ ضراب خان نے محسوس کیا کہ وکی موت کا ہرکارہ بن چکا ہے۔ وہ مہلک وار، دل کی رغبت اور روح کے میلان سے کر رہا تھا۔ یہ آثار اچھے نہ تھے مگر وہ وقت اخلاقی قدروں کے تحفظ کا نہ تھا۔ اس لئے وہ موت کے کھیل کو خاموش تماشائی بن کر دیکھتا رہا۔ صرف دس منٹ بعد کمرے میں چار لاشیں پڑی تھیں۔ سوائے پہلے مقتول کے نہ کسی کا خون بہا نہ شور وغل ہوا، ساری کارروائی مکمل خاموشی سے پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

ضراب خان ضرورت سے زیادہ مطمئن تھا۔

''اب ان لاشوں کا کیا کیا جائے؟'' ضراب خان نے سرسری لہجے میں کہا۔

''پہلے میں نے سوچا تھا کہ ان کو ''شاہ کول'' میں

پھینک دیا جائے''۔ وکی نے چارپائی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ (سلطان زین العابدین کے عہد میں دریائے لدر سے نکالی جانے والی نہر شاہ کول کہلاتی ہے) مگر اب میں نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔ ان کا مقام نہر شاہ کول نہیں، تیز و تند دریا لدر ہے۔ ہو سکتا ہے یہ دریائے جہلم میں پہنچ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ پھرتے پھراتے پاکستان چلے جائیں۔ یہ پاکستانیوں کی خدمت میں ہماری طرف سے ایک نادر الوجود تحفہ ہو گا''۔

''خیر! پاکستان پہنچنے والی بات تو ناممکن سی ہے کہ پہلے ان کو ویری ناگ پہنچنا ہو گا''۔ ضراب خان نے خونی حادثے کے باوجود اپنے خاص انداز میں تشریح کی۔ ''پھر جھیل ودلر میں ان کا تو نام ونشان مٹ جائے گا۔ اگر جھیل ودلر کے بعد یہ دریائے جہلم میں پہنچ بھی گئے تو بارہ مولا، اوڑی اور پھر مظفرآباد تک کیسے پہنچ پائیں گے؟''

ضراب خان اور وکی نے مل کر پانچوں لاشوں کو دریا برد کیا۔ وکی کے کپڑوں پر خون کا دھبا تک نہ تھا۔ دونوں طلوع سحر سے کچھ دیر پہلے گھر پہنچے۔ ''ماگیر'' نے استقبال کیا۔ فاطمہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ جاگ رہی تھی۔ قیامت بپا ہوتے ہوتے رہ گئی، حشر بپا ضرور ہوا مگر بیان دگر میں۔ ضراب خان کا سارا خاندان ایک کمرے میں جمع تھا۔ ہر شخص کی سوچ الگ الگ تھی۔ ضراب خان کو بچیوں کی فکر دامن گیر تھی، فاطمہ قربان ہو جانے والی نظروں سے اپنے منہ بولے بیٹے کو دیکھ رہی تھی جو اسے امی کے بجائے آپی کہتا تھا۔ زرینہ اور ثماں کی نگاہوں میں شہ زور بھائی کے لئے غرور کی حد فخر تھا جس نے طوفان کا رخ پھیر دیا تھا۔ البتہ عذرا نے اس روز پہلی بار، وکی کو بدلی ہوئی نظر سے دیکھا جیسے اندھیری رات کا مسافر مینارِ نور کو دیکھتا ہے۔ اس ''کشمیر کلی'' کو محسوس ہوا جیسے اس کے سینے سے دل تفریق ہو چکا ہو۔ عذرا نے پل بھر میں زندگی کا سارا اختیار وقار کو سونپ دیا اور اپنی ذات کی مکمل نفی کر ڈالی۔ اس نور و نکہت بھرے لمحے پہ قبضہ کرنے کے بعد اظہار دیوانگی ضروری ہوتا ہے۔ وہ ٹکٹکی باندھے وکی کو تکے جا رہی تھی حتیٰ کہ محو تماشا پاگل لڑکی خود تماشا بن کے رہ گئی۔

''لڑکی! کیا ہونقوں کی طرح دیکھے جا رہی ہے؟'' فاطمہ نے اپنی لاڈلی کو پیار بھری سرزنش کی۔

عذرا محجوب سی ہو گئی۔ اس کے گال تمتمانے لگے۔ ہرنی پل بھر کے لئے چوکڑی بھولی مگر طبیعت کی تیزی طراری آڑے آئی اور اس نے فوراً بات کا رخ بدل ڈالا۔ ''امی! یہ حضرت آپ کو ''آپی'' کیوں کہتے ہیں؟''

یہ ایک بے ضرر سا سوال تھا مگر وکی کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ چند گھنٹے پیشتر وہ جذباتی ہیجان سے گزرا تھا اور اب یہ لڑکی انجانے میں اس چنگاری کو ہوا دے رہی تھی جو راکھ تلے دب چکی تھی۔ پھر اس کے کانوں میں جلترنگ سے بجنے لگے۔ ''شیطان کی ٹونٹی، چھوڑ میرے بال، چندا آپی کو تکلیف ہوتی ہے میرے چاند''۔ وکی ماضی کی رنگین و فرحت بخش وادی میں پہنچ چکا تھا۔ یہی شفقت بھری سرزنش سننے کے لئے وہ ''چندا آپی'' کے سنہرے بال کھینچا کرتا تھا۔ صدیاں بیت گئیں یہ الفاظ اس کی سماعت سے روٹھ چکے تھے۔ جیتے جاگتے انسانوں کو منایا جا سکتا ہے مگر روٹھے ہوئے ''حرفوں'' کو کون منائے۔ وکی کے چہرے پر ایسا نرم اور ملائم بھولپن رقص کر رہا تھا جو صرف بے ریا معصومیت ہی کا مقدر ہوتا ہے۔ عذرا ابھی تک اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔

''ماں! اگر بیٹے سے پیار کرتی ہے تو وہ مجبور ہوتی ہے''۔ ضراب خان نے بیٹی کے سوال کا جواب دیا۔ ''اس لئے کہ وہ تخلیق کے کرب سے گزر چکی ہوتی ہے

ایسی حماقت کی توقع خام خیالی تھی۔ ضراب خان کا مکان کوئی اندھا کنواں تھا نہ گہرا سمندر کہ پانچ ''سینکوں'' کی گم شدگی کو معمولی حادثہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا۔ دشمن کی جانب سے جوابی کارروائی میں تاخیر کا سبب صرف یہ تھا کہ ''شکاری پارٹی'' کی شکارگاہ کے متعلق چند شکوک وشبہات پائے جاتے تھے۔ دوسرے اپنی کمین گاہ میں کوئی زندہ سلامت پہنچ نہیں پایا تھا جو صورتِ حال کی وضاحت کرتا۔ جب اوپر والوں کو حالات سے آگاہی ہوئی تو گویا ایوانِ ستم میں زلزلہ آ گیا۔ وکی اور ضراب خان دشمن کی ''ہٹ لسٹ'' پر سرفہرست قرار دیئے گئے۔ حکام اس چنگاری کو شعلے میں تبدیل ہو جانے سے پیشتر بجھا دینا چاہتے تھے۔ یہی دستورِ ستم ہے اور یہی رہے گا۔

(باقی سالنامہ فروری میں ملاحظہ فرمائیں)

***

مگر ایک بہن کی محبت اس سے آگے کی چیز ہے یا ہونی چاہئے۔ میرے خیال میں یہ شفقت ہمشیر، زیادہ بے غرض ہوتی ہے''۔

''تو یوں کہئے کہ وقار نے امی جان کو بلند ترین مقام پر فائز کر دیا ہے''۔ زرینہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا ہوگا؟'' ریشماں نے عجیب وغریب سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے جو کچھ ہو چکا ہے وہ کوئی معمولی بات تو نہیں؟'' اس کا اشارہ سمجھ کر سب یک لخت خاموش ہو گئے۔

''یہاں آج یا کل، کبھی بھی کچھ نہیں ہوا''۔ وکی نے فوراً جواب دیا۔ ''وہ صرف ایک منحوس خواب تھا''۔

ضراب خان کے خاندان کا یہی خیال تھا کہ نصف شب کو پیش آنے والے خونی حادثے کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی مگر ہندو منصوبہ بند ذہن سے

دست وگریباں کے بعد معروف مزاح نگار خادم حسین مجاہد کی
طنز ومزاح پر مشتمل دوسری کتاب

قلم آرائیاں
شائع ہو گئی ہے
صفحات 160
قیمت 120 روپے
رازدارِ حیوانات | مضامین، کہانیاں | پرچہ جات
از نوابی تا قصابی | آنجہانی شاعری | ادبی اجلاس | چور کی ڈائری
ملنے کا پتہ: حق پبلشرز A-2 سید پلازہ چیٹر جی روڈ اردو بازار، لاہور
Ph: 042-7220631, Mob: 0300-9422434

کے ایچ مجاہد

برصغیر میں تعلیمی صورتِ حال انگریزوں کے دور میں

برصغیر میں مسلمانوں کے اسلامی تشخص کو ختم کرنے کے لئے انگریزوں نے کس طرح تعلیم کو ہدف بنایا اور کیسے عربی فارسی کی جگہ انگلش رائج کی اور حکومت مستحکم کرنے کے لئے کیسے مسلمانوں کو دینی اور دنیاوی طور پر تقسیم کیا۔ اس سازش کا مختصر حال جو مستقبل کا آئینہ ہے کیونکہ ہم آج بھی اس سازش کا شکار ہیں اور اب تک دوبارہ اپنی زبان رائج نہیں کر سکے

☆ کے ایچ مجاہد

انگریزوں سے پہلے مسلم ادوارِ حکومت میں ہندوستان میں مختلف قسم کے تعلیمی ادارے قائم تھے جن کا تذکرہ انگریز سیاحوں نے تفصیل سے کیا ہے، اس سلسلے کی سب سے پہلی کڑی مسٹر آدم کی رپورٹ ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے اس رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف بنگال میں ایک لاکھ ابتدائی مدارس تھے۔ بہار میں اس طرح کا انتظام تھا کہ ہر 32 طلبہ کے لئے ایک مدرسہ تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ کے حصہ دوم میں آبادی وتعلیم کا تناسب کے لحاظ سے تفصیلی تذکرہ کیا ہے اس میں خواندگی اور ناخواندگی کا باقاعدہ گوشوارہ بھی موجود ہے۔ آدم نے اپنی رپورٹ 1829ء میں شائع کی جس میں اس نے مختلف اضلاع کی آبادی اور مدارس کی تعداد کو بھی سپردِ قلم کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مرشد آباد میں 113 مدارس ہیں جبکہ آبادی 1860841 لوگوں پر مشتمل ہے۔ معلمین کی تعداد 1396 ہے جس میں 28 معلمات بھی شامل ہیں۔

اس سلسلے کی دوسری کڑی میکس ملر ہے جس نے بنگال کی تعلیمی حالت کا تذکرہ وضاحت سے کیا ہے۔ وارڈ جیسا متعصب شخص بھی ان دونوں کے خیالات سے اتفاق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر گاؤں اور قصبات میں مدارس کا جال پھیلا ہوا ہے جہاں لکھنے پڑھنے اور ریاض پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ ان مدارس کا نظم ونسق اور اخراجات امراء ورؤسا چلایا کرتے تھے حکومت بھی خصوصی سرپرستی کرتی تھی اکثر مدارس ومساجد کو حکومت نے اساتذہ وطلبہ کے وظائف کے لئے زمین بھی دے رکھی تھی۔ ان مدارس کے طلبہ واساتذہ کو معاشرے میں نہایت اعلیٰ مقام حاصل تھا اور وہ عوام کے چندے کے محتاج نہ ہونے کے باعث دین کی حقیقی تصویر پیش کرتے تھے اور اختلاف اور فرقہ واریت نہ ہونے کے برابر تھے۔ ان مدارس کا نصاب ''پند نامہ''، ''گلستان''، ''بوستان'' اور آمد نامہ کے علاوہ خطاطی

وانشاء پردازی وغیرہ پر مشتمل تھا اور روزانہ 6 گھنٹے درس و تدریس ہوتی تھی۔ امراء و روٗسا اپنے بچوں کے لئے گھر پر تعلیم کا انتظام و انصرام کرتے تھے۔ تعلیم نسواں پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔

انگریزوں میں وران ہیسٹنگز نے 1780ء میں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کلکتہ میں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں عربی اور فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دوسرا مدرسہ اس نے ہندوؤں کے لئے 1790ء میں بنارس میں قائم کیا جہاں پر ذریعہ تعلیم سنسکرت تھا۔ ان مدارس میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ دینیات، قانون، فلکیات، علم ہندسہ، ریاضی، منطق، فن تقریر اور قواعد وغیرہ کی بھی تدریس ہوتی تھی۔ تعلیم کا تکمیلی دورانیہ سات سال تھا۔ اس کے علاوہ بے شمار عیسائی مشنری ادارے بھی چرچ کی سرپرستی اور امداد سے چل رہے تھے جن کا آغاز انگریزوں کی ہندوستان آمد کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ سیاسی تسلط کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے مشنری مدارس کی طرف توجہ دی۔ کمپنی کے افسران پادریوں کی تعلیم میں دخل اندازی پسند نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے تمام مشنری سکولوں کی امداد بند کر دی جس کا ردعمل یہ ہوا کہ پادریوں نے انگلستان میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ مشن سکولوں کے طرفداروں میں چارلس گرانٹ پیش پیش تھے۔ انہوں نے پارلیمنٹ میں ہندوستان کی تعلیمی حالت کی نہایت افسوس ناک تصویر پیش کر کے ہندوستان میں اصطلاحات کی اجازت مانگی جس میں انہوں نے انگریزی ادب اور انگریزی زبان کو ذریعہ اصطلاحات بنایا لیکن کمپنی کے افسروں میں اکثریت علوم شرقیہ کے طرفداروں کی تھی۔ یوں کمپنی کے ملازمین لور پادریوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔

جب یہ مسئلہ پارلیمنٹ میں پہنچا تو مشن سکول کے حامیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ ان کو اشاعت مذہب کی اجازت مل جائے۔ اس موقع پر بورڈ آف ڈائریکٹر نے جو تجاویز پیش کیں ان کو 1813ء کے چارٹر سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ چارٹر ہندوستان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس کے بعد تعلیمی میدان میں جو کچھ بھی ہوا اسی کی بنیاد پر ہوا۔ اس چارٹر کی شق نمبر 43 کے مطابق ''ہندوستان کے گورنر جنرل اور اس کی مشاورتی کونسل کا فرض ہے کہ وہ ملکی آمدنی سے مبلغ ایک لاکھ روپیہ سالانہ تعلیم، ادب اور علماء کی حوصلہ افزائی پر خرچ کرے''۔ لیکن اس میں اس بات کی وضاحت نہیں تھی کہ یہ روپیہ خرچ کس طرح کیا جائے گا۔ کمپنی کے افسران جنگ و جدل میں مصروف ہونے کی بناء پر اس سے فرار حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن پارلیمنٹ کے حکم کے آگے مجبور بھی تھے۔ گزشتہ سو سال سے ہندوستان میں سیاسی ابتری تھی عوام پریشان تھے وہ ہر حال میں امن و امان چاہتے تھے۔ ہندوستان میں اس وقت مفکرین تعلیم اور ماہرین تعلیم کی بھی کمی تھی جو چند ایک تھے جیسے راجہ موہن رائے، ایشور چند، ودھیا ساگر اور جگن ناتھ وغیرہ۔ ان کی کمپنی میں کوئی آواز نہیں تھی۔ کمپنی کے افسران بھی ہندوستان کے تعلیمی مسائل سے ناآشنا تھے جو روپیہ اس مقصد کے لئے منظور کیا گیا تھا وہ بھی قلیل تھا۔ اب کمپنی کے سامنے چار مسائل تھے جو فوری توجہ کے محتاج تھے یعنی مقاصد تعلیم، ذریعہ تعلیم، طریقہ تعلیم اور تعلیم کی ذمہ داری۔

مقاصد تعلیم پر آراء مختلف تھیں۔ ایک طبقے کا خیال تھا کہ انگریزوں کو علوم شرقیہ کی ترقی و ترویج کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ دوسرا طبقہ کہتا تھا کہ مغربی علوم و سائنس کی ترویج و ترقی کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کو کوشش کرنی چاہئے۔ تیسرا طبقہ اس بات کا خوگر تھا کہ تعلیم کا مقصد کمپنی کے لئے خام مال کا انتظام کرنا ہے یعنی اس قسم کی تعلیم کو رائج کیا جائے جس سے کمپنی کو ملازمین مل سکیں۔ ہندوستان میں جو ادارے قائم تھے ان پر بھی کمپنی

کے ملازمین مختلف الرائے تھے۔ ایک طبقہ مشنریوں کے کارناموں کا قائل تھا جبکہ دوسرا طبقہ ان کو برا سمجھتا تھا جس کی خاص وجہ مشنریوں کی مذہبی معاملات میں اجارہ داری تھی۔ تیسرا طبقہ ان اداروں کو نظرِ حقارت سے دیکھتا تھا کیونکہ اس کی نظر میں یہ ادارے بے جان ہو چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی جگہ نئے اداروں کو قائم کیا جائے جن میں تربیت یافتہ اساتذہ کا تقرر ہو جو کمپنی کے ملازم ہوں۔

طریقہ ہائے تعلیم میں بھی لوگوں کے دو مکتبہ فکر تھے۔ ایک کا خیال تھا کہ تعلیم اعلیٰ طبقے سے شروع کی جائے جو رفتہ رفتہ عوام تک پہنچ جائے گی جبکہ دوسرے کا خیال تھا کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں مذکورہ بالا نظریہ ناقابل عمل ہے اگر کمپنی واقعی ہندوستانیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتی ہے تو اس کا انتظام خود کرے اور ایسے طریقوں کو اپنائے جس سے تعلیم جلد سے جلد فروغ پا سکے۔ سب سے پیچیدہ معاملہ ذریعہ تعلیم کا تھا اس ضمن میں بھی کمپنی کے عہدیداران تین طبقوں میں منقسم تھے۔ طبقہ اوّل وارن ہیسٹنگز اور منٹو کے الفاظ کو حرف آخر سمجھتے تھے۔ یہ لوگ عربی فارسی اور سنسکرت کے حامی تھے اور مغربی علوم کی ترویج انہی کے ذریعے سے پسند کرتے تھیں دوسرا طبقہ جس کی سربراہی منرو اور الفنسٹن کر رہے تھے، جدید دیسی زبانوں کے حق میں تھے اور ان کے ذریعے سے ہی وہ علوم غربیہ کو مشرق میں پھیلانا چاہتے تھے۔ تیسرا طبقہ مغربی علوم کو بذریعہ انگریزی ہندوستان میں منتقل کرنے کا خواہش مند تھا۔ یہ اختلافات انگریزوں میں موجود تھے۔ اگر کمپنی کے افسران چاہتے تو وہ اس مسئلے کا خاتمہ بآسانی کر سکتے تھے لیکن وہ خود بھی منقسم تھے اور ایسے فارمولے کے متلاشی تھے جس سے اطمینان بخش حل نکل سکے چنانچہ انہوں نے اس دور میں مختلف تجربات شروع کر دیئے۔ ہر کوئی کوشاں تھا کہ ان مسائل کا کوئی مستقل حل نکل سکے۔ الفنسٹن جو بمبئی کا گورنر تھا اور اصلاحات کا شوقین تھا وہ عوام الناس کی تعلیم کا قائل تھا چنانچہ اس نے نجی اداروں میں لاتعداد اصلاحات کرنی چاہیں۔ اس نے ان کی تعداد میں اضافہ کیا عمدہ اور نفیس کتب کا انتخاب کیا اور عوام میں تعلیم کی مقبولیت کے لئے بھی کوششیں کیں اس نے کہا کہ مشرق اور مغرب کے خیالات کو ملا کر ایسا نصاب تعلیم بنایا جائے جو دونوں کا حسین امتزاج پیش کر سکے۔ اس نے مغربی علوم اور سائنس کی تدریس کے لئے علیحدہ ادارے قائم کرنے کی بھی کوشش کی اور ذریعہ تعلیم مادری زبان کو قرار دیا اور انگریزی زبان کو ثانوی حیثیت سے نصاب تعلیم میں داخل کرنے کی سفارش کی لیکن جلد ہی اس کو اپنے مقاصد میں ناکام ہونا پڑا کیونکہ اس کا مدِمقابل نہایت چالاک، تیز اور عیار شخص وارڈن تھا جو ہندوستان میں ڈاؤن وارڈ فلٹریشن (Downward Filteration) کے ذریعے سے تعلیم کی اشاعت کا خوگر تھا۔

تھامسن جو شمال مغربی سرحدی صوبہ کا لیفٹیننٹ گورنر تھا اور جو ''منرو الفنسٹن اور آدم'' کی ضد تھا، عام تعلیم کا قائل تھا اس نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ نجی اور قدیم اداروں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان میں فنی اور ضروری اصلاحات نافذ کر کے عوام کے لئے سودمند بنایا جائے۔ تھامسن کو لارڈ ڈلہوزی کی پشت پناہی حاصل تھی اس لئے اس کو اپنے مقاصد میں کامیابی ہوئی۔ اس شخص کا دوسرا کارنامہ تعلیمی ٹیکس تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ عوام پر تعلم کے لئے ایک ٹیکس لگا دیا جائے اور اس سے جو آمدنی ہو وہ عوام کی تعلیم و تربیت پر خرچ کی جائے اس نے اس کی باقاعدہ اجازت بورڈ آف کنٹرول سے بھی لے لی تھی۔ اس شخص نے ہی ہندوستان میں امداد کا طریقہ بھی رائج کیا اس کی دوراندیشی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایجوکیشن ٹیکس انگلینڈ میں 1870ء میں لگایا گیا جبکہ وہ ہند

میں کافی پہلے رائج کرنا چاہتا تھا۔
علوم شرقیہ کے حامیوں کا کہنا تھا کہ ایک لاکھ روپیہ جو 1813ء کے چارٹر کی رو سے کمپنی کو ہندوستانیوں کی تعلیم وتربیت پر خرچ کرنا ہے، اس کو مشرقی علوم پر خرچ کیا جائے کیونکہ ہندوستان کے باشندے خاص طور سے مسلمان انگریزی پڑھنا نہیں چاہتے اگر علوم غربیہ کو ہندوستان کے لئے ضروری خیال کیا جاتا ہے تو ان کا ترجمہ فارسی عربی اور سنسکرت زبانوں میں کرایا جائے تاکہ باشندوں کو سمجھنے اور حاصل کرنے میں آسانی ہو جو کمیٹی اس جھگڑے کے حل کے لئے قائم کی گئی تھی اس کے دس ممبر تھے جن میں سے نصف انگریزی زبان کے حق میں تھے اور نصف مشرقی زبان وادب کے۔ اس کمیٹی کا صدر لارڈ میکالے کو مقرر کیا گیا جس نے اپنی چرب زبانی اور پرزور تقاریر سے مشرقی علوم کے حامیوں کے تمام دلائل کو بالائے طاق رکھ کر مغربی علوم خاص طور سے انگریزی زبان کے حق میں ایسے ایسے دلائل پیش کئے کہ تمام ممبران کو خاموش ہونا پڑا اس نے کہا کہ ”1813ء کے چارٹر میں لفظ ادب استعمال کیا گیا ہے جس سے انگریزی ادب مراد ہے اور ہندوستان میں ایسے افراد بکثرت ہیں جو ملٹن، شیکسپیئر، کیٹس، جان لاک، ہابس اور روسو وغیرہ کے نظریات وافکار کو پسند کرتے ہیں۔ مشرقی علوم اور زبانیں فرسودہ ہو چکی ہیں ان میں چاشنی اور زندگی باقی نہیں ہے مزید یہ کہ مغربی علوم اور سائنس کا ترجمہ بھی ان زبانوں میں ناممکن ہے پھر مسلمان عربی، فارسی اور ہندو سنسکرت کے حامی ہیں اور جہاں تک مشرقی علوم کی اہمیت اور افادیت کا سوال ہے تو تمام مشرق کا ادبی سرمایہ مغرب کی ایک الماری کے ایک خانے سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ جہاں تک ہندوستانیوں کی پسند اور ناپسند کا سوال ہے تو یہ حکومت انگلستان کا فرض ہے کہ وہ ان کو ایسی ذہنی اور دماغی غذا بہم پہنچائے جس سے ان میں علمی بیداری پیدا ہو سکے اور وہ بدلتے ہوئے حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ جہاں تک مشرقی زبان میں کتب کا سوال ہے تو جتنی کتابیں انگریزی زبان میں شائع اور فروخت ہوتی ہیں مشرقی زبانوں میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں“۔

ان دلائل سے ممبران مجبور ہو گئے۔ اس کے علاوہ کچھ ہندوستانی جیسے راجہ رام موہن رائے، ایشور چندر، ویدا ساگر وغیرہ نے بھی اس کی ہم نوائی کی اور سب نے متفقہ طور سے یہ طے کر دیا کہ کمیٹی اپنا سرمایہ صرف انگریزی زبان اور علم وادب کی ترقی وترویج پر ہی صرف کرے گی اس طرح لارڈ ولیم بینٹنگ جو اس وقت گورنر جنرل تھا اس نے کمیٹی کی سفارشات پر دستخط کر کے ہندوستانیوں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، ان تجاویز میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

☆......حکومت انگلستان کا مقصد ہندوستان میں تعلیم وتعلم کی اشاعت وترویج ہے۔

☆......حکومت اپنا تمام سرمایہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف کرے گی۔

☆......مشرقی علوم کے مدارس میں تمام عملہ برقرار رہے گا موجودہ طلبہ کو وظائف بھی ملتے رہیں گے لیکن آئندہ داخل ہونے والے طلبہ کو وظیفہ نہیں ملے گا۔

☆......مشرقی علوم کے اداروں میں جو بھی آسامیاں خالی ہوں گی ان کو حکومت کی مرضی سے پُر کیا جائے گا۔

☆......مشرقی علوم کے تراجم پر بھی کمپنی کچھ خرچ نہیں کرے گی۔

یعنی مشرقی علوم کی حوصلہ شکنی کر کے مغربی علوم کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ یہ عربی اور فارسی کی جگہ انگریزی لانے کا پہلا قدم تھا۔ 1813ء سے 1853ء تک کمپنی نے ہندوستان کی تعلیم میں نت نئے تجربات کئے۔ 1854ء میں چارلس وڈ نے ایک جامع اور مکمل

رپورٹ تعلیمی اصلاحات کے لئے پیش کی جس کو پارلیمنٹ نے منظور کر لیا اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:۔

☆......تعلیم کو اس طرح رائج کیا جائے گا کہ اس سے ہندوستانیوں کی اخلاقی وذہنی نشوونما ہو سکے۔

☆......ان کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ کمپنی کی ملازمت حاصل کر سکیں۔

☆......ان میں ایسے جذبات پیدا کئے جائیں گے کہ وہ انگریزوں کے وفادار ہو جائیں۔

وڈ نے اپنے مراسلے میں اختلاف زبان پر بھی خیالات کا اظہار کیا۔ اس نے مشرقی علوم کی تدریس کو سراہتے ہوئے دیسی زبانوں کی ترقی وتوسیع کے لئے بھی تجاویز پیش کیں۔ اس نے لکھا کہ ہندوستان کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرے اور اس کے لئے اس کو مغربی علوم وزبان کا جاننا ضروری ہے۔ اس نے میکالے کے اس خیال کی موافقت کی کہ دیسی زبانوں میں اچھی کتب نہیں ملتیں اس لئے انگریزی زبان کا جاننا ضروری ہے اس لئے اعلیٰ تعلیم بذریعہ انگریزی دی جائے۔ البتہ ابتدائی تعلیم دیسی زبان میں ہونی چاہئے۔ انگریزی دیسی زبانوں کو اس طرح مشترک کیا جائے کہ ان کا امتیاز ختم ہو جائے جو علوم بذریعہ دیسی زبان سکھائے جا سکتے ہیں تو ان کو اسی زبان میں سکھایا جائے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ دیسی زبانیں بھی مالدار ہو جائیں گے۔ ہماری یہ خواہش ہرگز نہیں ہے کہ دیسی زبانوں کو ختم کر کے ان کی جگہ انگریزی کو مسلط کیا جائے یہی وجہ ہے کہ فارسی کی بجائے عدالتوں میں دیسی زبان کو رائج کیا ہے۔ دیسی زبانیں اہمیت اور افادیت کی حامل ہیں لیکن ہندوستان کی ترقی اسی میں ہے کہ وہ مغربی علوم اور انگریزی زبان کو سیکھیں۔ اس نے مشنری اور دیسی لوگوں کی تعلیمی کوششوں کو سراہا اور ان کی ہمت افزائی کے لئے نجی اداروں کو مالی امداد دینے کی سکیم منظور کی۔ تیس سال گزرنے پر بھی اس مراسلے کی بیشتر سفارشات پر عمل نہیں کیا جا سکتا تو 1882ء میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی سربراہی میں ہندوستان کے تعلیمی حالات کا جائزہ لینے کے لئے کمیشن مقرر کیا گیا جسے ہنٹر کمیشن کہتے ہیں۔ یہ کمیشن تھا جس میں ہندوستانی ممبروں کو بھی نمائندگی دی گئی تھی۔ سرسید احمد خان بھی اس کے ممبر تھے لیکن ہنٹر صاحب سے اتفاق رائے نہ ہونے کے باعث وہ مستعفی ہو گئے۔ اس کمیشن نے ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ ثانوی درجات کے علاوہ تعلیم نسواں اور مسلمانوں کی خصوصی دینی اور دنیاوی تعلیم ان کی اپنی زبان میں دینے کے لئے امداد کا اعلان بھی کیا تاکہ مسلمانوں کے تحفظات دور ہو سکیں۔

1917ء میں لیڈرز یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر مائیکل کی سربراہی میں یونیورسٹی ایجوکیشن کے جائزے اور اصلاحات کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جسے سیڈلر کمیشن کہتے ہیں۔ اس کمیشن میں کلکتہ یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ سر اسٹوش مکر جی اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین دو ہندوستانی ممبر بھی شریک تھے۔ اس کمیشن نے 1919ء میں اپنی سفارشات حکومت کو پیش کیں جن کے نتیجے میں یونیورسٹی ایجوکیشن میں بہتری آئی۔ 1929ء سر فلپ ہارٹگ کی سرکردگی میں تعلیمی مسائل پر غور وخوض کے لئے ایک مشاورتی کمیٹی قائم کی گئی جسے ہارٹگ کمیٹی کہتے ہیں اس نے پرائمری تعلیم جس پر اب تک سب سے کم خرچ ہونے کے باعث بُری حالت تھی خصوصی توجہ دی خصوصاً دیہات میں پرائمری تعلیم کے لئے کئی تجاویز پیش کیں۔ اس کے علاوہ ثانوی، اعلیٰ ثانوی اور تعلیم نسواں کے لئے بھی کئی اچھی تجاویز پیش کیں۔ دوسری جنگ عظیم میں کامیابی کے بعد حکومت انگلستان نے پاک وہند کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے لئے پاک وہند کے تعلیمی مشیر سر جان سارجنٹ کی سرکردگی میں ایک کمیٹی مقرر کی کہ وہ تعلیمی خامیوں پر رپورٹ پیش کرے یہ رپورٹ سارجنٹ پلان

1944ء کہلاتی ہے اس نے پاک و ہند کے مکمل نظام تعلیم کا جائزہ لے کر اس کو آٹھ مدارج میں مکمل کرنے کی سفارش کی۔ اس نے پری پرائمری تعلیم (3 تا 6 سال) بنیادی یا پرائمری تعلیم (6 تا 14 سال)، ہائی سکول (11 تا 17 سال) (اکیڈمک اور ٹیکنیکل) یونیورسٹی تعلیم (سینئر اور جونیئر گریڈ) تعلیم بالغاں اور تربیت اساتذہ کے لئے مفید اور قابل عمل تجاویز پیش کیں۔

بلاشبہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے لئے کئی سکیمیں پیش کیں مگر ان پر عمل کم ہی ہوا دوسرا یہ دراصل ہاتھی کے دانت تھے۔ اصل میں انگریز صرف اپنے حاشیہ نشین پیدا کرنا چاہتے تھے اور ان کی ہر سکیم کا اصل مقصد یہی تھا۔ وہ مذہبی طور پر مسلمانوں کے خلاف تھے اور 1857ء کی جنگ آزادی کی وجہ سے خائف بھی تھے اور انہیں فکری طور پر بالکل تباہ کرنا چاہتے تھے اور یہ اس وقت تک ناممکن تھا کہ جب تک ان کے تعلیمی ادارے قائم تھے کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ہر مدرسے کا اپنا وقف تھا جس کی آمدنی سے وہ ادارے چلتے تھے۔ صرف بنگال پریذیڈنسی میں جس کی حدود دہلی سے آسام کی سرحد تک تھیں، پورے علاقے کی زرخیز زمینوں کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ اوقاف پر مشتمل تھا۔ ہر وقف کا ایک ناظم ہوتا جو نہ صرف وقف کا انتظام کرتا بلکہ اس مدرسے اور مکتب کی بھی دیکھ بھال کرتا جو وقف کی آمدنی سے چلتے، ہر مدرسے اور مکتب میں متعدد اساتذہ ہوتے جنہیں اچھی تنخواہیں ملتیں۔ اس کے علاوہ ہر مدرسے میں طلبہ کے قیام، طعام اور تعلیم کا انتظام مفت ہوتا اس طرح مسلمانوں کی آبادی کا ایک بڑا طبقہ ان اوقاف کے سہارے آرام اور عزت کی زندگی بسر کرتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان مدرسوں اور مکتبوں پر ہی ہاتھ صاف کیا اس کے لئے 1818ء میں ریگولیشن I جاری کیا گیا جس میں اوقاف کی حکومت سے تصدیق ضروری قرار دے دی گئی لیکن اس سے انگریزوں کا مقصد حل نہ ہوا اس کے لئے 1828ء میں ریگولیشن II جاری ہوا بہت سے ضبطی کمشنر اور ضبطی ڈپٹی کلکٹر مقرر کئے گئے جو ذرا ذرا سی شکایت پر جھوٹے گواہوں کی مدد سے اوقاف ضبط کرتے رہے یہ کارروائی اٹھارہ سال جاری رہی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے تمام اوقاف ختم ہو گئے اور ان کے تحت چلنے والے مدرسے اور مکتب بھی رفتہ رفتہ بند ہو گئے اور اوقاف کی ضبط شدہ اکثر جائیدادیں انگریزوں نے اپنے وفاداروں اور مسلمانوں کے غداروں کو نواز دیں۔

مسلمانوں کے نظام تعلیم کو تباہ کر دینے کے بعد انگریزوں نے انہیں اپنے نوآبادیاتی نظام تعلیم کے ذریعے سے بھی تعلیم حاصل کرنے نہیں دی۔ انگریزی سکول کہنے کو تو غیر مذہبی تھے لیکن حقیقتاً ان میں اسلام اور ہندومت اور مذہبی قدروں کے خلاف پروپیگنڈہ ہوتا جس کی وجہ سے ان میں تعلیم پانے والے لڑکے اخلاق، شرم و حیا، ہمدردی اور محنت کے جذبے سے عاری ہو جاتے۔ مسلمان اس لئے اپنے بچے ان سکولوں میں بھیجنا پسند نہ کرتے تھے۔ اعلیٰ خاندان کے ہندو بھی اس معاملے میں مسلمانوں کے ہم خیال تھے۔ مولوی محسن کے وقف کی آمدنی سے برطانوی حکومت ہگلی کالج چلا رہی تھی جس پر وقف سے پچاس ہزار روپیہ سالانہ خرچ کیا جاتا تھا۔ یہ وقف مولوی محسن علی نے مسلمانوں بالخصوص اثناء عشریوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا تھا لیکن اس کا ایک پیسہ بھی کسی مسلمان کی تعلیم پر صرف نہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر وائز نے جو اس کالج کا پرنسپل تھا حکومت کو ایک تجویز لکھ کر روانہ کی کہ مسلمان طلبہ کو وقف کی آمدنی سے وظیفے دیئے جائیں تاکہ وہ بھی اس کالج سے فائدہ اٹھا سکیں۔ میکالے نے اس مشورے کو بھی رد کر دیا جس کے صاف معنی یہ تھے کہ برطانوی حکومت مسلمانوں کو کسی بھی قسم کی تعلیم دینا نہیں چاہتی تھی۔ صرف ہندوؤں کی تعلیم پر توجہ مرکوز کر دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان

سکولوں سے ہر اس چیز کا تعلق ختم ہو گیا یا قائم ہی نہ ہو سکا جو مسلمانوں سے وابستہ تھیں۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے کہ ان سکولوں کے تمام اساتذہ ہندو تھے اور ذریعہ تعلیم بھی ہندوؤں کی زبان (یعنی انگریزوں کی ایجاد کردہ موجودہ دیوناگری بنگالی) تھی۔ عربی فارسی اور اردو ان سکولوں میں نہیں پڑھائی جاتی تھی مسلمانوں کے کسی تہوار پر چھٹی نہیں ہوتی تھی اس کے برعکس ہندوؤں اور عیسائیوں کے تہواروں پر سکول بند رہتے اور کتابیں جو وہاں پڑھائی جاتی تھیں ان میں دین اسلام پر حملے ہوتے تھے۔

بمبئی میں حالات کلکتہ کے مقابلے میں مختلف تھے۔ وہاں مسلمانوں کو سکولوں میں عربی، فارسی اور اردو پڑھنے کی اجازت تھی اس لئے مسلمان وہاں حکام سے تعاون کر رہے تھے حالانکہ وہاں کے حکام بھی مرہٹی اور گجراتی بولیوں کو ترقی دینے میں مصروف تھے تاکہ اردو کی جگہ جو وہاں فارسی کے بعد دفتروں اور سکولوں میں استعمال ہوتی تھی ان زبانوں کو استعمال کیا جائے چنانچہ ابراہیم مقبہ نے مسلمان بچوں کے لئے 1834ء میں پہلا سکول قائم کیا اس سکول کے اچھے بچے بمبئی کے مرکزی انگریزی سکولوں میں لے لئے جاتے تھے اس کے باوجود معلوم نہیں کیوں یونیورسٹیاں قائم ہونے کے بعد جب امتحانات شروع ہوئے تو مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ 1866ء میں بمبئی یونیورسٹی کے مختلف امتحانات میں دو سو بیاسی طلبہ شریک ہوئے جس میں سے ایک سو گیارہ کامیاب ہوئے ان میں 90 ہندو 18 پارسی 1 یہودی اور صرف 2 مسلمان تھے۔

درہ امبیلا کی جنگ جو سید احمد شہید بریلوی کے مجاہدین اور انگریزی فوجوں کے درمیان ہوئی تھی اس نے 1868ء میں مجاہدین کے خلاف انبالہ کے مقدمہ اور 186…ء میں پٹنہ کے مقدمہ نے انگریزوں کو یہ احساس دلا کہ وہ ایک ایسے آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے

تبخیر معدہ کے مایوس مریض متوجہ ہوں
مفید ادویات کا خوش ذائقہ مرکب
ریمنال شربت
تبخیر معدہ اور اس سے پیدا شدہ عوارضات مثلاً دائمی قبض، گھبراہٹ، سینے کی جلن، نیند کا نہ آنا، کثرت ریاح، سانس کا پھولنا، تیزابیت معدہ، جگر کی خرابی اور معدہ کی گیس سے پیدا ہونے والے امراض کے لیے مفید ہے۔
اپنے قریبی دوا فروش سے طلب فرمائیں
نوٹ
تبخیر معدہ و دیگر امراض کے طبی مشورے کے لئے
ممتاز
ممتاز مطب
سے رابطہ فرمائیں
ممتاز دواخانہ (رجسٹرڈ) میانوالی
فون: 233817-234816

ہوئے ہیں جو کسی وقت بھی پھٹ کر انہیں بھسم کر سکتا ہے اب انہیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایسے منصوبے تیار کئے جائیں کہ انگریزوں کے الفاظ ہیں ''مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو تیار کرے جنہیں تنگ نظری کی تعلیم نہ ملی ہو، جو مسلمانوں کے زمانہ وسطیٰ کے تکلیف دہ قانون میں ماہر نہ ہوں بلکہ انہیں یورپ کی سنجیدہ اور خوشگوار تعلیم ملی ہو۔

مسلمانوں کو ان کی اپنی بگڑتی ہوئی اقتصادی اور تعلیمی حالت نے تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا اور وہ اس فکر میں تھے کہ ان حالات سے نکلنے کی کیا تدبیر کی جائے۔ اس زمانے میں دلی مسلمانوں کا عقلی اور تعلیمی مرکز تھا دہیں کے علماء اس میں پیش پیش تھے۔ دلی کے مشہور ماہر تعلیم اور بزرگ شاہ ولی اللہ کا انتقال 1762ء میں ہوا تھا لیکن ان کی اولاد اور ان کا مدرسہ ایک عرصہ تک مسلمانوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ ان میں تین طرح کے خیالات کے لوگ پائے جاتے تھے۔ کچھ جہاد کے حامی تھے ان کا خیال تھا کہ جہاد کے ذریعے سے انگریزوں کو برصغیر سے نکال کر حالات درست کئے جائیں ان کے سرخیل سید احمد بریلوی تھے انہوں نے شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز سے تعلیم حاصل کی تھی اور ان کے ساتھیوں میں شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ محمد اسمٰعیل شہید تھے۔ دوسرا گروہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے پرانے طرز تعلیم کو دوبارہ زندہ کر کے اس کے ذریعے سے مسلمانوں میں دوبارہ قرونِ اولیٰ کی روح پھونکی جائے ان کے راہنما مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔ انہوں نے شاہ عبدالعزیز کے شاگرد مولانا مملوک علی سے اور شاہ عبدالعزیز کے پوتے مولانا محمد اسحاق سے تعلق حاصل کی تھی۔ مولانا نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی جو بعد میں ہندوستان کی جامعہ ازہر قرار پایا۔ تیسرا گروپ چاہتا تھا کہ مسلمان انگریزوں کے قائم کئے ہوئے نو آبادیاتی نظام تعلیم سے ہر ممکن فائدہ اٹھا کر برادران وطن سے مقابلہ کر کے اپنے حالات درست کریں ان کے سرکردہ دلی کے سر سید احمد خان تھے یہ بھی مولانا مملوک علی اور مولانا شاہ محمد اسحاق کے شاگرد تھے۔ سید احمد نے اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کی بنیاد رکھی جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا اس طرح برٹش تعلیمی پالیسی کے منفی اثرات کی بناء پر مسلمانوں میں قومی نظریہ تعلیم کا ظہور ہوا۔ اس دور میں قومی تعلیم کے اداروں میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات میں چار رجحان زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

1- پہلا رجحان برطانوی نظام تعلیم سے مکمل عدم تعاون اور مسلمانوں کے تعلیمی نظام کے تحفظ کی کوشش ہے اس کا نمائندہ ہے دارالعلوم دیوبند۔

2- دوسرا رجحان انگریزی تعلیم کو بحیثیت نظام کے تقریباً پورے طور پر قبول کر لینا اور جزوی ترمیمات کے ساتھ اسے مسلمانوں میں فروغ دینا ہے اس کا نمائندہ علی گڑھ کالج ہے۔

3- تیسرا رجحان دیوبند اور علی گڑھ دونوں سے عدم اطمینان ہے اور اس کی نمائندگی ندوۃ العلماء لکھنؤ کرتا ہے۔

4- چوتھا رجحان پہلی جنگ عظیم کے بعد رُونما ہوا یہ ان تینوں تحریکات کو قومی ضروریات کے لئے ناکافی سمجھتے ہوئے تعلیم کو قومی رنگ دینا چاہتا تھا اس کا نمائندہ جامعہ اسلامیہ دہلی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد 30 مئی 1867ء میں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دیوبند ضلع سہارنپور (بھارت) میں رکھی۔ 9 سال تک مدرسہ بالکل ابتدائی حالت میں رہا۔ 1876ء میں نئی تعمیرات کے بعد آہستہ آہستہ ایک بڑے دارالعلوم اور علمی مرکز میں تبدیل ہو گیا۔ اس کا مقصد دینی تعلیم کے مرکز کا قیام تھا یہاں درس نظامیہ کو تعلیم کی بنیاد بنایا گیا اور طب، خطاطی، جلد سازی،

کپڑا بننا اور سینا وغیرہ کو بھی شامل کیا گیا تاکہ آئندہ مسلمانوں کی معاشی ضروریات پوری ہو سکیں لیکن تعلیم کا یہ پہلو ترقی نہ پا سکا اور تعلیم صرف درس نظامی تک محدود رہی یہ ادارہ حکومت وقت سے مکمل طور پر لاتعلق رہا اور انحصار عوام کے چندے پر تھا۔ اس کا مزاج سیدھا سادہ رہا جلد ہی اس اصول پر دیگر مدارس بھی قائم ہونے لگے۔ ان میں مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ فیض عام کانپور، مدرسہ اشرفیہ مراد آباد قابل ذکر ہیں۔ دیوبند کی اہم خصوصیت اس کا نظام مشاورت تھا جبکہ اس سے قبل کے مدارس کا انتظام شوریٰ کی بجائے کوئی خاندان چلاتا تھا جیسے شاہ ولی اللہ کا خاندان۔ دیوبند اصلاحی تحریک کا مرکز بھی رہا حضرت شاہ اسمٰعیل شہید نے غلط رسومات و بدعات کے خلاف جو جدوجہد شروع کی تھی دیوبند نے اسے جاری رکھا۔ دینی امور کی راہنمائی کے لئے دارالفتاویٰ قائم کیا یہاں کے فضلاء میں سے مولانا محمود حسن نے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا۔ مولانا عبدالحق دہلوی نے تفسیر حقانی لکھی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا ثناء اللہ اور شبیر احمد عثمانی نے علمی اور دینی علوم کی بے پناہ خدمت متعدد تصانیف و تالیفات اور تراجم و تفاسیر قرآن مجید سے کی۔ دیوبند انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز بھی رہا یہاں کے فارغ التحصیل طلباء اور اساتذہ نے آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن دیوبندی اکثریت نے متحدہ قومی تصور کے تحت کانگریس کا ساتھ دیا۔ البتہ مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا مفتی محمد شفیع نے دو قومی نظریے کے تحت قائداعظم کا ساتھ دیا۔ دیوبند کا نصاب نئے دور کی ضروریات کو پورا نہ کر سکا لیکن برصغیر کے دینی مدارس آج بھی اسی اصول پر چل رہے ہیں۔

دیوبندی تحریک انگریزی تعلیم کے ساتھ مکمل عدم تعاون کے رجحان کی نمائندہ ہے اس کے بالمقابل سر سید کی علی گڑھ کی تعلیمی تحریک مصالحت و مفاہمت کی مظہر ہے۔ جنگِ آزادی کے بعد سر سید اور ان کے رفقاء اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان خود کو انگریزوں سے لڑ کر نہیں بلکہ مل کر بچا سکتے ہیں اور دو دشمنوں یعنی ہندو اور انگریز سے بیک وقت لڑنا ممکن نہیں اس لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ انگریزوں سے وفاداری کا تعلق قائم کریں انگریزی تعلیم حاصل کر کے ملازمتیں حاصل کریں۔ نئے حالات میں وہ اپنے آپ کو بدلے بغیر نہیں چل سکتے۔ اس تحریک کے تحت سکول قائم کیا گیا جو بعد میں کالج اور پھر یونیورسٹی بنا جلد ہی یہ ادارہ مسلمانوں کا عظیم تعلیمی اور سیاسی مرکز بن گیا جس نے قومی ترقی اور اتحاد کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ اس ادارے میں مغربی تعلیم کو من وعن لے کر دینیات کا اضافہ کیا گیا اور ہاسٹل میں نماز روزے کا ماحول رکھا گیا فیس بھی رکھی گئی۔ شروع میں انگریز پرنسپل اور اساتذہ رکھے گئے جس سے مغربی کلچر طلبہ میں تیزی سے سرایت کرتا گیا بعد میں اس طرز پر اور بھی ادارے قائم ہوئے۔ سر سید نے علی گڑھ کے ذریعے مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کی ان کو متحد کیا مرکز مہیا کیا ہندوستان میں پہلی بار اسلامی قومیت اور دو قومی نظریے کا نعرہ بلند کیا جو بالآخر قیام پاکستان کا سبب بنا۔ مسلمانوں کے لئے روزگار کے دروازے دوبارہ کھل گئے، نئی ادبی تحریک کی بنیاد رکھی جس کے تحت آسان، عام فہم اور شگفتہ اسلوب رائج ہوا۔ 50 سال تک قیادت علی گڑھ نے مہیا کی لیکن علی گڑھ سے تعلیم تجارت بن گئی اور تعلیم کا مقصد علم نہیں ملازمت کا حصول بن گیا۔ مذہب کی شمولیت کے باوجود یہاں کے طالب علموں کا مزاج مغربی رنگ میں رنگ گیا۔ یوں دیوبند اور علی گڑھ دو انتہائیں بن گئے۔

جدید اور قدیم کی اس کشمکش نے بہت سے ذہنوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ نئے دور میں دیوبند اور علی گڑھ میں سے کوئی بھی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی نہیں اور وقت کی بہت بڑی ضرورت جدید اور قدیم کا

احتزاج ہے اور اس کوشش کا نام ندوہ ہے۔ اپریل 1892ء میں مدرسہ فیض عام کان پور میں علماء کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں تعلیمی مسائل کا جائزہ لے کر یہ طے کیا گیا کہ مسلمانوں کی بہت بڑی ضرورت پرانے نظام تعلیم کی اصلاح ہے۔ شروع میں کوشش کی گئی کہ تمام اسلامی مدارس ایک نئے نصاب پر متفق ہو جائیں لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو نئی اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے 1894ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم کیا گیا۔ اس کے بانیوں میں شبلی نعمانی، مولوی محمد علی اور مولانا عبدالحق دہلوی وغیرہ شامل تھے۔ ندوہ کی اہم خصوصیت درس نظامیہ کی اصلاح ہے نئے نصاب میں قدیم مدارس کے برعکس تفسیر وحدیث کو زیادہ اہمیت دی گئی اور صرف ونحو اور فلسفہ وکلام کو کم۔ جدید اور انگریزی زبان کو بھی شامل نصاب کیا گیا علماء کے باہمی نزاع اور اختلافی مسائل سے احتراز کی روش اختیار کی اور اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تعلیم کے ساتھ تحقیق کی روایت ڈالی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ نے جو عظیم خدمت اسلامی علوم کی کی ہے وہ ندوۃ العلماء کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی۔ ندوہ نے سید سلیمان ندوی جیسے چوٹی کے علماء پیدا کئے۔ ندوہ کو دیوبند اور علی گڑھ جیسی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ ندوہ کے طلبہ جدید علوم سے استفادہ نہ کر سکے، دینی مزاج غالب رہا ندوہ کا اشتراک عمل بھی جدید وقدیم اداروں کے ساتھ نہ ہو سکا البتہ اس ادارے نے کئی علمی شخصیات پیدا کیں جن کی اسلامی خدمات مسلمہ ہیں۔

پرانی تعلیم کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ندوہ ہے تو نئی تعلیم میں پرانی تعلیم کی کچھ خصوصیات زندہ کرنے کی سعی جامعہ ملیہ ہے۔ خلافت اور انگریزوں سے عدم تعاون کی تحریکوں (1926ء-191ء) نے قومی تعلیم کی تحریک کو جنم دیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کو سرکاری گرانٹ اور سرکاری تعلقات سے آزاد کرانے کی کوشش شروع ہوئی۔ مولانا محمد علی، علی گڑھ گئے بہت سے طلبہ ان کے ہم خیال تھے لیکن کالج انتظامیہ نے گورنمنٹ سے قطع تعلق کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا محمد علی علی گڑھ کالج کو تو آزاد بنانے میں کامیاب نہ ہوئے لیکن جو طلبہ ان کی حمایت میں کالج سے الگ ہوئے تھے انہیں لے کر انہوں نے 1920ء میں علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کیا جو 1925ء میں دہلی منتقل ہو گیا۔ جہاں حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری کی مدد سے جامعہ نے خوب ترقی کی۔ جامعہ نے لادینی تعلیم کو غلط قرار دیتے ہوئے اس میں محض دینیات کے اضافے کو بھی ناکافی سمجھا۔ اس کے بانیوں نے یہ تصور پیش کیا کہ تعلیم کو جدید علوم اور دینی علوم کا جامع ہونا چاہئے اور طالب علم کو بیک وقت دونوں میں مہارت ہونی چاہئے۔ دین کی معقول تعلیم کا ہر مرحلے پر انتظام کیا گیا۔ قرآن پاک اور سیرت نبوی کو جزو نصاب بنایا گیا۔ عربی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ اردو کو انگریزی کی جگہ ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔ اسلامی علوم میں اختصاص کی گنجائش رکھی گئی۔ مصارف تعلیم نہایت کم رکھے گئے۔ صنعت وحرفت کی تعلیم بھی نصاب کا حصہ تھی تاکہ تعلیم کا مقصد ملازمت نہ بنے۔ جامع کی اردو اکیڈمی نے بہت سی قابل قدر کتابیں شائع کیں تعلیمی ریسرچ میں جامعہ کے اساتذہ نے بڑا کام کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، مولانا محمد اسلم جراج پوری کی تصانیف علمی دنیا میں اپنا مقام رکھتی ہیں۔ جامعہ کا تجربہ مختلف حیثیتوں سے کامیاب رہا لیکن یہ مسلمانوں کی قومی زندگی پر اپنے اثرات مرتب نہ کر سکا اور ان تحریکات کے نتیجے میں مسلم قوم علمی اور نظریاتی طور پر تقسیم ہو گئی۔

(استفادہ ''تعلیم کی بنیادیں'' ایس ایم شاہد)

***

من کی پیاس

جب بھی گناہ کی طرف مائل ہونے لگو تو ہمیشہ یاد رکھنا۔ اللہ دیکھ رہا ہے، فرشتے لکھ رہے ہیں اور موت ہر حال میں آنی ہے۔

☆ دستگیر شہزاد

0300-9667909

فیصل آباد سے 82 کلومیٹر دور ہائی وے روڈ پر ٹوبہ ٹیک سنگھ شہر آباد ہے۔ عالیہ اس شہر کی رہنے والی تھی۔ بچپن سے ہی عالیہ مزاجاً باغیانہ ذہنیت کی تھی، اس لئے جوانی میں قدم رکھتے ہی منہ زور جذبات کے دھارے میں بہنے لگی۔ جوانی اس کے لئے حفاظت کرنے کی چیز نہیں بلکہ نمائش کرنے بن گئی۔ پیسہ اس کے لئے اڑانے کی چیز تھی اور جوانی عیاشی کرنے کا خوبصورت موقع۔ عالیہ کی اس روش سے اس کے گھر والے بھی پریشان تھے کہ لڑکی بدنام نہ ہو جائے اس لئے انہوں نے عالیہ کو لگام دینے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ملی۔

زندگی کے ہاتھ نہیں ہوتے لیکن بعض اوقات ایسا تھپڑ مار جاتی ہے کہ ساری عمر یاد رہتا ہے۔

اسی درمیان عالیہ کی ملاقات ارحم سے ہوئی۔ آنکھوں آنکھوں میں پیار ہوا اور پہلی نظر میں ہی وہ ایک دوسرے کے ہو گئے۔ بے تکلفی کا تعلق قائم ہوتے بھی دیر نہیں لگتی۔ ارحم سے دوستی کے باوجود عالیہ کے من کی پیاس نہ بجھ سکی۔ اس کا قول تھا کہ جب تک من کی پیاس نہ بجھے پیار ادھورا رہتا ہے۔ اس لئے پیار کے ادھورے پن کو دور کرنے کے لئے من کی پیاس بجھانا ضروری ہے اور یہ تبھی ممکن تھا جب ارحم سے شادی کر لی جائے۔

لیکن عالیہ کے گھر والے اس رشتے کے حق میں نہیں تھے۔ انہوں نے عالیہ کو ارحم کو بھول جانے کے لئے سمجھایا بھی مگر وہ محبت یا عشق کے اس مقام تک پہنچ چکی تھی جہاں اس کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود عالیہ نے ارحم سے شادی کر لی۔ گھر والوں نے عالیہ سے ناطہ توڑ لیا۔ عالیہ نے اس کی کوئی پروا نہیں کی لیکن ارحم سے شادی کے بعد بھی عالیہ کے من کی پیاس برقرار رہی۔ ایک کسک

تھی جو اس کے دل کو بے چین کئے رہتی تھی۔ سب کچھ اسے نامکمل سا لگتا تھا۔ عالیہ جسمانی تسکین کے علاوہ بھی اور کچھ پانا چاہتی تھی مگر کیا...... یہ خود اسے علم نہیں تھا۔

کچھ ہی ہفتوں میں عالیہ کو لگنے لگا کہ ارحم کے ساتھ شادی کر کے بھی وہ اپنے اندر عجیب سی تشنگی محسوس کرتی ہے اور اس کی یہ تشنگی دور کرنا ارحم کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے اس نے آپسی رضامندی سے ارحم سے طلاق لے لی اور اپنے میکے چلی آئی۔ میکے میں اسے پناہ تو مل گئی مگر دل سے کسی نے اسے نہیں اپنایا۔ جب اسے میکے میں اپنائیت نہیں ملی تو اس نے اپنی غلطی سدھارنے کے لئے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

عالیہ کے چاہنے والوں کی کمی نہیں تھی مگر ان کی چاہت عالیہ سے دوستی تک ہی محدود تھی۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ خود بھی موج کرو اور ہمیں بھی کرنے دو۔ شادی کی بات سنتے ہی سب بھاگ جاتے تھے۔

پھر ایک پروگرام میں اس کی ملاقات اوج کمال سے ہوئی۔ اوج کمال پیشے سے کیٹرر تھا۔ پروگرام میں ناشتے اور کھانے کا انتظام یا ٹھیکہ اسی کے پاس تھا۔ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اپنے باپ الطاف بھائی، ماں نائلہ اور چھوٹے بھائی صداقت کے ساتھ رہتا تھا۔ عالیہ کے حسن و شباب پر اوج کمال بُری طرح فدا ہو گیا۔ عالیہ کے اشارہ کرنے کی دیر تھی اوج کمال اس سے شادی کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔ عالیہ نے اسے یہ صاف طور پر بتا دیا تھا کہ وہ طلاق یافتہ ہے۔ اوج کمال پر عالیہ کے حُسن و شباب کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ اس لئے گھر جا کر اس نے عالیہ کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ سنایا تو الطاف بھائی اور نائلہ ہتھے سے اکھڑ گئے کہ ہم طلاق شدہ لڑکی سے تیری شادی نہیں کر سکتے۔

انسان کو اپنی اوقات اس وقت پتہ چلتی ہے، جب اسے وہاں سے ٹھوکر پڑے جہاں اس نے سب سے زیادہ بھروسہ کیا ہوتا ہے۔

کئی دنوں تک اسی مسئلے پر تنازع چلتا رہا۔ دن میں تین چار بار عالیہ کی اوج کمال سے بات ہوتی تھی فیصل آباد اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں صرف بیاسی کلومیٹر کا ہی تو فاصلہ تھا۔ کبھی عالیہ فیصل آباد جاتی تو کبھی اوج کمال ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچ جاتا۔ آخر ایک دن وہی ہوا جو عالیہ چاہتی تھی۔ دونوں نے ایک مسجد میں نکاح کر لیا۔ اوج کمال عالیہ کو گھر لے گیا جسے ناگواری سے قبول کر لیا گیا اور عالیہ اپنے سسرال میں رہنے لگی۔ سسرال میں رہتے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ عالیہ کو پھر نامعلوم سی تشنگی نے گھیر لیا۔ اس کے بعد اسے لگنے لگا کہ یہاں رہ کر اس کے من کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ اس لئے وہ اوج کمال سے الگ رہنے کے لئے دباؤ ڈالنے لگی۔ اوج کمال نے ماں باپ کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کیا تو عالیہ نے گھر میں فساد شروع کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ اپنی ساس سے جھگڑنے لگی اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے سسرال کو جہنم بنا دیا۔ تب الطاف بھائی نے خود ہی دونوں کو الگ کر دیا۔

دونوں نئے گھر میں آ کر رہنے لگے۔ وقت کے ساتھ وہ اوج کمال کی تین بیٹیوں کی ماں بن گئی لیکن تین بیٹیوں کی ماں بن جانے کے باوجود عالیہ کے من کی پیاس ایک بار پھر سر اٹھانے لگی اور اس کا سبب تھا عدیل۔

گوجرہ میں رہنے والا عدیل، چوہدری یونس الٰہی کا بیٹا تھا۔ جسم سے مضبوط اور کنوارا۔ عدیل کا شروع سے اوج کمال کے گھر آنا جانا تھا۔ اوج کمال عالیہ کو لے کر الگ رہنے لگا تو وہ بھائی بھاوج اور بھتیجیوں کی محبت میں عالیہ کے نئے گھر میں آنے لگا۔ عمر میں عدیل عالیہ سے چھوٹا تھا۔ اس کے باوجود ایک

دن وہ عالیہ کی نظروں میں چڑھ گیا اور وہ اسے دام میں قابو کرنے کا منصوبہ بنانے لگی۔

عالیہ نے اپنی قاتل اداؤں کے جلوے دکھانا شروع کئے تو عدیل کب تک پانی نہ مانگتا۔ وہ عالیہ پر ریجھ گیا۔ پھر عالیہ نے ہی ایک دن حالات ایسے پیدا کئے کہ عدیل کو اپنی چاہت کا ثبوت دینے کے لئے عالیہ نے اُسے رات کے اندھیرے میں بلا لیا۔ عالیہ جانتی تھی کہ عدیل آئے گا اس لئے اس دن اس نے خود کو دلہن کی طرح سجا سنوار لیا۔ رات ہوئی تو تینوں بیٹیاں نیند کی آغوش میں سما گئیں۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد عدیل آ گیا۔ اس کے آتے ہی عالیہ نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اسے دوسرے کمرے میں لے گئی اور عدیل اس کے اشاروں پر ناچنے لگا۔

جب بھی گناہ کی طرف مائل ہونے لگو تو ہمیشہ یاد رکھنا۔ اللہ دیکھ رہا ہے، فرشتے لکھ رہے ہیں اور موت ہر حال میں آنی ہے۔

اس رات کے بعد تن ہی نہیں من سے بھی وہ ایک دوسرے کے ہو گئے۔ اوج کمال تو اپنے کام کے سلسلے میں زیادہ تر فیصل آباد سے باہر رہتا تھا۔ وہ بڑے بڑے آرڈر لیتا تھا اس لئے اسے باہر بھی کئی دن تک رہنا پڑتا تھا۔ عالیہ اور عدیل کے لئے یہ خوشی کی بات تھی۔ رات ہوتے ہی عدیل آ جاتا، سج سنور کر عالیہ اس کا انتظار کرتی۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے توں توں دونوں کی یگانگت بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دوسرے کے بغیر رہنا مشکل لگنے لگا تھا۔ اس لئے وہ جلد سے جلد شادی کر کے ہمیشہ کے لئے ایک ہو جانا چاہتے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ ایک شوہر کے ہوتے ہوئے عالیہ دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی عالیہ اوج کمال کو چھوڑنے سے قبل اسے اچھی طرح دھو لینا چاہتی تھی۔

اپنے اسی منصوبے کے تحت اس نے اوج کمال پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ اپنا مکان بیچ دے اور اس کے عوض جو لاکھوں کی رقم ملے اسے تینوں بیٹیوں کے نام بینک میں جمع کر دے۔

عالیہ کے اس بے تکے مطالبے سے اوج کمال کا ماتھا ٹھنکا، وہ جانتا تھا کہ عالیہ اوائل جوانی سے بدکردار عورت تھی۔ عالیہ سے شادی کرنے پر اسے افسوس بھی تھا۔ چونکہ وہ اب اس کی تین بیٹیوں کی ماں بن گئی تھی اس لئے دل پر پتھر رکھ کر اس کا ساتھ نبھاہ رہا تھا۔

> جب کسی نے آپ کو چھوڑنا ہوگا تو سب سے پہلے اس کے بولنے کا انداز بدل جائے گا۔

جب عالیہ نے مکان فروخت کرنے کی ضد کی تو اوج کمال نے راز جاننے کے لئے عالیہ کی جاسوسی کی تو بہت جلد اسے معلوم ہو گیا کہ عالیہ نے عدیل پر ہی اپنی نیت خراب کر رکھی ہے۔ کوئی بھی مرد یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی بیوی پرائے مرد سے تعلق رکھے۔ اوج کمال بھی برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے عدیل کو تو بے عزت کر کے گھر سے بھگا دیا اور عالیہ کی خاصی پٹائی کر ڈالی۔ اس کے کچھ دن بعد ہی 19 مارچ 2014ء کی صبح جناح کالونی میں واقع اوج کمال کے مکان کے باہر کھڑے رہنے والے اس کے آٹو میں کسی کی لاش پائی گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں تھانہ سول لائن سے ایس آئی ندیم چوہدری موقع پر پہنچ گئے۔ رضائی ہٹائی گئی تو معلوم ہوا اس کے اندر واقعی لاش تھی۔ موقع پر ہی لاش کی شناخت ہو گئی۔ وہ اوج کمال کی لاش تھی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اوج کمال کی لاش اس کے گھر کے سامنے آٹو میں پائی گئی تھی۔ مکان کے سامنے بھاری بھیڑ جمع تھی۔ شور ہو رہا تھا کہ اوج کمال کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس کے باوجود اوج کمال کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ تفتیش سے چوہدری کو معلوم ہو گیا تھا کہ مکان میں اوج کمال کی بیوی عالیہ اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی، ان لوگوں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکنے تک کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

> سب کچھ کرو، گالی دے دو، بُرا بھلا کہہ دو، تھپڑ مار لو مگر یاد رکھو! دوراہے پر لا کر کسی کا ساتھ مت چھوڑو، بندہ بے بس ہو جاتا ہے۔

ایس آئی ندیم چوہدری نے خود جا کر مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو کچھ ہی دیر میں عالیہ نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے اپنا حلیہ ایسا بنا رکھا تھا جیسے سو کر آئی ہو۔

چوہدری نے اُس سے سوال کیا۔

''اوج کمال کہاں ہے؟''

''ہوگا کہیں، وہ تو رات گیارہ بجے مجھ سے لڑ جھگڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ تب سے واپس نہیں لوٹا''۔ عالیہ نے لاپروائی سے کہا۔ ''میں تو نیند کی گولیاں کھا کر سو رہی تھی''۔

چوہدری ندیم اُسے باہر لائے اور جا کر آٹو میں پڑی اوج کمال کی لاش دکھائی۔ لاش دیکھتے ہی عالیہ رونے پیٹنے لگی۔ چوہدری نے اعلیٰ پولیس افسران کو اس واقعے کی اطلاع دی اور کرائم برانچ کے لوگوں اور ڈے گشت کو موقع پر طلب کر لیا۔ لاش کی حالت سے ظاہر تھا کہ قتل کہیں اور کیا گیا تھا۔ اس کے بعد لاش کو آٹو میں ڈال کر اُسے رضائی اڑھا دی گئی تھی۔ عالیہ نے یہ تو مان لیا کہ رضائی اس کے گھر کی تھی مگر باہر کیسے پہنچی اس بارے میں وہ کچھ نہیں بتا سکی۔

پولیس نے جاسوس کتے کو چھوڑا۔ پہلے تو کتا آٹو کے چکر کاٹتا رہا پھر بھونکتا ہوا مقتول کے گھر میں داخل ہو گیا۔ وہاں پرانے صوفے اور دیوار پر سونگھتا اور

زور زور سے بھونکنے لگا۔ شک پیدا کرنے والی بات یہ تھی کہ سنگل سیٹ والے صوفے پر تو کور چڑھے ہوئے تھے مگر بڑے والے صوفے پر کور نہیں تھا۔ اس کا کور دھو کر سوکھنے کے لئے ڈالا گیا تھا۔ زمین اور دیواروں کی حالت سے بھی ظاہر تھا کہ انہیں دھو پونچھ کر صاف کیا گیا تھا۔ پولیس کو یقین ہو گیا کہ اوج کمال کا قتل صوفے پر کیا گیا تھا اور پھر لاش کو باہر لا کر آٹو میں ڈال دیا تھا۔ مقتول کا سر کچلا ہوا تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ خون کے چھینٹے پڑے ہوں گے جن سے صوفے کا کور، فرش اور دیوار پر داغ لگے ہوں گے۔ اسی خون کو صاف کرنے کے لئے صوفہ کور سے دیواروں اور فرش کو صاف کیا گیا تھا اور یہ سب عالیہ کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

> دنیا عورت کے ماضی کو کبھی نہیں بھولتی، دنیا صرف مرد کے ماضی کو بھولتی ہے۔

عالیہ اخلاقی لحاظ سے خراب عورت تھی لیکن اپنے شوہر کو راستے سے ہٹانے کے لئے اس نے بڑا بھونڈا طریقہ استعمال کیا تھا۔ یقیناً یہ کام اس نے اپنے کسی آشنا سے مل کر کیا ہوگا۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجنے کے بعد عالیہ کو تھانے لے جا کر پوچھ گچھ کی گئی تو سارا راز کھل گیا۔

ہوا یہ کہ عالیہ عدیل سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے اوج کمال کی ساری دولت پر قبضہ کر کے اپنی حیثیت مضبوط کر لینا چاہتی تھی۔ اوج کمال دولت، مکان کیا ایک کیل بھی فروخت کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس لئے میاں بیوی میں آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اوج کمال عالیہ کی چالاکی سمجھ گیا تھا کہ وہ اس کی دولت کے زور پر عدیل کے ساتھ عیش کرنا چاہتی ہے۔ اس لئے اس نے خود ہی عالیہ کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اوج کمال عالیہ کو طلاق دیتا تو عالیہ کے ہاتھ پھوٹی کوڑی بھی نہیں آتی اس لئے اس نے عدیل کے ساتھ اوج کمال کے قتل کی سازش تیار کر لی۔ عدیل نے پچاس پچاس ہزار روپے کا لالچ دے کر اپنے دوست قیوم بندوقا اور زاہد چھرا کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

18 مارچ 2014ء کو اوج کمال سمندری کا کوئی آرڈر پورا کر کے فیصل آباد لوٹا تھا۔ اس کے آتے ہی عالیہ مکان بیچنے اور اس سے ہونے والے فائدے کا مسئلہ لے کر بیٹھ گئی۔ بس اوج کمال کا دماغ خراب ہو گیا۔ دونوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ لڑنے جھگڑنے کے بعد اوج کمال باہر گیا اور موڈ ٹھیک کرنے کے لئے ہوٹل سے شراب پی کر لوٹا اور آتے ہی صوفے پر لڑھک گیا۔ قتل کا منصوبہ پہلے ہی تیار تھا۔ اس لئے عالیہ نے عدیل کو فون کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں عدیل قیوم بندوقا اور زاہد چھرا کو ساتھ لے کر آ گیا۔ قیوم بندوقا اور زاہد چھرا نے اوج کمال کے ہاتھ پاؤں پکڑے اور عدیل نے چھاتی پر چڑھ کر اس کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کے بعد اپنے اطمینان کے لئے ہتھوڑی سے اوج کمال کا سر بھی کچل دیا۔ اسی خون سے صوفے کا کور بھر گیا تھا۔ جسے بعد میں عالیہ نے دھو پونچھ کر صاف کر دیا تھا۔ اس کے بعد ان تینوں نے یہ بے وقوفی کی کہ لاش کو کہیں دور ٹھکانے لگانے کی بجائے گھر کے سامنے کھڑے اوج کمال کے آٹو میں ڈال کر رضائی سے ڈھانک دیا تھا۔ عالیہ کے بیان کی بنیاد پر پولیس نے قیوم بندوقا اور زاہد چھرا کو بھی گرفتار کر لیا۔ تادم تحریر چاروں ملزم جیل میں تھے۔

> جس انسان میں وفاداری ہو اس کے ساتھ دوستی کرنے کا مطلب خود کو ذلیل کرنا ہے۔

◆★◆

علم و تحقیق

ہمارے افسانہ ساز مؤرخین

ایک خاص موضوع پر گراں قدر اور سدا بہار کالم ایک مشہور کالم نگار کے قلم سے

مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے تمام من گھڑت قصے جن سے اختلاف کی بو آتی ہو، مسلمانوں کے کردار کی خرابی نظر آئے سب طبری اور اسی قبیل کے مؤرخین کی ایجاد ہیں اور اس امت کے سارے جھگڑے تاریخ سے جنم لیتے ہیں اور انہیں ہوا دینے میں ان تمام مستشرقین کا دخل ہے جو ہمارے خیر خواہ بن کر ہم پر کتابیں لکھتے رہے اور ہمارے تابناک ماضی کو زہر آلود کرتے رہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس امت کی پانچ فقہوں میں دین کے نافذ العمل اصولوں میں ذرا بھی اختلاف نہیں۔

☆ اوریا مقبول جان

ایران کے دارالحکومت تہران کے ایک جانب بلند و بالا پہاڑ البرز کے اس پار ایک انتہائی خوبصورت خطہ ہے جسے مازندران کہتے ہیں۔ ماضی میں اسے طبرستان کہتے تھے۔ یہ خطہ انتہائی سرسبز ہے اور البرز پہاڑ سے کیسپین سمندر تک پھیلا ہوا ہے۔ کیسپین جسے ایرانی دریائے اور کہتے ہیں۔ وسطی ایشیا کے کئی ممالک کے درمیان ایک بہت بڑا جھیل نما سمندر ہے یہاں سے بخارات اٹھتے ہیں، بادل بنتے ہیں البرز کی بلندیوں سے ٹکراتے ہیں اور مازندران کے علاقے کو سرسبز و شاداب بناتے ہیں۔ کیسپین سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ ہر ملک نے ایک خوبصورت سڑک تعمیر کی ہے جس پر ہر چند کلومیٹر کے فاصلے پر سیر و تفریح کے لئے خوبصورت آبادیاں موجود ہیں۔

ایسی ہی ایک خوبصورت آبادی ''امول'' میں گیارہ سو سال قبل (838 عیسوی) میں مسلمانوں کی تاریخ مرتب کرنے والا ایک فرد پیدا ہوا۔ والدین نے اس کا نام محمد رکھا، اس کے والد کا نام جریر اور دادا کا نام یزید تھا (ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید) لیکن دنیا اسے اپنے علاقے طبرستان کے حوالے سے الطبری کے طور پر جانتی ہے۔ اس نے سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا اور بارہ سال کی عمر میں اپنے گھر سے قصبہ رے موجودہ تہران میں مشہور مفسر الرازی سے درس لینے گیا۔ رازی اس وقت بہت ضعیف العمر ہو چکے تھے۔ تقریباً پانچ سال بعد وہ بغداد چلا گیا۔ وہاں امام احمد بن حنبلؒ کا بہت شہرہ تھا۔

اسلامی تاریخ میں معتزلہ کے فتنے کے مقابلے میں جس قدر صعوبتیں اور تشدد امام احمد بن حنبلؒ نے برداشت کیا اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ لیکن طبری کے بغداد پہنچنے سے پہلے ہی امام احمد بن حنبل خالق حقیقی سے جا ملے۔

طبری نے ان کے شاگردوں سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد شافعی مسلک کے استادوں سے بھی پڑھا۔ اس کے بعد وہ شام، فلسطین اور مصر چلا گیا اور وہاں شیعہ اور اسماعیلی علماء سے کسب فیض کیا۔ طبری بغداد واپس آیا تو بغداد پر عباسی خلیفہ المعتضد کی حکومت تھی۔ اس وقت طبری کی عمر پچاس سال ہو چکی تھی۔ طبری دربار سے تو وابستہ نہ ہوا مگر اس کے خیالات عباسی خلفاء کے معتزلی خیالات سے ہم آہنگ ہوتے چلے گئے اور پھر اس نے اپنی فقہ اور اپنے ملسک کی بنیاد رکھی جسے ''الجریری'' کہا جاتا ہے۔ یہ مسلک اس کی موت کے فوراً بعد ہی دم توڑ گیا۔

اسلامی تاریخ میں امام احمد بن حنبلؒ کا تمام مسالک میں احترام پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ مسئلہ خلق قرآن پر استقامت نہ دکھاتے تو آج اسلامی علم کی میراث ہی مختلف ہوتی۔ معتزلہ کے فتنہ پرداز قرآن کو مخلوق ثابت کرنا چاہتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر ایک دفعہ اس امت نے قرآن کو مخلوق مان لیا تو پھر جس طرح ہر مخلوق میں تبدیلی کی جا سکتی ہے ویسے قرآن میں بھی وقت اور حالات کے مطابق تبدیلی کی جا سکے گی۔ امام احمد بن حنبلؒ کی بصیرت اور قربانی نے امت کو اس فتنے سے محفوظ رکھا۔

اسلامی تاریخ میں امام احمد ابن حنبلؒ کا واحد ناقد محمد بن جریر طبری نظر آتا ہے۔ یہ اس قدر مخالف تھا کہ عباسی خلفاء کے دور میں لوگ نفرت کے طور پر گزرتے ہوئے اس کے گھر پر پتھر پھینکا کرتے تھے۔ لوگوں کی مخالفت اس قدر بڑھی کہ عباسی خلفاء نے ایسے لوگوں کو قید میں ڈالنا اور کوڑے مارنا شروع کر دیئے جو طبری کو برا بھلا کہتے تھے۔ 17 فروری 923ء کو وہ انتقال کر گیا اور عباسیوں نے اسے کسی خفیہ مقام پر دفن کر دیا تاکہ لوگ اس کی قبر کی بے حرمتی نہ کریں۔

ایران جیسے علاقے میں پیدا ہونے کے باوجود طبری کا رنگ کافی سیاہی مائل تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں، لمبا قد، چھریرا بدن۔ اس نے لمبی داڑھی رکھی ہوئی تھی، صحت کی حفاظت کے لئے گوشت اور چربی وغیرہ نہیں کھاتا تھا یہی وجہ ہے کہ موت تک اس کی داڑھی میں سفید بال نہیں آئے تھے۔ اس نے اپنی مشہور اور متنازعہ ترین ''تاریخ الامم والملوک'' لکھی۔ یہ وہ تاریخ ہے جس کے سَتر مندرجات آج تک امت مسلمہ میں فتنہ و فساد اور فرقہ بندی اور نفرت کا باعث بنے ہوئے ہیں اور مغرب کے سیکولر انہیں ہتھیار بنا کر ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ طبری مغرب کے اسلام دشمنوں کا محبوب مؤرخ ہے۔

شروع شروع میں جب یورپ میں ''تحریک احیائے علوم'' شروع ہوئی تو عیسائی چرچ نے باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت اپنے زیر اثر کچھ مؤرخین کو اسلام کی تاریخ اور اسلامی کتب کے ترجمے کی ذمہ داری سونپی۔ انہوں نے سب سے پہلے الیگزینڈر پاگانی کا ترجمہ قرآن 1537ء میں شائع کیا۔ اس ترجمے میں جان بوجھ کر ایسی غلطیاں کیں جن سے قرآنی آیات کے مطالب بدل جاتے تھے۔ ترجمے کو ایک خاص مقصد کے تحت استنبول برآمد کیا گیا۔ پاپا گانی جب اسے لے کر خلیفہ کے پاس پہنچا تو وہ سخت غصے میں آ گیا اور اس نے اسے تلف کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کے تمام نسخے جلا دیئے گئے لیکن پھر بھی اس وقت دنیا میں اس تحریف شدہ قرآن کے آٹھ نسخے موجود ہیں جن میں سے دو برٹش میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس تحریف شدہ قرآنی ترجمے کے ساتھ ساتھ دوسری کتاب جو مغرب کے ان

متعصب اور بدنیت لوگوں نے عیسائی چرچ کی سر براہی میں چھاپی وہ ''تاریخ طبری'' تھی۔

طبری کی تاریخ چھاپنے کی ایسی کیا ضرورت محسوس کی گئی، اس کے پیچھے کون سے مقاصد تھے، اس تاریخ میں ایسا کیا درج تھا کہ مغرب کے ان متعصب تاریخ دانوں کے ہاتھ میں آ گیا اور پھر وہ آج تک اسلام اور مسلمانوں کو اپنا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں؟ طبری اور اس کی قبیل کے کئی مؤرخین ہیں جنہوں نے جھوٹے من گھڑت اور بے ہودہ افسانوی قصوں کو مسلمانوں کی تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ ان قصوں کی نہ تو وہ کوئی سند دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے پاس ان کے مآخذ کا کوئی علم ہے۔ خود طبری نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے۔

''میں نے اس کتاب میں وہی کچھ لکھا ہے جو میں نے سنا ہے یا مجھے بتایا گیا ہے۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اس کتاب میں مَیں نے ماضی کے کسی آدمی یا واقعہ کا ذکر کیا ہے اور پڑھنے اور سننے والا اس کو قابل اعتراض یا تنقید و تردید کے قابل سمجھے تو یاد رہے کہ مَیں نے وہی کچھ لکھا ہے جو مجھے بتایا گیا ہے۔''

جس کتاب کو بازاری قصوں کی کتاب ہونا چاہیے تھا اسے مستند ترین تاریخ کے طور پر یورپ نے پیش کیا۔

طبری عام مسلمانوں کی بات کرتا تو قابلِ برداشت تھا لیکن اس نے تو سیدالانبیاءؐ کی ذات کے بارے میں بھی دو عدد من گھڑت قصے اس قدر فضول اور بے ہودہ انداز میں تحریر کئے ہیں کہ انہیں درج کرنے کی بھی ہمت نہیں پاتا۔ ان دونوں فضول قصوں کا نہ کہیں قرآن میں ذکر ہے اور نہ ہی احادیث کی کتابوں میں لیکن طبری نے اپنے ذہن کی غلاظت کو تاریخ کی چاشنی بنا کر پیش کیا ہے۔ طبری کے تحریر کردہ قصوں کو ولیم میور سے لے کر میکس ویبر، جرجی زیدان منٹگمری واٹ اور موجودہ مؤرخین ایسے پیش کرتے ہیں جیسے اصل سچ یہی ہے۔

مقصد صرف مسلمانوں کی سب سے قابل احترام شخصیات کے بارے میں فتنہ کھڑا کرنا اس لئے کہ پوری تاریخ طبری صحابہ سے لے کر عباسی دور تک ایسے افسانوں سے بھری ہوئی ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے تمام من گھڑت قصے جن سے اختلاف کی بو آتی ہو، مسلمانوں کے کردار کی خرابی نظر آئے، سب طبری اور اسی قبیل کے مؤرخین کی ایجادات ہیں اور یہ مؤرخین مغرب اور اس کے سیکولر حواریوں کو بہت محبوب ہیں۔ گزشتہ چھ سو سال سے یہ مغربی مؤرخین اسلام پر کتابیں تحریر کر رہے ہیں لیکن کوئی قرآن کی تعلیمات کا ذکر نہیں کرتا، کوئی حدیث کی کتابوں سے معلومات نہیں لیتا، سب جانتے ہیں کہ دنیا بھر میں مسلمانوں نے حدیث کی احتیاط کے سلسلے میں اسماء الرجال کا ایک علم ایجاد کیا جو تاریخ کو مستند بناتا ہے لیکن چونکہ مسئلہ تذلیل اور امت کی تذلیل ہے اس لئے جھوٹی افسانوی تاریخ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس امت کی پانچ فقہوں میں دین کے نافذالعمل اصولوں پر ذرّہ برابر اختلاف نہیں۔ شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی سب سود کو حرام، زنا پر سنگسار، چوری پر ہاتھ کاٹنا، جھوٹ غیبت وعدہ خلافی کو گناہ سمجھتے ہیں۔ سب پانچ نمازوں، ان کے اوقات، تیس روزوں، حج اور زکوٰۃ پر متفق ہیں کوئی اس کا ذکر نہیں کرے گا، تاریخ اٹھائے گا جو جھوٹے من گھڑت قصے کہانیوں پر مبنی ہے اور اس امت کے سارے جھگڑے تاریخ سے جنم لیتے ہیں اور اسے ہوا دینے میں ان تمام مستشرقین کا دخل ہے جو ہمارے خیر خواہ بن کر ہم پر کتابیں لکھتے رہے اور ہمارے تابناک ماضی کو زہر آلود کرتے رہے۔

(بشکریہ روزنامہ ''ایکسپریس'' لاہور، مؤرخہ 7 جولائی 2015ء)

O

ناقابلِ فراموش

وہ بُری طرح پھنس چکے تھے۔ گڑھے کے اندر دو موذی دشمن ان کی رگوں میں اپنا قاتل زہر انڈیلنے کو تیار کھڑے تھے اور گڑھے کے باہر بھی دو موذی موت بن کر ان کی طرف بڑھے آ رہے تھے۔ دونوں طرف موت کے ہرکارے تھے۔

مُوذی کون؟

☆ فرزانہ نکہت

شمارہ اگست 2015ء ''آزادی نمبر'' میں محترم محمد نذیر ملک کی لکھی کہانی ''آزادی کی قیمت'' پڑھی تو اس سے ملتی جلتی ایک داستانِ آزادی مجھے یاد آ گئی جو مجھے میرے والد مرحوم نے سنائی تھی۔ یہ کہانی ان عقل کے اندھوں کے لئے لمحۂ فکریہ ہے جو ہندو سے گلے ملنے کے لئے بے چین ہیں اور امن کی آشا پیار کی بھاشا کا راگ الاپ رہے ہیں۔

تقسیم ہند کے وقت والد مرحوم فوج کے محکمۂ حسابات (آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس) میں ہیڈ کلرک تھے۔ جب پاکستان بننے کا اعلان ہوا تو اس وقت وہ انبالہ میں تعینات تھے۔ وہاں رہتے ہوئے انہوں نے اپنی آنکھوں سے ایسے ایسے لرزہ خیز واقعات دیکھے جن کی یاد اُن کے ذہن سے کبھی محو نہ ہو سکی۔ پھر جس مہاجر قافلے میں شامل ہو کر وہ پاکستان پہنچے اس کا ایک ایک فرد اپنی جگہ الگ لرزہ کن داستان لئے ہوئے تھا۔ یہ داستان بھی والد مرحوم کو اس قافلے میں شامل ایک امرتسری مہاجر نے سنائی۔ یہ قارئین ''حکایت'' کو ناقابل یقین ضرور معلوم ہو گی مگر حرف بہ حرف سچ ہے۔

شیخ نور بخش کی امرتسر کے ایک بازار میں صراف کی دُکان تھی۔ صراف کا پیشہ ان کے خاندان میں نسلوں سے چلا آ رہا تھا۔ اس پیشے کی بدولت وہ خاصے خوشحال اور فارغ البال تھے۔ جس محلے میں وہ رہتے تھے۔ وہاں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ بھی خاصی تعداد میں آباد تھے۔ ان کے ہمسائے میں ایک بیوپاری لالہ ہری چند کا خاندان صدیوں سے آباد تھا۔ لہٰذا ان دنوں ہندو مسلم خاندانوں میں صدیوں سے دوستی چلی آ رہی تھی۔ یہ دونوں خاندان ایک دوسرے سے انتہائی محبت رکھنے والے دکھ سکھ کے ساتھی، ایک دوسرے کے سچے ہمدرد اور ہر مشکل میں ایک دوسرے کے کام آنے والے تھے۔ ان کے گھروں کی عورتیں ایک دوسرے کے مردوں سے پردہ وہ

نہ کرتی تھیں۔ ان میں بہن بھائیوں جیسا رشتہ استوار تھا۔ یہی حال بچوں کا بھی تھا جو ایک دوسرے کے گھر کو اپنا سمجھتے ہوئے وہاں کھیلتے کودتے اور اکثر رات کو سو بھی جایا کرتے تھے۔ ہندو مسلم دوستی کا ایسا نادر نمونہ اس محلے میں کہیں نہ دکھائی دیتا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ بچے بڑے ہوتے گئے۔ ساتھ ان کے درمیان بہن بھائیوں جیسا رشتہ بھی پختہ ہوتا گیا۔ دونوں گھروں کی جوان لڑکیاں ایک دوسرے کے بھائیوں سے پردہ نہ کرتی تھیں۔ ان کے درمیان بچپن جیسا ہی بے تکلفانہ رویہ تھا۔ بہن بھائیوں جیسا رشتہ۔

لالہ ہری چند کے تین بیٹے تھے اور دو بیٹیاں جبکہ شیخ نور بخش کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ ان کی بیٹیاں اپنی ماں کے افغانی النسل ہونے کے سبب بے پناہ حسین و جمیل تھیں۔ بیٹا بھی مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ شیخ نور بخش نے اپنی بیٹیوں کے رشتے بچپن ہی میں اپنے بڑے بھائی شیخ اللہ بخش کے بیٹوں سے طے کر دیئے تھے جو انہی کی طرح صرافہ کے کاروبار سے منسلک تھے اور ہریانہ میں رہائش پذیر تھے۔ اس کاروبار کی بدولت وہ بھی بڑے خوشحال اور فارغ البال تھے۔

لالہ ہری چند کے تینوں بیٹے اتم چند، تلوک چند اور مانک چند تعلیمی میدان میں نہ چل سکے تھے اور بمشکل تمام میٹرک کر چکنے کے بعد اپنے باپ کے کاروبار میں شریک ہو گئے تھے۔ وہ کردار کے بھی اچھے تھے، اخلاق کے بھی یعنی دولت کی فراوانی نے ان میں بگڑے ہوئے امیرزادوں جیسے خصائص نہ پیدا کئے تھے۔ شیخ نور بخش اور ان کی بیوی فردوس بیگم انہیں اپنے بیٹوں کی طرح چاہتے تھے، ان پر ہر طرح سے اعتماد کرتے تھے۔ اس لئے ان کے اپنی بیٹیوں سے بے تکلفانہ میل جول ہنسی مذاق پر معترض یا بدگمان نہ ہوتے تھے۔

پھر شیخ نور بخش کی بڑی بیٹی کلثوم کی شادی شیخ اللہ بخش کے بڑے بیٹے سے ہوگئی۔ اس شادی کے موقع پر لالہ ہری چند اور اس کے بیٹے ہر کام میں خوب پیش پیش رہے۔ سب سے بڑھ چڑھ کر ہر کام کرتے رہے اور کلثوم کو خوب قیمتی تحفوں تحائف سے نوازا۔ لالہ ہری چند نے ایک باپ کی طرح اور اس کے بیٹوں نے حقیقی بھائیوں کی طرح کلثوم کو اس کے گھر سے رخصت کیا۔

اس شادی کے موقع پر شیخ نور بخش اور شیخ اللہ بخش نے یہ طے کر لیا تھا کہ اگلے سال کلثوم سے چھوٹی نسیم کی شادی شیخ اللہ بخش کے چھوٹے بیٹے سے ہو جائے گی۔

ایسا ہو جاتا لیکن انہی دنوں پاکستان بننے کے اعلان کے ساتھ ہی ملکی حالات خراب ہونا شروع ہو گئے۔ ہر جگہ سے ہندو مسلم فسادات اور قتل و غارت کی خبریں آنے لگیں۔ ان خبروں نے شہر میں خوف و ہراس پھیلانا شروع کر دیا۔ موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے شیخ نور بخش کے محلے کے کئی مسلمان چپ چپاتے پاکستان ہجرت کر گئے۔ اس محلے میں ابھی تک امن و امان تھا لیکن مسلمانوں کو اپنے صدیوں سے ساتھ رہنے والے ہندو اور سکھ ہمسایوں اور دوستوں کے تیور اب بدلے بدلے سے محسوس ہونے لگے تھے۔ ہر چند کہ وہ انہیں ہر دم یقین دلاتے رہتے تھے کہ وہ اپنے صدیوں پرانے تعلقات پر کوئی آنچ نہ آنے دیں گے۔ ان کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگا دیں گے۔ (بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ جو سادہ لوح مسلمان ان کفار پر بھروسہ کر کے وہیں رہ گئے وہ کیسے حسرت ناک انجام سے دوچار ہوئے)

لالہ ہری چند اور اس کے بیٹے بھی شیخ نور بخش اور ان کے اہلِ خانہ کو ایسی ہی تسلیاں دیا کرتے تھے اور ان کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں تک قربان کرنے کے وعدے کرتے رہتے تھے۔ ان کی اس بے پناہ محبت، خلوص، یگانگت پھر برسوں کے ساتھ کے احساس کے پیشِ نظر شیخ نور بخش جو حالات کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے

پاکستان ہجرت کا ارادہ کئے ہوئے تھے وہیں رک گئے لیکن ان کے بڑے بھائی شیخ اللہ بخش ہجرت کا پختہ ارادہ کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک بیٹے کو امرتسر بھیج کر شیخ نور بخش کو بھی ہجرت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن شیخ نور بخش آمادہ نہ ہوئے۔ اس پر شیخ اللہ بخش مع خاندان پاکستان ہجرت کر گئے۔ اس وقت تک حالات اتنے خراب نہ ہوئے تھے کہ مسلح ہندوؤں اور سکھوں کے جتھے مہاجر قافلوں پر حملہ آور ہو کر انہیں مارتے کاٹتے لیکن حالات اس خطرے کی طرف صاف اشارہ کرتے معلوم ہو رہے تھے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ دونوں ہندو مسلم گھروں کے مردوں اور عورتوں کے مابین برادرانہ و خواہرانہ تعلقات قائم تھے۔ دونوں گھروں کی عورتیں بے پردہ ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی تھیں۔ لالہ ہری چند کی بیٹیاں تو ایسی خوبصورت نہ تھیں کہ وہ سانولے رنگ موٹے موٹے نقوش کی مالک تھیں لیکن شیخ نور بخش کی بیٹیاں بے حد حسین و جمیل تھیں۔ یہ ناممکن تھا کہ کسی غیر مرد کی نظر ان پر پڑتی اور وانہ بھٹکتا۔ یہ بات کچھ عجیب ہی معلوم ہوتی تھی کہ لالہ ہری چند کے جوان لڑکے ان بہنوں کو دیکھتے رہتے تھے اور سنبھلے رہتے تھے۔ کلثوم بیاہی جا چکی تھی۔ اپنے سسرال والوں کے ساتھ پاکستان جا چکی تھی۔ اب نسیم رہ گئی تھی جس کے بارے میں شیخ نور بخش یہ سوچتے رہتے تھے کہ حالات سازگار ہوتے ہی اس کی شادی کر دیں گے۔ شیخ اللہ بخش پاکستان ہجرت کرتے وقت انہیں یہی پیغام دے کر گئے تھے۔

ادھر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ملک بھر میں ہندو مسلم فسادات میں بھی شدت آتی گئی۔ مہاجر قافلوں کے راستے میں مارے کاٹے جانے کی خبریں الگ اس محلے کے گرانبار مسلمانوں کے دل دہلانے لگیں۔ اپنے ہندو سکھ ہمسایوں، دوستوں اور ملنے والوں کی مشکوک سرگرمیاں اور رویے ان میں شدید خوف و ہراس پیدا کرنے لگے۔ انہوں نے شیخ نور بخش کو بھی چونکا دیا۔ انہوں نے اپنی بیوی فردوس بیگم اور بیٹے نور افضل سے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ ان حالات میں ان کا پاکستان ہجرت کر جانا ہی بہتر رہے گا لیکن ان کی بیوی اور بیٹا اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ انہیں لالہ ہری چند کے اہلِ خانہ کے خلوص اور نیک نیتی پر مکمل بھروسہ اور اعتماد تھا۔ جو بڑی شد و مد سے ان کے جان و مال کے تحفظ کا یقین دلاتے چلے آ رہے تھے بلکہ انہوں نے اس محلے میں آباد اپنے رشتہ داروں اور واقف کاروں کو بھی ان کی مدد و تحفظ کے لئے آمادہ کر لیا تھا۔ اس صورتِ حال کے باوجود نہ جانے کیوں شیخ نور بخش کا دل ہر دم اندیشہ ہائے دور و دراز کی آماجگاہ بنا رہتا تھا۔

پھر ایک دن جب اس محلے میں ایک مسلمان کے گھر کو آگ لگا دی گئی اور اس کے مکینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور خواتین اغوا کر لی گئیں تو شیخ صاحب کے ساتھ ہی ان کے اہلِ خانہ بھی شدید خوف زدہ ہو اٹھے۔ انہوں نے اب ہجرت کا پختہ فیصلہ کر لیا۔ انہیں اب اپنے ہندو مسلم محلہ داروں حتیٰ کہ لالہ ہری چند پر بھی اعتبار نہ رہا۔ انہوں نے چپکے چپکے پاکستان ہجرت کی تیاریاں کرنی شروع کر دیں۔ مشاورت سے یہ طے پا گیا کہ پہلے شیخ صاحب کی بیوی اور بیٹی پاکستان چلی جائیں۔ پھر شیخ صاحب نور افضل کے ساتھ گھر کا مال اسباب ٹھکانے لگا کر ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ شیخ صاحب نے اپنی دکان کا تمام سونا چاندی پگھلا کر اس کی اینٹیں بنائیں، انہیں ایک صندوق میں محفوظ کیا۔ کچھ روپیہ پیسہ ان کے پاس جمع تھا۔ وہ بھی بیوی کے حوالے کیا پھر ایک رات وہ چھپ چھپاتے گھر سے نکلے اور سٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں لاہور جانے والی ٹرین کھڑی تھی۔ جسے صبح نور کے تڑکے روانہ ہونا تھا۔ رات کے اس پہر بھی اس میں

مسلمان مہاجر بھرے ہوئے تھے۔ شیخ صاحب نے کسی نہ کسی طرح بیوی اور بیٹی کو سامان سمیت ایک ڈبے میں جگہ دلائی اور رات بھر کے لئے نور افضل کے ساتھ سٹیشن پر رک گئے۔ پھر صبح جب ٹرین اپنے لاہور کے سفر پر روانہ ہوگئی تو وہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہوئے بیٹے کے ساتھ گھر واپس آ گئے۔ ان کے سر پر سے اک بھاری بوجھ سرک گیا تھا۔

ان کی بیوی اور بیٹی کی گھر سے عدم موجودگی ظاہر تھا لالہ ہری چند کی خواتین سے ہرگز پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی۔ اس لئے باپ بیٹا نے یہ طے کیا کہ وہ انہیں بتائیں گے کہ وہ اس محلے میں ہونے والے آتش زنی اور قتل کے واقعہ سے شدید خوفزدہ ہو کر بڑی تیزی اور افراتفری کے عالم میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں پٹھان کوٹ چلی گئی تھیں۔ جو نسبتاً کم آبادی والا شہر تھا اور وہاں ابھی فسادات نے زور نہ پکڑا تھا لیکن اس کا موقع نہ آ سکا۔ اس کی بجائے حالات نے ایسی کروٹ لی کہ ان باپ بیٹا کو بھی اپنی جانیں بچا کر فوراً ہی گھر سے بھاگنا پڑ گیا۔

نور افضل اتم چند کا ہم عمر اور گہرا دوست تھا۔ ان دونوں نے تعلیم بھی ایک ہی سکول سے حاصل کی تھی۔ دونوں آپس میں ہم نوالہ و ہم پیالہ ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے بااعتماد ساتھی اور راز دان بھی تھے۔ نور افضل کو ہر چند کہ اس سے گہری محبت تھی، وہ ہر طرح سے اس پر اعتماد کر سکتا تھا لیکن اپنے اندر سے اٹھنے والی کسی تنبیہی آواز نے اسے اپنی پاکستان ہجرت کے بارے میں اعتماد میں لینے سے باز رکھا ہوا تھا۔ اس کے والد نے بھی اس بارے میں اس کو سختی سے منع کر رکھا تھا لیکن اس نے پاکستان جانے سے پہلے اتم چند سے ایک عام سی ملاقات کر لینے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا اور ایک شام اس سے ملنے اس کے گھر جا پہنچا۔

لالہ ہری چند کے گھر کا بیرونی دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ اس مرتبہ بھی کھلا ہوا تھا۔ وسیع صحن سے آگے گھر کے مختلف حصوں میں جانے کے لئے تنگ و تاریک راہداریاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ اس راہداری میں ہو لیا جس میں اتم چند کا کمرہ واقع تھا۔ اس کی طرف بڑھتے بڑھتے راستے میں ایک کھلے ہوئے دروازے کے اندر سے آنے والی آوازیں سن کر وہ چلتے چلتے رک گیا۔ ان آوازوں کا شور سن کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس وقت لالہ ہری چند کا تمام خاندان اس کمرے میں موجود تھا۔ جانے کیا سوچ کر وہ اندر جانے کی بجائے وہیں دروازے کے ایک طرف کھڑے ہو کر اندر سے آنے والی آوازوں کو سننے لگا۔ اس وقت تلوک چند بول رہا تھا۔ اس کی زبان مسلمانوں کے خلاف انگارے اگلتی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بڑے فخریہ انداز میں بتا رہا تھا کہ کیسے اس نے اور اس کے ساتھیوں نے مل کر شہر کی ایک نواحی مسلمان بستی کو آگ لگائی تھی، وہاں خون کی ہولی کھیلی تھی۔ ان کی عورتیں اٹھا کر لے گئے تھے جنہیں آبروریزی کے بعد قتل کر دیا تھا۔ اس ''کارنامے'' کی تفصیلات نور افضل اپنی جگہ سن سا کھڑا سنتا رہا۔ پھر اس نے لالہ ہری چند یعنی اپنے عزیز از جان چاچا جی کی آواز سنی۔

''ان مُسلوں کی ناریاں بڑی سندر ہوتی ہیں۔ اپنے یار نور بخش کی استری کی سندرتا کا تو جواب نہیں۔ اس عمر میں بھی خوب سندر بجلی ہے۔ اتنے عرصہ تک میں اپنا من مارتا رہا، ذرا اس کی پتنی......'' آگے نور افضل سے کچھ نہ سنا گیا۔ اسے ایک چکر سا آیا، لڑکھڑا کر گرنے سے بچنے کے لئے اس نے دیوار کا سہارا لیا اور بے جان سا نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ اندر کمرے میں سے مکروہ اور گھناؤنے ہنسی قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر ایک آواز آئی۔

''پتا جی! ماتا جی اجازت نہیں دیں گی ورنہ ہمیں چاچی فردوس کے اپنی سوتیلی ماتا بننے پر کوئی اعتراض نہ ہو گا''۔ یہ آواز مانک چند کی تھی جسے نور افضل نے بڑے بھائی کا درجہ دے رکھا تھا۔

اس پر کمرے میں ایک بار پھر شیطانی ہنسی اور قہقہوں کا طوفان برپا ہو گیا۔ نور افضل کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔ رگوں میں خون جوش مار رہا تھا لیکن وہ بمشکل تمام ضبط کئے خاموشی سے اندر سے آنے والی باتیں سنتا رہا۔

''نسیم بڑی سندر ہے، کوئی اپسرا لگتی ہے۔ اگر مسلی نہ ہوتی تو اتم چند کے ساتھ اس کا بڑا اچھا جوڑ تھا۔ یہ جوڑ ابھی بھی بن سکتا ہے اس کے لئے بس چاچا نور بخش چاچی اور نور افضل کو راہ سے ہٹانا ہوگا......'' مانک چند کی گھناؤنی آواز پگھلا ہوا سیسہ بن کر نور افضل کے کانوں میں پہنچی۔

''بھایا جی! آپ نے تو میرے دل کی بات کہی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ نسیم کو دیکھ کر میں کتنی مشکلوں سے اپنے آپ کو بہکنے سے بچائے رکھتا تھا۔ اب تو مجھ میں مزید ضبط کا یارا نہیں...... ہم اپنے منصوبے کے مطابق کل رات بھیس بدل کر ان مُسلوں کے گھر کو آگ لگائیں گے، نسیم کو اٹھا لائیں گے، باقی دونوں پتی پتنی اور نور افضل مار دیئے جائیں گے''۔ یہ آواز نور افضل کے عزیز از جان دوست اتم چند کی تھی۔

''اس طرح نور بخش کا تمام سونا چاندی روپیہ پیسہ بھی ہمارے قبضہ میں آ جائے گا۔ اس کی صرافے کی دُکان اپنے بازار کی سب سے بڑی دُکان ہے اس میں......'' نور افضل نے لالہ ہری چند کی پوری بات سننے کے لئے وہاں مزید رکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے بے شمار سیاہ پردے ہٹ گئے تھے۔ اسے اپنے والد اور دوسرے لوگوں کی کہی باتیں سچ ثابت ہوتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی کہ ہندو کا کبھی اعتبار نہ کرنا۔ وہ سانپ ہے موقع پا کر ڈسنے سے باز نہ آئے گا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بے آواز قدموں سے چلتا راہداری میں سے باہر نکل آیا۔ یہ اللہ کی بڑی مہربانی تھی کہ اسے کسی ملازم نے نہ گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا نہ نکلتے۔ بیرونی دروازے سے باہر نکلتے ہی اس نے اپنے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس کی دستک پر اپنا نام بتانے پر شیخ نور بخش نے کلمہ شکر ادا کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ وہ افتاں و خیزاں اندر چلا آیا۔ پھر جب شیخ صاحب دروازے کی کنڈی لگا کر پلٹے تو اس نے ان کا ہاتھ پکڑا اور انہیں اپنے ساتھ تقریباً دوڑاتا ہوا اندر کمرے میں لے آیا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور بکھری ٹوٹی سانسوں کے ساتھ انہیں جلدی جلدی لالہ ہری چند کے گھر سنی ہوئی باتیں سنانے لگا۔ شیخ صاحب شاید ایسی باتوں کے لئے تیار ہی تھے۔ انہوں نے اظہار غم دکھ و تاسف اور دیگر تبصرہ آرائیوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اسی وقت ہجرت کر جانے کا فیصلہ کیا اور نور افضل کے ساتھ مل کر دو تھیلوں میں کچھ ضروری چیزیں، کپڑے اور اشیائے خورد و نوش بھریں۔ گھر اور دکان کی فروخت سے انہیں جو بھاری رقم حاصل ہوئی تھی اپنی کمر سے باندھا۔ کچھ کھایا پیا پھر جب رات کا اندھیرا کچھ گہرا ہوا تو دونوں باپ بیٹا تھیلے سنبھالے چپکے سے گھر سے نکل کر ویران پڑی تاریک گلی میں آ گئے۔

فسادیوں سے بمشکل تمام بچتے بچاتے، سایوں سایوں میں رہتے، گلیاں سڑکیں عبور کرتے بالآخر وہ دونوں شہر سے باہر نکل ہی آئے۔ رات گزرتے گزرتے انہوں نے کھیتوں کے کئی سلسلے عبور کر لئے اور صبح ہوتے ہوتے ایک مضافاتی قصبہ میں پہنچ گئے۔ وہ خالی پڑا تھا۔ ہر جگہ مسلمانوں کی لاشیں اور خون بکھرا ہوا تھا۔ کوّے گدھ اور جنگلی جانور ان پر منڈلا رہے تھے۔ وہ ان پر فاتحہ پڑھنے کے بعد تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ اندازے سے ان کا رخ لاہور کی طرف تھا۔ ایک گاؤں کے باہر انہیں مسلح سکھوں کا ایک جتھا لوٹ مار کرتا دکھائی دیا۔ وہ فوراً ہی ایک درخت پر چڑھ گئے۔ پھر جب سکھ اس گاؤں کو آگ لگانے اور بھرپور درندگی کا مظاہرہ کرنے کے بعد وہاں

سے چلے گئے تو وہ درخت سے نیچے اترے اور تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

اب دوپہر ہونے کو آ رہی تھی اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک درخت کے نیچے رک کر کچھ کھایا پیا اور کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ابھی تک انہیں کوئی اکا دکا مہاجر یا مہاجر قافلہ نہ ملا تھا۔ اپنے اندازے کے مطابق وہ اب تک امرتسر سے کافی دور نکل آئے تھے۔ اس وقت وہ جن کھیتوں میں سے گزر رہے تھے، ان میں تازہ ہل چلایا گیا معلوم ہوتا تھا، ان میں چڑیاں اور دوسرے پرندے چر چک رہے تھے۔ وہ ان میں سے گزرتے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے آگے بڑھتے رہے۔ پھر ایک جگہ ایک ایسے کھیت میں جس میں ہل کی لکیریں غائب ہو چکی تھیں اور جابجا گڑھے پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے بھورے رنگ کے بٹیروں جتنے پرندوں کو ایک گڑھے کے اوپر منڈلاتے دیکھا۔ کچھ پرندے زمین پر اترے ہوئے تھے اور گڑھے کے اندر جھانک رہے تھے۔ یہ گوشت خور پرندے تھے۔

''شاید اس گڑھے میں کوئی زخمی انسان پڑا ہے...... آؤ ذرا چل کر دیکھیں''۔ شیخ صاحب نے کہا۔

ان کے قریب پہنچنے پر سب پرندے اُڑ کر قریبی درختوں پر جا بیٹھے۔ انہوں نے جب گڑھے کے قریب جا کر اس میں جھانکا تو انہیں اس میں خشک گھاس کے اوپر سفید سفید سے چھوٹے چھوٹے انڈے پڑے دکھائی دیئے۔

''جانے یہ کس پرندے یا جانور کے انڈے ہیں اتنے ڈھیر سے اور چھوٹے چھوٹے سے''۔ نور افضل حیرت سے بولا۔

''ہمیں ان کی حفاظت کرنی چاہئے، یہ پرندے ان کی تاک میں ہیں۔ جب تک ان انڈوں کے مالک نہیں آ جاتے ہمیں ان پرندوں کو بھگاتے رہنا چاہئے۔ شاید ہماری یہ نیکی اللہ کو پسند آ جائے اور ہم اپنے دشمنوں سے بچ بچا کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں''۔ شیخ صاحب بولے۔

وہ بھورے پرندے، وہ انڈے کھانے کے لئے بڑے بے تاب دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے ان کے سروں کے اوپر منڈلانا شروع کر دیا تھا۔ کچھ تو گڑھے میں اترنے اور اس میں غوطے لگانے کی کوششیں بھی کرنے لگے تھے۔ دونوں باپ بیٹا گڑھے کے کنارے پر کھڑے ہو گئے اور اپنے کندھوں پر پڑے رومالوں کو گھماتے ہوئے پرندوں کو بھگانے کی کوشش کرنے لگے۔

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ انہیں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ انہوں نے دیکھا سامنے سے دو گھوڑ سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے ان کی طرف لپکے چلے آ رہے تھے۔ ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ اِدھر اُدھر بھاگنے کا وقت نہ تھا، انہوں نے اسی انڈوں والے گڑھے میں چھپ جانا بہتر سمجھا۔ ان کا خیال تھا کہ گھوڑ سواروں نے انہیں نہیں دیکھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں انہیں برابر سنائی دے رہی تھیں جو قریب سے قریب تک آتی جا رہی تھیں۔ اچانک انہیں گڑھے کے اندر اپنے پیچھے پھنکار کی آواز سنائی دی۔ گھبرا کر پیچھے دیکھا تو ایک کوبرا ناگوں کا جوڑا پھن اٹھائے پھنکار رہا تھا۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ جن انڈوں کو وہ کسی پرندے کے انڈے سمجھ رہے تھے وہ اس ناگوں کے جوڑے کے انڈے تھے۔

وہ بُری طرح پھنس چکے تھے۔ گڑھے کے اندر دو موذی دشمن ان کی رگوں میں اپنا قاتل زہر انڈیلنے کو تیار کھڑے تھے اور گڑھے کے باہر بھی دو موذی موت بن کر ان کی طرف بڑھے آ رہے تھے۔ دونوں طرف موت کے ہرکارے تھے۔

نور بخش نے ایک عجیب بات یہ محسوس کی کہ ناگوں کا انداز جارحانہ یا حملہ کرنے والا نہیں تھا۔ وہ بس اپنی جگہ پھن

اٹھائے جھوم رہے تھے۔ پھر بھی انہوں نے بہتر سمجھا کہ سانپ کا کیا بھروسہ کہ کب ڈس لے۔ یہی سوچ کر آہستہ آہستہ گڑھے سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ابھی وہ گڑھے سے نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ دونوں گھوڑ سوار آ پہنچے۔ غالباً انہوں نے ان کو گڑھے میں چھپتے دیکھ لیا تھا۔ قریب پہنچتے پہنچتے گھڑ سواروں نے ان کے آگے کا راستہ روک لیا اور گھوروں پر سے چھلانگ لگا کر ان کی طرف چلے آئے۔ وہ تلوک چند اور مانک چند تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کرپانیں اور چہروں پر خباثت بھری مسکراہٹیں تھیں۔

''چپکے سے بھاگ لئے بزدلو، کمینو! تمہارا کیا خیال تھا ہم تمہاری طرف سے بے خبر تھے؟ اب ہم تمہیں نہ بھاگنے دیں گے، یہیں تمہارا پاکستان بنا دیں گے''۔ مانک چند نے کرپان نور افضل کی طرف تان لی۔

''تمہاری عورتیں کدھر ہیں، ہمیں تو وہ کہیں نہیں دکھائی دے رہیں، سچ بتاؤ تم نے انہیں کہاں چھپایا ہوا ہے؟'' تلوک چند نے دانت پیستے ہوئے شیخ صاحب سے پوچھا اور کرپان ان کی شہ رگ پر رکھ دی۔

''ہماری عورتیں اس وقت پاکستان میں محفوظ و مامون بیٹھی ہیں''۔ شیخ صاحب ذرا نہ گھبرائے اور بڑے سکون سے بولے۔ ''سانپ کی اولاد! تم اپنے مار آستین باپ کو جا کر بتا دینا کہ میرے جس سونا چاندی کے ذخیرے پر اس کی نظر تھی وہ بھی اب پاکستان پہنچ چکا ہے اور میری تمام دولت بھی''۔

''ملعون بڈھے!'' تلوک چند کے منہ سے گالیوں کا طوفان اُمڈ پڑا۔ ''میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں......'' وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا اس کے منہ سے ایک زور کی اذیت بھری چیخ نکلی۔ وہ زمین پر گر گیا اور بری طرح تڑپنے مچلنے چیخنے چلانے لگا۔ شیخ صاحب نے دیکھا اس کی ٹانگ سے ایک بڑا سا سیاہ ناگ لپٹا ہوا اسے مسلسل ڈسے جا رہا تھا۔ پھر انہوں نے مانک چند کی طرف

دوسرے ناگ کو بڑھتے دیکھا۔ مانک چند چیخا اس نے بکڑ پان سے اس پر وار کیا لیکن اس کا نشانہ خطا گیا اور وہ ناگ اچھل کر اس پر حملہ آور ہو گیا اور اس کی ٹانگ پر ڈس لیا۔ وہ زمین پر گر گیا اور بری طرح سے لوٹ پوٹ ہونے چیخنے چلانے لگا۔ ناگوں کا جوڑا ان سے الگ ہو کر ایک جگہ پھن اٹھائے انہیں دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ دونوں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے۔ ناگوں کے جوڑے نے شیخ صاحب اور نور افضل کی طرف دیکھا پھر مڑ کر جہاں سے آئے تھے وہیں ہو لئے جاتے جاتے وہ مڑ مڑ کر شیخ صاحب اور نور افضل کو دیکھتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بہت دور گھنی جھاڑیوں میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

''ابا جان! جن انڈوں کی ہم پرندوں سے حفاظت کرتے رہے تھے وہ ان سانپوں کے ہی ہوں گے۔ انہوں نے اس احسان کا بدلہ ہمیں اپنے ان دشمنوں سے بچا کر دیا''۔ نور افضل بولا۔

''ہاں، حیرت کی بات ہے جو سانپوں میں بھی احسان مندی اور ممنونیت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ یہ سانپ اگر ہماری مدد کو نہ آ جاتے تو ان موذیوں نے ہمیں ضرور قتل کر ڈالنا تھا''۔ شیخ صاحب بولے۔ ''ان موذی ہندوؤں سے یہ زہریلے سانپ اچھے نکلے''۔

اب شام ہونے کو آ رہی تھی اور انہیں طویل سفر کرنا تھا۔ تلوک چند اور مانک چند کے گھوڑے سانپوں کو دیکھتے ہی خوف زدگی کے عالم میں وہاں سے بھاگ چکے تھے ورنہ وہ ان پر سوار ہو کر تیزی سے اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے تھیلے سنبھالے اور آگے روانہ ہو گئے۔ سفر کرتے کرتے انہیں رات ہو گئی۔ انہوں نے ایک جگہ مٹی کے بلند ڈھیر کے سائے میں اپنے سونے کے لئے جگہ بنائی۔ تھوڑی بہت خوراک کھائی۔ وہاں سانپوں اور دیگر حشرات الارض کا خوف بھی تھا اور حملہ آور ہندو بھی جتھوں کا بھی مگر نیند کی شدت نے جلد ہی انہیں ان تمام خوفوں سے بے نیاز کر دیا۔

صبح ہوتے ہی پھر ان کا سفر شروع ہو گیا۔ اب ان کی راہ مشکل ہوتی جا رہی تھی۔ راستے میں ہندو بلوائی بھی نظر آئے مسلح سکھ جتھے بھی۔ ہر مرتبہ وہ درختوں پر چڑھ کر یا لمبی لمبی گھاس میں چھپ کر اپنی جانیں بچاتے رہے۔ پھر شام گہرے ہوتے ہی انہیں ایک مہاجر قافلہ مل گیا۔ اس میں دہلی، آگرہ، فتح پور اور نواحی علاقوں کے مہاجر شامل تھیں جو بڑی لٹی پٹی حالت میں پاکستان جا رہے تھے۔ شیخ صاحب اور نور افضل اس قافلے میں شامل ہو گئے اور طویل سفر کی صعوبتیں جھیلتے، مشکلات و مصائب برداشت کرتے بالآخر واہگہ پہنچ گئے۔

شیخ اللہ بخش اپنے کنبے کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور میں آباد ہو چکے تھے۔ شیخ نور بخش کی بیگم اور بیٹی نسیم بھی ان کے پاس آ چکی تھیں۔ شیخ نور بخش اور نور افضل کے بخیر و عافیت لاہور پہنچنے پر سب نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

شیخ نور بخش لاہور میں رہتے ہوئے خوب خوشحال اور فارغ البال ہوئے۔ ان کا خاندان بھی خوب پھلا پھولا لیکن وہ یہ کبھی نہ بھول سکے کہ لالہ ہری چند اور اس کے خاندان نے صدیوں کی بنیادوں پر استوار اخوت و دوستی کے رشتے کو ڈھا کر اپنے اصل روپ میں آ کر ان کی جانیں لینے کی کوشش کی جبکہ سانپوں نے موذی ہونے کے باوجود صرف اپنے انڈے بچا لینے کو ان کا احسان عظیم سمجھتے ہوئے انہیں اصل موذیوں سے نجات دلائی۔

واقعی اصل موذی سانپ نہیں ہندو ہے، آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

حقیقت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے دو زہریلے ناگوں کو ان کی حفاظت کے لئے بھیج دیا تھا۔ جس کے ساتھ اللہ ہو، اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

ایک تاثر ایک کہانی

ڈکیت

کچھ بہنیں بھائیوں کو ''ڈکیت'' بنا دیتی ہیں اور کچھ بہنوں کی وجہ سے بھائی ''ڈکیت'' بننے سے بچ جاتے ہیں۔ ''نظام'' چل رہا ہے۔

☆ پیر شہزادہ علیم معصومی
shahzada.7073@yahoo.com,0300-8607072

تین بچے ہو چکے اور شادی کا کوئی سُراغ نہیں مل رہا مِس واسطی آپ کے ہاتھ میں۔ میں نے بتول کی دائیں ہتھیلی کے نچلے چھور پر نگاہیں گاڑے گاڑے کہا۔ حیرت سے اُس کی آنکھیں اِتنی کھل گئیں کہ مانو ڈیلے باہر نہ آن گریں۔ دو چار اور بھی ذاتی نوعیت کی باتیں بتائیں اُسے، تو وہ پھیل ہی گئی اور تفصیلی وقت کی خواستگار ہوئی۔ کہنے لگی۔ وقت عطا کریں تو درگاہ شریف پر حاضر ہو جاؤں مکمل زائچہ دیکھ لیجئے گا۔

بئی درگاہ شریف پر تو ان امور کے لئے ٹائم نہیں ہوتا اور نہ ہی ضرورت ہوتی ہے۔ اور نہ ہی چیمبر پامسٹری اور جوتش وِدّیا کے لئے مختص ہو سکتا ہے۔ آج تو میں اتفاق سے فری تھا اور نہ جانے کیوں یوں ہی دِل آ گیا کہ آپ کا کیس ہاتھ کی لکیروں کی روشنی میں بھی دیکھا جائے۔ خیر یہ تو فیملی میٹرز ہیں اور آپ کا کیس ہے کرایہ داری کا۔ تو اب چلیں؟ میں نے مِس واسطی کو مشاورتی کمرے سے باہر چلنے کے لئے کہا۔ خیر وہ میرے کلرک کے پاس پڑے ہوئے چند کاغذات پر دستخط کر کے اور کچھ روپے ادا کر کے چلی گئی۔

دراصل وہ ایک کرایہ کی کوٹھی میں رہ رہی تھی اور اس کا مالک مکان کے ساتھ کچھ تنازعہ ہو گیا تھا۔ اُس نے ہمارے قانونی اِدارے کو اپنے کیس کی پیروی کے لئے منتخب کیا تھا اور آج مجھ سے اُس کی چوتھی مُلاقات تھی۔ کافی زندہ دل اور ہنس مکھ عورت تھی لیکن میرے احترام میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتی تھی۔ یہی شاید ہم جیسوں کی کمزوری بھی ہوا کرتی ہے۔

☆☆☆☆

''میری بیٹی اور اُس کی بہن کے زیور گروی پڑے تھے جی۔ اُسی قرض سے چھوٹی کو وِداع کیا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ پریشان رہتا تھا کہ زیور جلدی چھڑوا لئے جائیں اس سے پہلے کہ ہمارے داماد کو اس کی خبر ہوتی اور بڑی کا گھر بھی خراب ہو جاتا۔ بس ایک دن اُٹھا اور مجھ سے کہا۔ ابّا جان! بہنوں کے گھر خراب نہیں ہونے دوں گا اور نہ آپ کی مُونچھ کا بَل نکلنے دُوں گا۔ میں نے کہا بھی کہ بیٹا آخر کیا ہے تمہارے دماغ میں؟ تو کہنے لگا کُچھ نہیں ابّا جان وِحس عزّت و اِحترام سے میری بہنیں پلی بڑھی ہیں۔ اسی طرح عزّت سے سُسرال میں رہیں گی۔ آپ فِکر نہ کریں''۔ مشاورتی کمرے میں میرے سامنے بیٹھے رائے اسد نامی بزرگ شخص نے اپنے بیٹے کا کیس ڈسکس کرتے ہوئے بتایا۔

مگر رائے صاحب عزّت بچانے کا یہ کون سا

طریقہ ہے کہ ڈاکے ڈالے جائیں؟ میں نے سُلگتے انداز میں کہا۔

آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں۔ جی مگر گھریلو مسائل اور بہنوں کے لئے اُس نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک روڈ ڈکیتی کی اور دو کاروں کو لُوٹ لیا۔ اس وقت تو ہمارے مسئلے حل ہوگئے اور مجھے بھی پتا نہ چلا مگر بعدازاں وہ پکڑا گیا اور جیل چلا گیا۔ تب مجھے بھی پتا چلا۔

مگر اب میں نے مکمل تسلی کی ہے ۳۹۲ ت پ ض، کا پرچہ اس پر کٹا ہے ۔ صرف مال مقدمہ زیادہ ڈالا ہے پولیس نے مگر حضور۔ یہ جو دو پرچے ۳۹۵ ت پ ض، کے پولیس نے دے دیئے ہیں وہ بالکل جھوٹے ہیں اور مجھے اچھی طرح یاد ہے جن دنوں یہ دونوں وارداتیں ہوئیں میرا بیٹا جیل میں تھا۔ بعدازاں پولیس نے جان بوجھ کر وقوعہ کو پچھلی تاریخوں میں ظاہر کر کے ناجائز میرے بیٹے کو ملوث کر دیا۔ مجھے...... مجھے۔ تو یہاں تک شک ہے سرکار۔ کہ۔ یہ ڈاکے ہی پولیس والوں نے ڈلوائے ہیں۔۔ ہم جیسوں کو بلاوجہ پھنسا رہے ہیں۔ رائے اسد نے کہا۔

''ہُوں تو یہ بات ہے مسٹر رائے!۔ میں اپنے طور پر تسلی کر کے آپ کا کیس لے لوں گا۔ فی الحال آپ ہمیں پولیس فائل اور جوڈیشل فائل کی نقول۔ پہنچا دیں۔ میں نے رائے سے مزید وقت لے لیا۔ دراصل میں اُس کے دعوے کی صداقت پرکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆☆

میری نگاہیں چیمبر کے مرکزی گیٹ سے باہر رواں دواں سڑک پر بے ترتیبی سے بھٹک رہی تھیں۔ اور ذہن سوچ سوچ کر دور کی کوڑیاں لا رہا تھا کہ اچانک ہمارے گیٹ کے سامنے پارکنگ ایریا میں ایک بلیک مرسڈیز آن رُکی۔ مِس واسطی ۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ مس واسطی فرنٹ سیٹ پر براجمان تھی اور ایک چھریرہ سا نوجوان بوجھل آنکھوں کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا مس واسطی کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ یقیناً میں نے بھی وہی سوچا جو ہم معاشرتی طور پر سوچنے کے عادی ہیں مگر اپنی سوچوں کے گھوڑے میں زیادہ دوڑا نہ سکا تھا کہ گاڑی کی فرنٹ سیٹ سے مس واسطی اور بیک سے ایک نوجوان لڑکی اُتریں اور پھر وہ نوجوان کار پارک کرنے لگا۔ اب وہ تینوں مل کر اندر آرہے تھے ۔ اور پھر اجازت لے کر وہ سب مشاورتی کمرے میں آگئے۔

السلام علیکم سر! مس واسطی اور دوسری لڑکی نے بالترتیب کہا۔ پھر اُس نوجوان نے مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بھی یہی الفاظ دہرائے۔

وَعلیکم السلام۔ تشریف رکھئے۔ میں نے خوش اِخلاقی سے کہا۔

یہ میرا چھوٹا بھائی ہے سر۔ رضا! مس واسطی نے بتایا۔ تب میرے وسوسے کچھ ماند پڑ گئے۔ اور میں نے نوجوان کو غور سے دیکھا۔ نقش ونگار سے بھی وہ مس واسطی کا بھائی ہی لگ رہا تھا۔ مگر میں نے اُسے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ کہاں دیکھا تھا؟ یاد نہیں آرہا تھا۔

مگر اسی دوران اُس نے اجازت لی کہ کسی کام کے لئے نکلنا ضروری ہے۔ خیر مس واسطی نے کمسن لڑکی کے متعلق بتایا کہ وہ اُس کی چھوٹی بہن ہے۔

رُباب! وہ پیاری لڑکی تھی۔ مگر کٹنس کچھ مختلف تھے مس واسطی سے۔ سر ایکچولی آج میں کیس کے بارے میں بالکل ڈسکس نہیں کرنے آئی۔ سر آپ نے میرے بارے میں جو باتیں بتائیں وہ اِتنی ایکوریٹ تھیں کہ میں حیران رہ گئی۔ میں نے گھر جا کر سب کو بتایا، سب کے سب حیران رہ گئے۔ تو رُباب ضد کرنے لگی کہ میں بھی سر سے مل کر اپنے بارے میں کچھ جانوں گی۔ ہم ٹائم لئے بغیر چلے آئے۔ مس واسطی نے تفصیل بیان کی۔

''ہاہاہاہا...... وہ تو کچھ ویسے ہی مُوڈ آ گیا تھا اور میرا موڈ کبھی کبھی ہی آتا ہے۔ آپ نے تو دل ہی پہ لے لیا''۔ میں نے کہا۔

''نہیں سر! پلیز بچی کا دل نہ توڑیں کچھ تو بتائیں''۔ مس واسطی نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

''او کے، او کے کچھ کرتے ہیں۔ مس رباب! لائیں دائیاں ہاتھ دکھائیں''۔ میں نے کہا تو اُس نے دائیاں ہاتھ اندازِ دل رُبائی کے ساتھ میری طرف بڑھا دیا۔ جس میں تین نگ جڑی ایک قیمتی انگوٹھی تھی۔ میں نے خاص طور سے انگوٹھی کو دیکھا اور پھر اُس نازنین کا ہاتھ پکڑ کر گھمایا کہ ہتھیلی میرے سامنے آگئی۔

☆☆☆☆

مسٹر رائے! میں آپ کے بیٹے کا کیس لوں گا۔ ہم ہائی کورٹ میں کوئیشمنٹ دائر کریں گے۔ آپ میرے کلرک کے پاس فیس جمع کروا دیں۔ میں نے کہا۔

جی بہتر۔ بہت شکریہ۔ اب مجھے یقین ہے کہ مجھے انصاف مل جائے گا مُرشد! رائے نے کہا۔ اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

اوہ ذرا رکیں مسٹر رائے۔ میں نے بُلایا۔

جی؟ وہ مُڑا۔

وہ زیور جو گروی تھا آپ کی بچیوں کا وہ چھڑوالیا آپ نے؟ میں نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

جی نہیں اللہ مالک ہے۔ مکان برائے فروخت ہے میرا۔ وہ بک جائے گا تو زیور بھی آجائے گا۔ رائے نے کہا۔

او کے تو آپ فیس بھی بعد میں دے دیجئے گا۔ میں نے کہا۔

رائے کی آنکھوں میں اچانک نمی اُبھر آئی۔ نہیں نہیں مُرشد! قرض تو زیور یا جائیداد اور زبان کی ضمانت پر میں لیتا رہتا ہوں مگر سُوکھا اُدھار اور امداد کبھی نہیں لی۔ آپ دعا کر دیں گے۔ آسانیاں ہو جائیں گی۔ رائے نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ اور دوبارہ شکریہ ادا کر کے فیس ادا کرنے چلا گیا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کاش ایسے عظیم انسان کا بیٹا۔ ایسے وضع دار باپ کی مدد کسی اور انداز سے کرتا۔

☆☆☆☆

جی بھائی! میں وکیل صاحب کے آفس ہی ہوں آپ آجائیں۔ رضا۔ مس واسطی کا بھائی میرے سامنے بیٹھا کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ وہ فیس ادا کرنے آیا تھا۔ جی سر پانچ منٹ میں بھائی آرہے ہیں۔ وہ آتے ہیں تو فیس ادا ہو جائے گی پلیز آپ تیاری کریں۔ رضا مجھ سے مخاطب ہوا۔

ڈونٹ وری۔ تیاری مکمل ہے۔ میں نے کہا۔

سر! ڈاکٹر طلعت آئے ہیں۔ میرے ایک اسسٹنٹ نے مجھے اطلاع دی۔ ہاں بھئی بھیج دو فوراً۔ میں نے کہا۔ ڈاکٹر طلعت اندر داخل ہوئے تو میں اور رضا دونوں کھڑے ہوگئے۔ میں نے مصافحہ کیا اور بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر طلعت نے رضا سے مصافحہ کیا اور ساتھ ہی کہا کہ ٹھیک ہے چھوٹو! آپ جاؤ۔ میں کر لیتا ہوں۔ یہ ہوگیا کام آپ کا۔

رضا نے ڈاکٹر طلعت کے ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی میں اُڑسی ہوئی انگوٹھی پر نگاہ ڈالی اور گرم جوشی سے ''ٹھیک ہے بھائی کہا''۔ اور مجھے سلام کر کے دفتر سے باہر نکل گیا۔

اب ڈاکٹر طلعت میرا دوست، میرے سامنے بیٹھا تھا۔ ہاں بھئی جگر! خیر سے آنا ہوا؟ تُو تو کلینک سے اُٹھا ای نہیں کبھی۔ پیسوں والی مشین۔ میں نے بے تکلفی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ جی کچھ خاص کام ہوتے ہیں جن کے لئے اُٹھنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر طلعت نے جواب دیا۔

حکم؟ اگر کوئی میرے لائق ہے تو۔ میں نے پوچھا۔

جی، مس واسطی کا کیس ہے آپ کے پاس تو فیس ادا کرنے حاضر ہوا تھا۔ اُن کے آگے شوہر بیٹھا تھا کہ پیر صاحب یار ہیں اپنے۔ سفارش بھی کروں گا۔ بس اسی لئے حاضر ہوا تھا۔ ڈاکٹر طلعت نے شوخ سی مسکراہٹ کے ساتھ وجہِ آمد بیان کی۔

اوہ۔ تو وہ آپ کی خاص مریضہ ہیں۔ میں نے کہا۔

اجی۔ مریض تو ہم ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ہوں۔ میں نے اُس کے ہاتھ کی چھنگلی میں اُڑسی ہوئی انگوٹھی کو دیکھا۔ یہ تو وہی انگوٹھی تھی۔ تین نگ والی۔ جو...... جو رباب کے ہاتھ میں تھی۔ معاملہ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ میں نے جھٹ سے پوائنٹ مارا۔ اور آپ کے ڈاکٹر کا نام رباب ہے شاید۔ مریض صاحب۔

ڈاکٹر طلعت کرسی پر اُچھلا اور حیرانی سے بولا۔

تمہیں کیسے پتا یار؟

بس جی پھر ہم پیر کا ہے کے۔ جو یہ بھی پتا نہ چلے۔ میں نے مزاح کا رنگ بھر کر بات کا بوجھ ہلکا کیا۔ ویسے یہ انگوٹھی تو زنانہ لگتی ہے آپ کیوں اُڑسے پھرتے ہیں اِسے؟ میں نے انگوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر طلعت نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ یہ۔ وہ۔ نگ ایک چینج کروانا تھا۔ آپ کی بھابی کی تھی۔

اوہو۔ بھابی کے تابعدار۔ ہمارے سامنے بننے کی کوشش نہ کرو بھئی۔ میں نے کہا۔

او جی آپ سے پھر کیا چھپا ہے پیرو مُرشد۔ طلعت نے کہا۔

یار! وہ رضا نے بھی دیکھ لی ہے تیرے ہاتھ میں انگوٹھی۔ پرابلم ہو سکتی ہے؟ میں نے فکرمندی سے کہا۔

نہیں، نہیں۔ یہاں پرابلم نہیں ہوتی۔ طلعت بے فکری سے بولا۔ او۔ اوہ۔ میں نے بھی کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔ خیر۔ سناؤ تم کیا لو گے؟ کافی یا جُوس!

☆☆☆☆

آپ نے اچھی طرح یاد تو کر لیا نہ۔ جو کچھ کورٹ میں کہنا ہے مس واسطی! میں نے مس واسطی سے پُوچھا۔

جی ہاں مگر۔ نوشیروان صاحب کورٹس کو اچھے سے فیس تو کر لیں گے نہ؟ مس واسطی نے میرے ایسوسی ایٹ بارے تحفظات کا اظہار کیا۔

او۔ ہو۔ آپ فکر نہ کریں۔ وہ ریسنٹ کورٹس میں بہت کام کر چکے ہیں۔ ماہر ہیں۔ خیر ابھی تو ایک گھنٹے بعد آپ لوگوں کو گواہی کے لئے جانا ہے۔ میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ہاں۔ مس واسطی مجھے آج یاد آیا کہ آپ کے بھائی رضا کو میں نے کہاں دیکھا تھا۔ دو سال پہلے اسے ہم نے ریسپشن پر رکھا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ شیخ عمیر صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے رکھ لیا ہے۔ اٹینڈنٹ کام سیکھ جائے گا تو منیجر بنا دیں گے۔ مگر دو گھنٹے بعد موصوف چلے گئے تھے کہ بورنگ کام ہے۔ اور بعد میں بھی اکثر بے کار ہی پائے گئے۔ مس واسطی! آج کل کیا کر رہا ہے رضا؟ میں نے پوچھا۔

جی۔ ٹھیک فرمایا آپ نے کرتا تو کچھ نہیں مگر شکر ہے خدا کا، چور ''ڈکیت'' تو نہیں بن گیا۔ کیا ہے جو کچھ نہ کرے ہمیں کسی مصیبت میں تو نہیں ڈالتا۔ گھر کے اور ہمارے چھوٹے موٹے کام کر دیتا ہے۔ ''نظام چل رہا ہے''۔ مس واسطی نے کہا۔ ہاں، جی ہاں۔ میرے منہ سے بے دھیانی میں نکلا اور ساتھ ہی سوچ آئی۔ ہاں کچھ بہنیں بھائیوں کو ''ڈکیت'' بنا دیتی ہیں اور کچھ بہنوں کی وجہ سے بھائی ''ڈکیت'' بننے سے بچ جاتے ہیں۔ ''نظام چل رہا ہے''۔

★O★

ایک شاطر وکیل کا عجیب قصہ۔ وہ اپنی مہارت اور قانونی اصطلاحوں کے ذریعے اپنے مؤکلوں کو موت کے منہ سے نکال لیتا تھا۔

شاطر

☆ صداقت حسین ساجد
0300-6385915

معروف فوج داری وکیل رانا گلزار نے ناشتے کے دوران میں اخبار کے پہلے صفحے پر نظر دوڑاتے ہوئے افسوس سے ''چچ...... چچ'' کی آوازیں نکالیں اور سر اوپر کیے بغیر مزید کافی لینے کے لیے اپنا خالی کپ ملازمہ کی طرف بڑھایا۔ ملازمہ ناہید نے پاس آ کر اس کے کپ میں کافی انڈیلی۔ اس دوران میں اس کی نظر اخبار کی ایک شہ سرخی پر پڑ گئی اور اسے گویا اپنا نامکمل مباحثہ ایک بار پھر شروع کرنے کا بہانہ مل گیا۔

''یہ سرخی دیکھی آپ نے...... جناب!''

اس نے ہاتھ آگے کر کے اس نمایاں سرخی پر اپنی خوب صورت مخروطی انگلی رکھی۔ رانا گلزار نے وہ سرخی پڑھی۔

''پُراسرار خدا ترس اور سخی ایک بار پھر حرکت میں آ گیا۔''

ناہید اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ اس نامعلوم شخص نے ایک بار پھر پانچ خیراتی اداروں کو اپنی شناخت ظاہر کیے بغیر دس دس لاکھ روپے دیے ہیں۔''

اتنا کہہ کر وہ رانا گلزار کی طرف دیکھ کر مشفقانہ انداز میں مسکرائی۔

''دیکھا...... جناب! میں ٹھیک کہتی ہوں کہ اس دنیا میں اچھے لوگ بہر حال تعداد میں زیادہ ہیں...... نیکی

بدی پر غالب ہے۔''

وہ خاموش ہوئی، تو رانا گلزار نے بدمزگی کی حالت میں تیزی سے وہ خبر پڑھی۔ تاہم اس کی بدمزگی کی وجہ ملازمہ ناہید کی بحث اور دلائل نہیں تھے، جسے وہ اکثر سمجھایا کرتا تھا کہ نیکی اور بدی اس دنیا کے ترازو کے دو پلڑے ہیں اور اکثر اس کے بیچ میں توازن قائم رہتا ہے۔ یوں دنیاوی نظام چلتا ہے۔ دونوں طاقتیں لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں ہی اس دنیا کا اہم حصہ ہیں۔ یوں شاید رانا گلزار اپنے پیشے کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا، کیوں کہ وہ ایسے ملزموں کے وکیل صفائی کی حیثیت سے مقدمات لڑنے میں خصوصی شہرت رکھتا تھا جن کے بارے میں قوی تاثر پایا جاتا تھا کہ وہ واقعی مجرم ہیں اور انھیں ضرور سزا ہو جائے گی، لیکن رانا گلزار انھیں صاف بچا لیتا تھا۔

وہ کافی کا کپ میز پر رکھتے ہوئے ناہید سے مخاطب ہوا۔

''تمہیں کبھی یہ خیال آیا کہ یہ پُراسرار خدا ترس اور سخی انسان جس کی نیکی اور دریا دلی کی تم اتنی معترف ہو، حقیقت میں شاید کچھ اور مقاصد رکھتا ہو؟ اس کی فراخ دلانہ خیرات کا مقصد محض غریبوں کی مدد کرنا نہ ہو؟''

''کچھ اور مقاصد ......!!!'' ناہید نے حیرت سے دہرایا۔ ''یوں رقم خرچ کرنے کے اور مقاصد بھلا کیا ہو سکتے ہیں؟''

''شاید اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ ہو...... شاید کوئی احساسِ جرم ہو، جو اسے یوں رقم لٹانے پر مجبور کرتا ہو...... یا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یوں وہ اصل میں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہو۔''

''آپ منفی انداز میں ہی کیوں سوچتے ہیں؟'' ناہید نے ترحم آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہاں منفی انداز میں سوچ لیا؟''

''یہ کوئی نیک انسان بھی تو ہو سکتا ہے، جو واقعی خلوصِ دل سے غریبوں کی مدد کرنا چاہتا ہو...... یہ ان خبیثوں جیسا نہیں ہے......''

''کن خبیثوں کی بات کر رہی ہو؟''

اس نے ایک اور خبر کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ نے یہ خبر پڑھی...... اس میں ایک خاتون اور اس کے بچوں کے سفاکانہ قتل کے بارے میں بتایا گیا ہے۔''

اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا اور رانا گلزار کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔

''میری تو خواہش ہے کہ پولیس اگر اس نوجوان خاتون اور اس کے معصوم بچوں کے قاتل کو گرفتار کر لے، تو اسے وہ بھرے بازار میں کھڑا کر کے گولی مار دیں اور پھر اس کی لاش کو یوں نذرِ آتش کریں کہ جس طرح ہندو لوگ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔''

''یہ بھی تو ممکن ہے کہ پولیس جس شخص کو پکڑے...... وہ اصل میں بے گناہ ہو؟'' رانا گلزار نرمی سے بولا۔

''کیا مطلب؟''

''قانون کے مطابق جب تک کسی کا جرم ثابت نہ ہو جائے، اس وقت تک اسے بے گناہ ہی سمجھا جاتا ہے...... بے گناہوں کو سزا سے بچانے کے لیے ہی شک کا فائدہ دینے کا قانون بنایا گیا ہے...... سزا صرف اسی وقت دی جاتی ہے جب ہر شک و شبہ سے بالاتر ہو کر جرم ثابت ہو جائے...... ورنہ! ان کے شہری اور انسانی حقوق متاثر ہوتے ہیں...... انسانی حقوق کی پامالی ہوتی ہے۔''

''آپ کون سے انسانی حقوق کی بات کر رہے ہیں؟'' ناہید کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''یہی کہ کچھ انسانوں کو یہ حق دے دیا جائے کہ وہ دوسرے انسانوں کو قتل کر سکیں...... خواتین کی عزت لوٹ سکیں...... اکثر مجرم جب پکڑے جاتے ہیں، تو سب کو پتا ہوتا ہے کہ یہ مجرم ہیں، لیکن چند

شاطر وکیل عدالت میں ایسے ایسے چکر چلاتے ہیں...... ایسے ایسے قانونی نقطے نکالتے ہیں...... حقائق کو یوں توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں کہ عدالت مجبور ہو کر انھیں رہا کر دیتی ہے......''

پھر گویا اچانک اسے یاد آیا کہ اس کا مالک بھی تو ایک وکیل ہے، اس کا لہجہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔

''معاف کیجیے گا...... جناب! میرا خیال ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی بولنے لگی ہوں۔''

رانا گلزار بے پروائی سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔

وہ یہ بات پہلی بار نہیں سن رہا تھا۔ بارہا اس سے یہ بات کہی گئی تھی۔ سب سے زیادہ بار تو اس نے یہ بات اپنی بیوی کے منہ سے سنی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو کافی عرصہ پہلے طلاق دے چکا تھا۔ وہ تو جانے کتنی بار اس کی پیشہ ورانہ قابلیت پر بڑی بے رحمانہ تنقید کر چکی تھی۔ وہ موت کے منہ میں جاتے ہوئے مجرموں کو قانون کی گرفت سے یوں نکال لیتا تھا جیسے مکھن میں سے بال نکالا جاتا ہے۔ اسے اس کی بیوی اس کی قابلیت نہیں بلکہ خباثت اور شیطانیت قرار دیتی تھی۔ وہ اس کی کمائی کو حرام کی کمائی سمجھتی تھی۔ اپنے بیٹے کا خرچہ وہ باقاعدگی سے بھیج رہا تھا اور اسے اس کی سابقہ بیوی نے کبھی بھی قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔

وہ ناہید کو خجالت زدہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں تمہیں ایک بات بتاؤں...... اگر تمہارا یہ پُراسرار سخی بھی سامنے آ گیا اور معلوم ہوا کہ وہ اصل میں ایک ایسا شقی القلب قاتل ہے، جو بڑی سفاکی سے کئی افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے، تو ضرورت پڑنے پر میں عدالت میں اس کی وکالت کروں گا...... اگر اس نے میری خدمات حاصل کرنا چاہیں، تو میں اس کا بھی وکیل صفائی بن جاؤں گا۔''

☆☆☆

رانا گلزار ایک پوش علاقے کی ایک شان دار عمارت میں واقع اپنے آراستہ و پیراستہ دفتر میں داخل ہوا، تو اس کی سیکرٹری نے فون پر موصول ہونے والے ایک پیغام کو تحریری صورت میں اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''یہ شخص متوقع مؤکل لگتا ہے...... غالباً اسے آپ کی خدمات کی ضرورت ہے...... پولیس نے اس کے ساتھی کو آج اس واردات کے الزام میں گرفتار کیا ہے، جو پچھلی رات کو ہوئی تھی...... جس میں جمیل خان کی بیوی اور دو بچوں کو قتل کر دیا گیا تھا...... بچوں کی عمریں سات اور چار سال تھیں۔''

رانا گلزار نے کاغذ کو دیکھا۔ فون کرنے والے کا نام جانا تھا۔ اسے اپنے ساتھی منظور حسین کے لیے اس کی قانونی خدمات کی ضرورت تھی۔ ذہن پر زور دینے کے باوجود گلزار کو یاد نہ آیا کہ وہ اس نام کے کسی شخص کو جانتا ہے۔ اس نے اپنا سر جھٹکا اور خود کو سمجھایا کہ وہ یقیناً ایک کامیاب وکیلِ صفائی ہے، لیکن شہر کے سارے مجرموں سے واقف تو نہیں ہو سکتا ہے۔ پھر اس نے دل ہی دل میں تصحیح کی کہ اسے سوچتے وقت بھی ان کے لیے 'مبینہ مجرموں' کی اصطلاح استعمال کرنی چاہیے، کیوں کہ اس کے اپنے فلسفے کے مطابق جب تک کسی کو تمام شکوک و شبہات سے بالاتر ہو کر مجرم ثابت نہ کر دیا جائے، اس وقت تک اسے مجرم نہیں کہا جا سکتا۔

یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنی سیکرٹری مس نشا کو دیکھ کر سر ہلایا اور دھیمی آواز میں بولا۔

''ٹھیک ہے...... میں اس سے رابطہ کر لوں گا۔''

☆☆☆

رانا گلزار نے اپنے سامنے میز کی دوسری طرف

بیٹھے منظور حسین کو دیکھا اور پھر اپنے آگے رکھی فائل کا جائزہ لیا۔ پھر کہا۔

''مجھے امید نہیں ہے کہ جج تمہاری ضمانت منظور کرلے گا......''

''وہ کیوں......''

''تمہیں اس بات کا علم نہیں ہے؟''

''کس بات کا؟''

''تم کس طرح کے ہو؟''

''مجھے تو نہیں پتا...... آپ بتا دیں۔''

''بڑے بھولے بن رہے ہو...... تمہارا ریکارڈ خاصا شرم ناک ہے...... تم اٹھارہ بار گرفتار ہوئے ہو...... دو بار تمہیں سزا ملی ہے...... ہر طرح کے الزام میں تم گرفتار ہو چکے ہو...... غیر قانونی اشیا اور منشیات فروشی...... زبردستی لوگوں کے گھروں میں داخل ہونے اور قتل کی کوشش تک کے الزامات ماضی میں تم پر لگ چکے ہیں...... اس ریکارڈ کو مدنظر رکھتے ہوئے ضمانت ہونا مشکل ہے۔''

''کیوں مشکل ہے بھئی؟'' منظور حسین نے قدرے جارحانہ سے لہجے میں کہا۔ ''میں اس شہر میں پیدا ہوا تھا...... میرے تمام کاروباری رابطے یہیں ہیں...... جن جرائم میں مجھے سزا ہوئی تھی...... وہ معمولی قسم کے تھے...... میرا مطلب سمجھ رہے ہیں ناں!''

اس نے رانا گلزار کو آنکھ ماری۔ پھر بولا۔

''میں سب کچھ چھوڑ کر کہیں بھاگ تھوڑا ہی جاؤں گا۔''

پھر وہ شاطرانہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔

''اس کے علاوہ وہ میرے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے...... میرے پاس جائے وقوعہ سے اپنی غیر حاضری کا ایسا ٹھوس ثبوت موجود ہے جسے کوئی بھی جھٹلا نہیں سکتا......''

اس ثبوت کے لیے اس نے ایک فحش سی تشبیہ بھی استعمال کی۔ پھر بولا۔

''جس وقت جمیل خان کی بیوی کو اس کے اعمال کی سزا ملی...... اس وقت میں شہر کے ایک دور دراز حصے میں موجود تھا...... دو خواتین اس کی حلفیہ گواہی دینے کو تیار ہیں۔''

وہ خاموش ہوا، تو کئی لمحوں تک رانا گلزار اپنے متوقع مؤکل کو ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

''ہمیں ذرا کھل کر بات کرنا ہوگی...... تمہیں پتا ہے کہ پولیس نے تمہارا نام قرعہ اندازی میں نکال کر نہیں پکڑا...... سب کو پتا ہے کہ مقتولہ کا شوہر ایک طرح سے تمہارا کاروباری حریف تھا...... وہ دوسری مافیا کا بندہ تھا...... وہ افغانی تھا، لیکن دو تین سال پہلے اس نے پاکستانی شہریت حاصل کر لی تھی...... پولیس کے بقول منشیات کی تجارت میں وہ تمہارے مقابلے میں کام شروع کر کے تمہیں کروڑوں کا نقصان پہنچا رہا تھا...... اس کے علاوہ پولیس کے پاس ایک گواہ بھی موجود ہے......''

''گ...گواہ...... کون سا گواہ اور کس چیز کا گواہ؟''

''جس نے تمہیں اس عمارت میں داخل ہوتے دیکھا تھا...... جہاں مقتولہ رہائش پذیر تھی۔''

''یہ...... یہ...... یہ سب بکواس ہے...... یہ ناممکن ہے کہ کوئی مجھے اس وقت دیکھتا......''

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ گیا ہے۔ وہ خاموش ہو گیا۔ وہ جوش میں سب کچھ نہ چاہتے ہوئے بھی بتا گیا تھا، لیکن اس نے خود کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھا۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جیل کے اس ملاقاتیوں والے کمرے میں اس وقت ان دونوں کے سوا کوئی اور موجود نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر وہ خباثت بھرا ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔

''یہ بات میرے اور صرف آپ کے درمیان

میں رہنی چاہیے۔''

''وکیل اور مؤکل، ڈاکٹر اور مریض کے درمیان میں ہر بات راز ہی ہوتی ہے۔''

''بالکل ٹھیک۔'' منظور حسین نے طمانیت سے سر ہلایا اور بولا۔ ''جب میں اس عمارت میں داخل ہوا تھا، تو لابی اور لفٹ خالی تھیں اور میری واپسی پچھلی طرف کے ہنگامی زینے کے راستے سے ہوئی تھی...... یہ کس طرح ممکن ہے کہ کسی نے مجھے اندر جاتے ہوئے دیکھا ہو؟''

''خیر! تمہاری اس بات سے میرا ایک شک تو یقین میں بدل گیا......''

''کک...... کک...... کون سا شک؟''

''وہ شک یہ تھا کہ قتل تم نے ہی کیا تھا۔'' رانا گلزار خشک لہجے میں بولا۔ ''اب میں تم سے صرف دو سوال اور پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''جی...... پوچھیے!''

''ان میں سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''کک...... کک...... کیسا کیوں کیا؟'' منظور نے حیرت سے منہ پھاڑتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ تم نے جمیل خان کی بیوی اور اس کے کم سن بچوں کو کیوں قتل کیا؟ ان کا تو منشیات کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تھا...... انھیں قتل کر کے تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوا؟''

''میں نے جمیل خان کو یہ سبق دیا ہے...... وہ یہی زبان سمجھتا ہے...... یہ افغانی خود بھی تو یہی کرتے ہیں...... چناں چہ میں نے سوچا کہ آج کل جب کہ جمیل خان ایک بہت بڑی کھیپ کی خریداری کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا ہے، تو کیوں ناں اسے اس کی زبان میں سبق دے دیا جائے۔''

پھر اس نے انگلی میں دبی سگریٹ کا ایک کش لیا اور طمانیت بھرے لہجے میں بولا۔

''جمیل خان کو اب صحیح طور پر پتا چلے گا کہ مجھ سے الجھنے والے کو کتنا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔''

''ٹھیک ہے!'' رانا گلزار نے سر ہلایا۔ ''میرا دوسرا سوال میری فیس کے بارے میں ہے...... کیا تم میری فیس ادا کرنے کے قابل ہو؟ تم نے کسی سے فرمائش کی تھی کہ شہر کے بہترین وکیل صفائی سے تمہارا رابطہ کرایا جائے...... تمہیں پتا ہی ہوگا کہ بہترین چیزیں سستی اور آسانی سے نہیں ملتیں۔''

''ہاں...... مجھے پتا ہے۔'' منظور نے قہقہہ لگایا۔

''آپ فیس بتایئے۔''

''پچاس لاکھ تو میں پیشگی لوں گا...... باقی مقدمہ کا فیصلہ ہونے کے بعد پچاس لاکھ لوں گا۔''

''ٹھیک ہے...... کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' منظور نے فیس سن کر ذرا بھی پریشان ہوئے بغیر کہا۔ ''میں برے وقت کے بارے میں جانتا ہوں کہ یہ کبھی بتا کر نہیں آتا اور ویسے بھی ہمارا جو دھندہ ہے...... اس میں تو پتا ہی نہیں چلتا، اس لیے میں اس کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں...... میں کچھ رقم ایک طرف رکھتا رہا ہوں...... وہ اچھی خاصی رقم ہے...... آپ کی فیس ادا کرنے کے بعد بھی میرے پاس اچھی خاصی رقم بچ جائے گی۔''

''ہوں ں ں!'' رانا گلزار نے ہنکارہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارا دردسر ہے۔''

''اور ہاں...... مجھے ایک بات یاد آگئی۔''

''کیا؟''

''مجھے اچھی طرح یاد ہے...... کچھ عرصہ پہلے آپ نے علی نواز نامی ایک شخص کا مقدمہ لڑا تھا...... اس پر تشدد اور قتل کا الزام تھا...... عام خیال یہی تھا کہ اسے موت کی سزا ہو جائے گی، لیکن آپ نے اسے بچالیا تھا۔''

''تمہیں اس مقدمہ کے بارے میں کہاں سے

پتا چلا؟"

"اصل میں علی نواز میرا دوست تھا، اس لیے میں اس مقدمے کی تفصیل میں دلچسپی لیتا رہا تھا...... آپ نے اس کی رہائی کے بعد اس کے لیے کچھ ایسے انتظامات کیے تھے کہ بعد میں خفیہ پولیس والے اسے کسی اور چکر میں نہ دھر لیں...... آپ نے اس کے لیے نئے کاغذات اور پاس پورٹ وغیرہ کا انتظام کر کے اسے خاموشی سے ملک سے باہر نکال دیا تھا۔"

"ممکن ہے...... میں نے ایسا کیا ہو۔" رانا گلزار نے مبہم لہجے میں کہا۔

"ممکن نہیں...... بلکہ ایسا ہی ہوا ہے۔"

"اچھا! اس بات کو چھوڑو...... تم اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے لیے بھی ایسے انتظامات کر دیں۔"

"لیکن تم تو کہہ رہے تھے تم اس شہر کو چھوڑ کر کہیں نہیں بھاگ سکتے ...... یہاں تمہارے کاروباری رابطے ہیں اور......"

منظور نے اس کی بات کاٹی اور کہا۔

"میں ہمیشہ کے لیے بھاگ جانے کی بات تو نہیں کر رہا ہوں۔"

"پھر؟"

"مجھے عارضی طور پر تو انڈر گراؤنڈ ہونا ہی پڑے گا...... اگر میرے آدمی مقدمے کے دوران میں ہی جمیل خان کا بھی بندوبست کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہو سکا، تو رہائی کے بعد میرا کچھ مدت کے لیے نکل جانا ہی اچھا ہو گا، کیوں کہ جمیل خان کوئی نہ کوئی جوابی کارروائی ضرور کرے گا...... میرے نکل جانے کے کچھ عرصہ کے بعد جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے، تو میں واپس آ جاؤں گا۔"

"یہ کام بھی ہو جائے گا...... میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن......"

"آپ بے فکر رہیں...... میں ان انتظامات کے بدلے میں بھی آپ کو بہت اچھی رقم دوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی۔

"ان انتظامات کا معاوضہ پچاس لاکھ روپے ہو گا۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے...... آپ میرا اچھی طرح خیال رکھیں...... میں آپ کا اچھی طرح خیال رکھوں گا۔"

☆☆☆

منظور کے خلاف جو مقدمہ استغاثہ نے عدالت میں پیش کیا تھا، وہ بہت کمزور بنیادوں پر استوار تھا۔ شہادتیں اکٹھی کرنے کے سلسلے میں بالکل جدوجہد نہیں کی گئی تھی۔ کوئی بھی قابل وکیل ان کے بخیے ادھیڑ سکتا تھا۔ سارا مقدمہ اصل میں ایک ہی شخص کی گواہی پر لٹک رہا تھا۔ وہ شخص اس عمارت کا رات کا سیکورٹی گارڈ تھا جس میں جمیل خان اور اس کے بچوں کو قتل کیا گیا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ وقوعے کی شب اس نے منظور کو لابی سے لفٹ میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ اس کا نام مبشر خان تھا۔

رانا گلزار نے سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ ایک جاسوسی کا شوق رکھنے والے بندے کی خدمات حاصل کی تھیں کہ وہ مبشر خان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرے۔ مقدمے کی سماعت شروع ہونے سے ایک دن پہلے ہی جاسوس کی رپورٹ رانا گلزار کی میز پر پہنچ چکی تھی۔ اس کا مطالعہ کر کے رانا گلزار بہت مطمئن ہوا اور ہلکی ہلکی سیٹی بجانے لگا۔

مقدمے کی سماعت کی تاریخ جیسے جیسے قریب آتی چلی گئی، منظور سے گفتگو کرنا یا اسے کچھ سمجھانا مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا۔ جیل میں بند رہ کر اس کی

چڑچڑاہٹ اور بدمزاجی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ رانا گلزار کی توقع کے عین مطابق جج نے منظور حسین کی ضمانت منظور نہیں کی تھی۔ دوسرا منظور کو اس کے آدمیوں نے بتایا تھا کہ جمیل خان باہر سے واپس آنے کے بعد چھپ گیا تھا۔ یوں اسے نشانہ بنانا مشکل ہو گیا تھا، لیکن منظور کے بارے میں زیرِ زمین دنیا میں یہ خبر گرم تھی کہ اس کی موت کے احکامات جاری کیے جا چکے ہیں۔

تاہم منظور نے جیل کے ملاقاتیوں والے کمرے میں ایک تازہ ترین ملاقات میں رانا گلزار سے کہا تھا۔

"مجھے ان خبروں پر کوئی تشویش نہیں ہے......"

"وہ کیوں؟"

"یہاں سے میں رہا ہو جاؤں، تو مجھے صرف کچھ عرصے کے لیے کسی اچھے سے مقام میں روپوشی کی ضرورت ہو گی...... جیسے ہی جمیل خان سامنے آئے گا اور ذرا غیر محتاط رہنے لگا...... میرے آدمی اس سے نمٹ لیں گے۔"

"تم جمیل خان کے ساتھ کیا کرتے ہو...... یہ تمہارا معاملہ ہے......" رانا گلزار نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں تو محض تمہارا قانونی دفاع کر رہا ہوں۔"

"آپ کو میرے بیرون ملک سفر کے انتظامات بھی کرنے ہیں...... جس کے لیے میں آپ کو پچاس لاکھ روپے دوں گا۔"

"مسئلہ صرف اس سیکورٹی گارڈ کی گواہی کا ہے...... ورنہ! استغاثہ کے مقدمے میں کوئی جان نہیں ہے۔"

"اس کرائے کے ٹٹو کا بھی کوئی بندوبست کر دیتے ہیں...... اسے کوئی 'حادثہ' بھی پیش آ سکتا ہے...... اگر انسان رقم خرچ کرنے کی استطاعت رکھتا ہو اور کام کے لوگوں کو جانتا ہو، تو ہر طرح کے کام ہو جاتے ہیں۔"

''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ایسی کوئی حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہے...... وہ جب کٹہرے میں آئے گا، تو میں اس سے خودنمٹ لوں گا۔'' رانا گلزار ذرا سخت لہجے میں بولا۔

☆☆☆

عدالت کا منظر تھا۔ وکیل استغاثہ سرکاری وکیل تھا، اس لیے اس کی اس مقدمے میں دلچسپی بالکل نہیں تھی۔ وہ تو خانہ پُری کر رہا تھا۔ اس نے جو چند سوال مبشر سے کیے تھے، وہ بس یہی ظاہر کر رہے تھے کہ جس شخص کو قتل والی رات مبشر نے دیکھا تھا، وہ منظور حسین تھا۔ دو منٹ کے بعد ہی وکیل استغاثہ نے مبشر کو فارغ کر دیا تھا۔ اب باری رانا گلزار کی تھی۔ وہ اپنے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر کٹہرے کی طرف بڑھا۔

رانا گلزار بارعب انداز میں چلتا ہوا گواہوں کے کٹہرے تک گیا اور مبشر خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

''تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ جمیل خان کی بیوی اور ان کے بچوں کے قتل کی شب تم کہیں باہر سے لابی میں واپس آئے، تو تم نے ایک شخص کو لفٹ میں داخل ہوتے دیکھا......''

''بالکل ایسا ہی ہے۔''

''بعد میں تم نے میرے مؤکل منظور کو اس شخص کی حیثیت سے شناخت کر لیا...... یہ درست ہے؟''

''درست ہے۔''

رانا گلزار چند لمحے میانہ قامت، ادھیڑ عمر اور فربہی مائل سیکورٹی گارڈ کو یک ٹک دیکھتا رہا۔ اس کے یوں مسلسل تکنے سے وہ کچھ نروس دکھائی دینے لگا۔ رانا گلزار جج کو یہی دکھانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ جج اس کے پھولے پھولے سے پپوٹے، اس کے لباس کی شکنیں اور اس کی پھولی پھولی ناک کی نوک پر دکھائی دینے والی سرخ سرخ باریک نسوں کے جال کو بھی دیکھ لے۔ وہ اس کی شخصیت کا جو تاثر ابھارنا چاہتا تھا، اس کے لیے یہ تمام نشانیاں اہم تھیں۔

''اور تم اس وقت کہاں سے واپس آ رہے تھے...... مبشر!'' رانا گلزار نے بظاہر نرم، لیکن زہریلے لہجے میں پوچھا۔

سیکورٹی گارڈ کا چہرہ کچھ ایسا تھا کہ، جو صرف اور صرف اس کی والدہ ہی کو اچھا لگ سکتا تھا۔ رانا گلزار کا سوال سن کر اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار ظاہر ہوئے اور وہ ذرا سا ہکلا کر بولا۔

''م...... م...... میں باتھ روم سے واپس آ رہا تھا۔''

''واہ...... واہ...... کیا بات ہے۔'' رانا گلزار نے اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ''رات کا وقت تھا اور تم اس عمارت کی لابی میں حفاظتی ڈیوٹی پر مامور واحد گارڈ تھے...... اس کے باوجود جب تمہارا جی چاہا...... تم اپنی ڈیوٹی کی جگہ چھوڑ کر چلے گئے...... بہت خوب! تمہارے تو خوب مزے ہیں...... تمہیں تو شاباش دی جانی چاہیے کہ اتنی خوب صورتی سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہو...... دوسروں کے لیے تم ایک رول ماڈل کی حیثیت سے رکھتے ہو...... کیا بات ہے!''

رانا گلزار کے لہجے کا زہریلا پن اسے کاٹ رہا تھا۔

''میں جی چاہنے پر نہیں گیا تھا......''

''پھر کیوں گئے تھے؟''

''میں فطری تقاضے سے مجبور ہو کر گیا تھا......''

''تمہارا فطری تقاضا بھی بڑا سیانا ہے......''

''کیا مطلب؟''

''مطلب تو بالکل واضح ہے...... جب بھی تم ڈیوٹی پر موجود ہوتے ہو...... تمہارا فطری تقاضا تمہیں ستانے لگتا ہے...... جب بھی تمہاری ڈیوٹی شروع ہوتی ہے، تو تمہارا یہ فطری تقاضا تم سے بار بار اس بات کا اصرار کرنے لگتا ہے کہ تم باتھ روم جاؤ۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''اگر ایسی کوئی بات نہیں ہے، تو پھر کیسی بات ہے؟''

''میں جی چاہنے پر نہیں، فطری تقاضے سے مجبور ہو کر گیا تھا...... ویسے میں بار بار ایسا نہیں کرتا...... میرا مطلب ہے کہ میں بار بار اپنی ڈیوٹی کی جگہ چھوڑ کر نہیں جاتا، لیکن کبھی کبھی ضرورت بہر حال انسان کو مجبور کر دیتی ہے۔''

''تمہیں یقین ہے کہ تمہارے جانے کی وجہ کچھ اور نہ تھی......''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''مبشر! مثلاً کوئی بوتل وغیرہ......؟'' رانا گلزار نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ اور پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

''ن...... ن...... نہیں...... نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ جلدی سے ایک نظر جج کو دیکھ کر بولا۔

''پھر کیسی بات ہے؟''

''میں واقعی باتھ روم گیا تھا۔''

''زیادہ شراب نوشی بہت لمبے عرصے تک تمہارا مسئلہ رہی ہے...... مبشر!'' رانا گلزار ملائمت سے بولا۔ ''اس کی وجہ سے تمہیں کئی ملازمتوں سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

اس سے پہلے کہ مبشر کوئی جواب دیتا، وکیل استغاثہ جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا، وہ بول اٹھا۔ آخر اسے بھی تو اپنی فیس حلال کرنا تھی۔

''مجھے اعتراض ہے جنابِ عالی!''

''میرے فاضل دوست کو کس بات پر اعتراض ہے؟'' رانا گلزار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں جمیل خان کے خاندان کے قتل کا مقدمہ زیرِ سماعت ہے جب کہ وکیل صفائی گزری باتوں کو دہرا کر معزز عدالت کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔''

یہ سن کر جج نے رانا گلزار کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ یہ دیکھ کر رانا گلزار نے سر جھکا کر کہا۔

''جنابِ عالی! میرے اس سوال کا تعلق بھی زیرِ سماعت مقدمہ سے ہے...... آگے چل کر اس کا ثبوت بھی آپ کو مل جائے گا۔''

یہ سن کر جج نے سر ہلا کر کہا۔

''اعتراض مسترد کیا جاتا ہے...... آپ اپنے سوالوں کا سلسلہ جاری رکھیں۔''

''بہت بہت شکریہ...... جنابِ عالی!'' رانا گلزار نے سر کو خم دے کر کہا اور ایک بار پھر وہ مبشر کی طرف مڑا۔ ''امید ہے کہ اب تمہیں بھی میرے اس سوال کا جواب دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''میں آپ کا سوال بھول گیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... میں دوبارہ دہرا دیتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر رانا گلزار نے سوال دہرا دیا۔ ''زیادہ شراب نوشی بہت لمبے عرصے تک تمہارا مسئلہ رہی ہے...... مبشر! اس کی وجہ سے تمہیں کئی ملازمتوں سے ہاتھ دھونے پڑے ہیں...... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''ن...... ن...... نہیں...... میرا مطلب یہ ہے کہ اب مجھے شراب نوشی کا عارضہ لاحق نہیں ہے...... میں نے علاج کرا لیا ہے...... اب میں بالکل نہیں پیتا ہوں...... ہفتے میں دو بار میں متعلقہ ہسپتال میں معائنے کے لیے بھی جاتا ہوں۔'' مبشر نے مضطرب لہجے میں کہا۔

رانا گلزار اس کا جواب سن کر چند کاغذات الٹتے پلٹتے ہوئے کہا۔

''لیکن میری معلومات کے مطابق اس ہفتے کے

دوسرے معمول کے معائنے کے لیے تم وہاں نہیں پہنچے تھے.....کیا تم اس وقت بھی باتھ روم میں تھے؟''

مقدمے کی تمام تر سنگینی اور موضوع کی تمام تر سنجیدگی کے باوجود اس موقع پر عدالت میں زوردار قہقہہ پڑا۔ جج کو سختی سے انھیں روکنا پڑا۔ مبشر کا چہرہ خجالت سے سرخ پڑ گیا۔ وہ کچھ اور بوکھلاہٹ کے سے عالم میں بولا۔

''نن.....نن..... نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں تھی.....''

''پھر کیوں نہیں گئے؟''

''بس! میں نے ضرورت محسوس نہیں کی..... اس کے علاوہ اس دن مجھے دو تین دوسرے ضروری کام بھی کرنے تھے۔''

رانا گلزار نے اپنے مخصوص انداز میں اس کے بالکل سامنے ٹہلتے ہوئے اسے مزید بدحواس کر دیا اور نہایت پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''عین ممکن ہے کہ وہ ضروری کام یہی ہو کہ بوتل تمہارے ہاتھ لگ گئی ہو اور تمہیں اسے خالی کرنا ہو..... اس بات کا بھی امکان موجود ہے کہ قتل کی رات لابی سے غائب ہونے کی وجہ بھی بوتل رہی ہو؟''

اس سے پہلے کہ وکیل استغاثہ، رانا گلزار کے اس طرزِ عمل پر اعتراض کرتا، مبشر تقریباً چیخ اٹھا۔

''نن.....نن..... نہیں..... نہیں..... یہ جھوٹ ہے..... میں اب بالکل نہیں پیتا ہوں۔''

یہ سن کر رانا گلزار انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

''اس صورت میں مجھے عمارت کی صفائی کرنے والے تنویر نامی شخص کو گواہوں کے کٹہرے میں بلانا پڑے گا اور وہ معزز عدالت کو بتائے گا کہ تم کتنی بار اس کے ساتھ بیٹھ کر پی چکے ہو۔''

اس سوال کا مبشر کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی شکست کے ساتھ ہی استغاثہ کی شکست کے تابوت میں آخری کیل بھی جڑی گئی۔

''جنابِ عالی! مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔'' رانا گلزار نے اپنے سوالوں کا سلسلہ ختم کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

'شک کا فائدہ!'

یہ تھی وہ قانونی اصطلاح، جو اس سے پہلے بھی بار ہا بار رانا گلزار کے کام آ چکی تھی۔ یہ اس کے لیے نیا تجربہ نہیں تھا۔ وہ اس کام کا بڑا ماہر تھا۔ جج کے ذہن میں صرف شک کے چند بیج بوئے جاتے تھے۔ پھر بہترین الفاظ سے ان کی آب یاری کی جاتی تھی اور آخر کار..... جج ملزم کو رہا کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

رانا گلزار کے شاطرانہ طریقۂ کار کے آگے مبشر ڈھیر ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ایک معمولی تعلیم یافتہ اور احساسِ کمتری کا شکار انسان تھا۔ پہلی بار اس نے عدالت میں حاضری دی تھی، جہاں وہ بہت سے لوگوں کی گھورتی ہوئی نگاہوں کا مرکز تھا۔ اس کا اپنا ماضی بہت خراب کارکردگی کا حامل تھا۔ وہ بھلا ایک شاطر، کامیاب اور منجھے ہوئے فوج داری وکیل کا سامنا کیسے کر سکتا تھا۔

رانا گلزار کو یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کہ مبشر اس رات کہیں پینے پلانے گیا ہوا تھا۔ اس نے سب کی توجہ صرف اس امکان کی طرف مبذول کرا دی تھی اور مبشر کے داغ دار ماضی کو سامنے رکھتے ہوئے اتنا ہی کافی تھا۔ پھر اس کی گواہی معتبر نہیں رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس نے آدمی کو پہچاننے میں غلطی کی ہو۔

اگلی پیشی پر عدالت نے منظور حسین کو باعزت بری کر دیا تھا!

وہ شہر کے بہترین وکیل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک آزاد شہری کی حیثیت سے عدالت سے نکلا، تو ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کی ایک کثیر تعداد ان کے

استقبال کے لیے موجود تھی۔ رانا گلزار ان سب سے معذرت کرتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اپنے مؤکل کو لفٹ کی طرف لے کر چلا۔

''فی الحال ہم دونوں عدالت کے اس فیصلے پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔''

اس کے باوجود شہر کے سب سے بڑے اخبار کے رپورٹر نے بھیڑ کو چیرتے ہوئے اپنا چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

''رانا گلزار صاحب! ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ قانون کی لچک سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں آپ کا جواب نہیں..... کیا موجودہ مقدمہ میں بھی آپ نے یہی کیا ہے؟''

رانا گلزار نے لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے خوں خوار نظروں سے رپورٹر کو دیکھا اور کاٹ دار لہجے میں بولا۔

''میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا..... اور یہ میری نہیں، نظامِ انصاف کی فتح ہے، لیکن تم ایسے اخبار والوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی۔''

اتنا کہہ کر اس نے لفٹ بند کر دی تھی۔ اس دوران میں منظور کے پاس ایک شخص آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا، جو اس نے منظور کو پکڑا دیا۔ وہ بندہ اصل میں منظور کا ایک خاص آدمی تھا۔ اس سے اس نے پیسے منگوائے تھے۔ اس بیگ میں رقم تھی۔ اس آدمی پر منظور حسین کو اتنا اعتماد تھا کہ اس نے بیگ کھول کر رقم دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

☆☆☆

''ابھی اور کتنی دور جانا ہے؟'' گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے منظور حسین نے قدرے بے زاری سے پوچھا۔

''بس! اب میرا کیبن تقریباً چار کیلو میٹر دور رہ گیا ہے۔'' ڈرائیونگ کرتے ہوئے رانا گلزار نے جواب دیا۔

''آپ میرے لیے شہر کے پاس کسی جگہ چھپنے کا بندوبست نہیں کر سکتے تھے؟ خاص طور جب کہ میں آپ کو اتنا معاوضہ دے رہا ہوں۔'' منظور حسین نے شکوہ کیا۔

''تم نے فرمائش کی تھی کہ میں تمہارے لیے وہی انتظامات کر دوں، جو میں نے اس سے پہلے علی نواز کے لیے کیے تھے..... چناں چہ میں وہی کر رہا ہوں..... میرا یہ تعطیلاتی کیبن چھپنے کے لیے بہترین جگہ ہے..... دو چار روز تمہیں اس ویران مقام پر رہنا پڑے گا..... اس دوران میں، میں تمہارے لیے نئے کاغذات اور پاس پورٹ تیار کروا لوں گا..... ایک موٹر بوٹ تمہیں دوسرے ملک کے ساحل پر پہنچا دے گی..... وہاں سے کہیں بھی چلے جانا..... تمہارے لیے شان دار انتظامات ہو رہے ہیں..... تم اور کیا چاہتے ہو؟''

کچھ دیر کے بعد رانا گلزار کی مرسڈیز ایک پگ ڈنڈی پر مڑی اور آخر کار ایک کیبن کے ڈرائیو وے میں جا کر رکی۔ یہ کیبن ایک جنگل میں واقع تھا۔ لگتا ایسے تھا کہ ادھر کوئی شاذ و نادر ہی آتا ہے۔ منظور گاڑی سے اتر کر کیبن کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

''جگہ تو بری نہیں ہے..... آپ کے سوائے کسی اور کو تو اس کے بارے میں پتا نہیں ہے؟''

''نہیں..... یہ خود میری بھی خفیہ پناہ گاہ ہے۔'' رانا گلزار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے منظور حسین کا سوٹ کیس بیڈ روم میں لے جا کر رکھا اور سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

''اب تم باقی پچپن لاکھ روپے بھی نکال کر میز پر رکھ دو۔''

منظور حسین نے ہاتھ میں رقم والا بیگ پکڑا ہوا

تھا۔ وہ بیگ اس نے میز پر رکھ دیا۔ اچانک وہ چونک پڑا، کیوں کہ اس نے دیکھا تھا کہ رانا گلزار نے اپنی جیب سے ایک پستول نکال کر اس پر تان لی تھی اور کہہ رہا تھا۔

''اب تمہیں میرے ساتھ کچھ اور آگے تک سیر کے لیے چلنا ہے۔''

''یہ...... یہ...... یہ کیا مذاق ہے......!'' منظور برہمی سے بولا۔

''چلو!'' رانا گلزار پستول سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غرایا۔

شاید اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ منشیات کا اسمگلر اس کے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

پانچ منٹ کے پیدل کے سفر کے بعد وہ گھنے جنگل میں جا پہنچے۔ ایک جگہ درختوں کے درمیان میں ایک تازہ کھدا ہوا گڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ رانا گلزار نے اسے وہاں رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں تمہارا دوست علی نواز اور معاشرے کے اس جیسے کئی دوسرے ناسور دفن ہیں...... تمہارے رُوپوش ہونے کے لیے یہ ایک بہترین جگہ ہے...... یہاں کوئی بھی کبھی بھی تمہارا سراغ نہیں لگا سکے گا۔''

''کک...... کک...... کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ دنیا کی عدالت سے تو میں نے تمہیں بچا لیا، کیوں کہ اگر میں ایسا نہ کرتا، تو کوئی اور تمہیں بچا لیتا...... اب میں تمہیں اپنی عدالت میں لایا ہوں اور اس عدالت نے تمہیں موت کی سزا سنائی ہے...... جس پر میں فوری عمل کرنے لگا ہوں۔''

اتنا کہہ کر رانا گلزار نے اس کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ منظور حسین کچھ بھی نہ کر سکا۔ ایک دھماکا ہوا۔ منظور حسین کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے اور وہ سیدھا گڑھے میں جا گرا۔ اسے چیخنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

☆☆☆

اپنے گھر میں آدھی رات کو رانا گلزار سجدے میں گرا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔ آنکھیں یوں برس رہی تھیں جیسے ساون بھادوں کی بارش ہو۔ وہ سسکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اے میرے اللہ تعالیٰ! میں نظامِ انصاف کو بچانے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہوں...... میں معاوضہ لے کر اپنے موکل کو بچانے کی اپنی سی کوشش کرتا ہوں اور یوں اپنا پیشہ وارانہ فرض ادا کرتا ہوں، لیکن اس کے بعد میں ایک انسان کی حیثیت سے بھی اپنا فرض نہیں بھولتا...... میری سمجھ بوجھ کے مطابق یہ راستہ بہتر ہے...... اگر فیس لے کر میں ان کی وکالت نہیں کروں گا، تو کوئی اور وکیل اس طرح ان کا کیس لڑ کر انھیں بری کرا دے گا اور وہ تو بعد میں ایک انسان کی حیثیت سے اپنا فرض بھی ادا نہیں کرے گا...... یوں یہ لوگ مزید شر پھیلانے اور معصوم لوگوں کو اپنا نشانہ بنانے کے لیے ہمیشہ آزاد رہیں گے...... میں امید کرتا ہوں کہ میری ان حقیر سی کوششوں کو شرفِ قبولیت حاصل ہوگا۔''

وہ اٹھا اور چند لمحے خاموش رہا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں موجود الماری کی طرف بڑھا۔ اسے کھول کر اس میں سے اپنی ڈائری نکالی اور فلاحی اداروں کے کوائف دیکھ کر ان کو مناسب رقم بھجوانے کا انتظام کرنے لگا۔ وہ جو پچاس لاکھ روپے اس نے منظور حسین سے اسے اس ملک سے بھگانے کے لیے تھے، وہ اس نے فلاحی اداروں کو دینے تھے۔ یہ منی آرڈر وہ مختلف ڈاک خانوں سے بھیجتا تھا۔ یوں وہ سامنے بھی نہیں آتا تھا، لیکن ان اداروں کی مدد بھی کر دیتا تھا، اس لیے لوگوں نے اس کا نام پُراسرار خداترس اور سخی انسان رکھ دیا تھا۔

❁

اسراریات

باؤلی کے جنات

- کیا جن بھوتوں کا کوئی وجود ہے؟ اور کیا یہ کہ جن بھوت کسی کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں؟ اور کیا تعویذ گنڈوں سے اس کا علاج ممکن ہے؟

☆ نسیم لون

''اس بچے کو مولوی محمد صاحب کے پاس لے جائیں وہی اس کا صحیح علاج کر سکیں گے۔ اس پر نظر نہ آنے والی ایسی طاقتوں کا اثر ہے جن سے نپٹنا میرے بس کی بات نہیں آ''۔

یہ چند الفاظ گوجرانوالہ کے ایک بزرگ کے ہیں جو انہوں نے تقریباً نصف صدی پیشتر ایک چھ سالہ کو دیکھ کر بچے کی دادی اور چچا سے کہے تھے۔ وہ اس بزرگ کے پاس بچے کو دکھانے کے لئے لے گئے تھے۔ بچہ ہر وقت بیمار ہی رہتا تھا کسی بھی ڈاکٹر کی کوئی دوائی اس پر اثر نہیں کر رہی تھی۔

اس بزرگ کو عرف عام میں مولوی جن کہا جاتا تھا اور یہ مشہور تھا کہ وہ ایسے مریضوں کا کامیاب علاج کرتے ہیں جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہو کہ اس پر جن بھوتوں کا اثر ہے۔ یا کسی دشمن نے تعویذوں کے ذریعے اس کو بیمار کر دیا ہے۔

یہ بات مجھے یوں یاد آ گئی ہے کہ کبھی کبھی یہ بحث چل نکلتی ہے، کیا جن بھوتوں کا کوئی وجود ہے؟ اور کیا یہ کہ جن بھوت کسی کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں؟ اور کیا تعویذ گنڈوں سے اس کا علاج ممکن ہے؟

اس بچے کا نام مختار احمد تھا جس کی عمر چھ سال تھی کہ وہ ماں کی ممتا سے محروم ہو گیا۔ بچہ کچھ بیمار رہنے لگا، اسے ہر وقت پیٹ میں درد رہتا۔ بار بار پاخانہ آنے کی وجہ سے وہ بہت ہی کمزور ہو گیا۔ اسے بہت سے ڈاکٹروں حکیموں کو دکھایا گیا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ گھر والے بن ماں کے بچے کی بیماری سے پریشان رہنے لگے تو کسی نے اس کے گھر والوں کو مشورہ دیا کہ بچے کو تعویذ گنڈا کرنے والے کسی بزرگ کو دکھائیں۔ چنانچہ بچے کو دادی اور چچا مولوی جن کے پاس لے گئے۔

مولوی جن صاحب نے بچے کو دیکھتے ہی کہا کہ اس بچے کو مولوی محمد صاحب کے پاس لے جائیں، وہ بہت عالم فاضل ہیں۔ امید ہے کہ ان کے علاج سے بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مولوی صاحب گوجرانوالہ کی ایک مسجد میں خطیب بھی تھے۔ بچے کو مولوی محمد صاحب کے پاس لے جایا گیا۔ انہوں نے اس بچے کا جو علاج کیا اس کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مولوی محمد صاحب کوئی عام پیشہ ور قسم کے مولوی نہ تھے۔ وہ پڑھے لکھے اور باعمل مسلمان تھے۔ ان کے علاج میں کوئی بناوٹ یا پیشہ ورانہ قسم کی آلودگی نہ تھی۔ جہاں تک میری سوچ کا تعلق ہے، میں جنوں بھوتوں یا تعویذوں کا قائل نہ تھا۔

بچے کو دیکھنے کے بعد مولوی محمد صاحب نے کچھ تعویذ دیئے جن میں سے کچھ جلانے تھے۔ جب تعویذ جلائے جاتے تو چھ سات سال کا لاغر سا بچہ مولوی صاحب اور اپنے بزرگوں کو ایسے غصے سے دیکھتا کہ اس کی آنکھیں ابلنے لگتیں اور پاس بیٹھے ہوئے اپنے کسی بزرگ کو دھکا دے کر چارپائی سے گرا دیتا جو ظاہراً ممکن نہیں ہو سکتا تھا، یعنی بچے کی جسمانی ساخت عمر اور بیماری کسی صحت مند انسان کو گرانے پر قادر ہی نہ تھی مگر ایسا ہوتا رہا۔ البتہ مولوی محمد صاحب اس کا انگوٹھا اپنے ہاتھ میں پکڑتے تو بچے کی اچھل کود ختم ہو جاتی۔

کئی دن کے علاج کے بعد بچے کو افاقہ ہوا تو مولوی محمد صاحب نے بچے کے ہاتھوں میں ایک پیالہ پکڑا دیا۔ پیالے میں صاف پانی تھا۔ انہوں نے بچے سے کہا کہ پانی کے اندر دیکھتے رہو، جب اس میں کچھ نظر آئے تو مجھے بتاؤ۔ وہ خود کچھ پڑھنے لگے۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد بھی بچے کو پانی میں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ یہ عمل دو تین دن جاری رہا۔ اس کے بعد بچے نے بتایا کہ اسے پانی میں کچھ دھندلی سی تصویریں نظر آنے لگی

ہیں۔ مولوی صاحب کوئی ورد کر رہے تھے۔ بچے نے بتایا کہ اسے پانی میں پانچ انسان نظر آ رہے ہیں جن میں تین مرد ایک عورت اور ایک بچہ ہے۔

مولوی صاحب نے مختار سے کہا کہ ان سے پوچھو کہ وہ مجھے یعنی مختار کو کیوں تنگ کر رہے ہیں؟

''یہ خاموش ہیں''۔ مختار نے جواب دیا۔ ''ان تین مردوں میں سے ایک کچھ بوڑھا لگتا ہے۔ اس کے ہونٹ ہل رہے ہیں مگر میں ان کی آواز نہیں سن سکتا۔ یہ میری طرف گھور گھور کر دیکھتے ہیں''۔

مولوی محمد صاحب کے چہرہ پر جلال سا آ گیا۔

''انہیں کہو کہ چلے جائیں''۔ مولوی محمد صاحب نے غصے سے کہا۔ ''اور میری جان چھوڑ دیں''۔

''یہ کہتے ہیں جو مرضی ہے کر لو''۔ مختار نے کہا۔ ''ہم نہیں جائیں گے''۔

''ان سے پوچھو کہ یہ تمہیں کیوں پریشان کر رہے ہیں؟''

''بوڑھا کہتا ہے کہ ہماری رہنے کی جگہ پر اس نے پیشاب کیا تھا''۔ بچے نے کہا۔

مولوی صاحب کے دریافت کرنے پر کہ وہ کون سی جگہ تھی، مختار کی وساطت سے جواب ملا کہ باؤلی کے پاس ہمارا مسکن ہے جہاں اس بچے نے پیشاب کیا تھا۔ مولوی صاحب کے بار بار کہنے کے باوجود کہ وہ اس بچے کو چھوڑ دیں، ان کا جواب تھا کہ ہم نہیں جائیں گے۔

یہ عمل اگلے دن تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

مولوی صاحب نے اگلے دن ایک کاغذ لیا۔ ...ا کی کئی تہیں کیں اور اپنا ورد جاری کر دیا۔ اس ...ہاں مولوی محمد صاحب نے ایک چھری سے کاغذ کاٹنا ...ا کر دیا۔ مختار کی نگاہیں پانی کی طرف تھیں۔ اس نے مولوی صاحب کو بتایا کہ یہ لوگ ہنس رہے ہیں اور بار بار کہتے ہیں کہ جتنے مرضی وظیفے کرا لو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔

اس سارے عمل کو تقریباً تین ہفتے ہو گئے مگر معاملہ وہیں رہا جہاں پہلے دن تھا۔ مولوی محمد صاحب نے اس دوران کبھی یوں نہ کہا کہ بڑے سخت قسم کے جن ہیں جس طرح کہ عام پیشہ ور قسم کے مولوی پیر یا عامل کہا کرتے ہیں۔ وہ اطمینان سے اپنے عمل کو جاری رکھے ہوئے تھے اور میں اس کا شاہد تھا۔ مختار اب کسی کو دھکے نہیں دیتا تھا نہ ہی باتیں کرتے وقت بیہوش ہوتا تھا۔ وہ بات پورے ہوش و حواس اور سلجھے ہوئے انداز میں کرنے لگا تھا۔ اس کی باتیں سن کر یوں لگتا تھا کہ اسے کوئی تکلیف نہیں اور یہ بھلا چنگا ہے۔

مولوی محمد صاحب نے کاغذ کاٹنے والا عمل چھوڑ دیا اور کچھ پڑھتے پڑھتے اپنی ہتھیلی مختار کے سامنے کر دی۔

''میری ہتھیلی غور سے دیکھو''۔ مولوی محمد صاحب نے بچے سے پوچھا۔ ''کیا اس پر تمہیں کچھ نظر آتا ہے؟''

''ہتھیلی پر کچھ نہیں''۔ بچے نے جواب دیا۔

مولوی صاحب نے دو تین خالی بوتلیں منگوا کر اپنے پاس رکھ لیں اور خود ورد میں مصروف ہو گئے۔

''تمہیں میری ہتھیلی پر کچھ نظر آیا ہے یا نہیں؟'' انہوں نے ایک بار پھر بچے کو اپنی ہتھیلی دکھا کر پوچھا۔

''جن کو میں نے پانی میں دیکھا تھا ان میں سے عورت اور بچہ آپ کی ہتھیلی پر موجود ہیں''۔ مختار نے جواب دیا۔

مولوی صاحب نے ایک بوتل اٹھائی، اسے الٹا کیا اور ڈھکنے کی طرف سے اپنی ہتھیلی پر رکھ لی۔ مختار

سے پوچھا کہ بوتل میں کچھ نظر آیا ہے؟ اس نے جواب دیا کچھ بھی نہیں۔ مولوی محمد صاحب پھر ورد کرنے لگے اور ایک بار پھر مختار کو ہتھیلی دکھا کر پوچھا کہ اس پر کچھ ہے؟ مختار نے پھر عورت بچے اور ایک آدمی کی نشاندہی کی۔ مولوی صاحب نے پھر الٹی بوتل ہتھیلی کے ساتھ لگا دی تو مختار چلا اٹھا کہ عورت بوتل میں نظر آ رہی ہے مگر باقی نظر نہیں آ رہے۔

مولوی صاحب نے کارک سے بوتل کا منہ بند کر دیا اور اس پر کپڑا لپیٹ کر مضبوط دھاگے سے باندھ دیا۔ مختار کے چچا کو ہدایت کی کہ بوتل نہر یا دریا میں پھینک دینا۔

مولوی محمد صاحب نے ہتھیلی اور بوتل والا عمل کئی بار دوہرایا۔ مختار نے بتایا کہ سوائے ایک بوڑھے کے باقی سب بوتلوں میں بند ہو گئے ہیں۔ مولوی صاحب کی ہدایت کے مطابق یہ بوتلیں نہر میں پھینک دی گئیں۔

یہ سارا عمل میرے سامنے ہوا۔ مجھے اس میں کوئی فراڈ یا ڈرامہ نظر نہ آیا۔ خاص طور پر مولوی محمد صاحب کی شخصیت ایسی تھی کہ ان کے متعلق یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ معصوم بچے کے ساتھ مل کر کوئی ڈرامہ کر رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے آخری بوڑھے کو پکڑنے یا بوتل میں بند کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ بوڑھا ہتھیلی تک تو پہنچ جاتا تھا مگر بوتل میں بند کرتے وقت کہیں غائب ہو جاتا۔ مولوی صاحب ایک ماہ متواتر علاج کرنے کے بعد تھک گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ چند روز ٹھہر کر اس بوڑھے کو بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ مختار کا پیٹ درد ختم ہو گیا اور اس کے بار بار کے پاخانے بھی بند ہو گئے۔

مجھے تجسس سا تھا کہ یہ بچہ کون سی باؤلی پر گیا تھا جہاں اس نے پیشاب کیا تھا۔ باؤلی چوکور اور چھوٹے سے تالاب نما کنوئیں کو کہتے ہیں۔ اس میں چشمہ پھوٹتا ہے۔ یہ شاید بادشاہوں نے اپنی فوجوں کے راستے میں کہیں کہیں بنوائی تھیں۔ گوجرانوالہ کے نزدیک ایسی کوئی باؤلی نہیں تھی۔ بچے کے گھر والوں نے دماغ پر زور ڈالا کہ بچہ پچھلے کچھ عرصے میں کہاں کہاں گیا تھا۔ اس کی دادی کو یاد آیا کہ جب بچے کی ماں فوت ہو گئی تھی تو وہ بچے کو لے کر بس کے ذریعے اُس کے چچا کے پاس پشاور گئی تھی۔ بچے کا چچا انڈین آرمی میں تھا اور اس کی پوسٹنگ پشاور میں تھی۔ دادی کو یہ بھی یاد آیا کہ بس راولپنڈی سے آگے نکل گئی تھی کہ اچانک خراب ہو گئی۔ بس کا ڈرائیور بس ٹھیک کرنے لگا۔ سواریاں بس سے اتر کر سڑک کے کنارے درختوں کے نیچے بیٹھ گئیں۔ یہ بھی یاد آ گیا کہ بڑے بڑے درختوں کے نیچے ایک گہرا کنواں تھا جس کے اردگرد چھوٹی سی دیوار بنی ہوئی تھی۔ اس دیوار کے ساتھ بیٹھ کر انہوں نے روٹی کھائی تھی جو وہ گھر سے لے کر چلے تھے اور وہیں مختار نے پیشاب کیا تھا۔

راولپنڈی سے کچھ آگے لوثر باؤلی کے نام سے ایک پرانا کنواں ہے جو جی ٹی روڈ کے بالکل ساتھ تھا۔ آج یہ سڑک پشاور جانے والی بسوں کے لئے بند ہے۔ اس کے لئے متبادل سڑک تیار کی گئی ہے۔ پرانی سڑک اور باؤلی واہ آرڈیننس فیکٹری کی حدود میں آ گئی ہیں۔ اس سڑک کے ایک طرف فیکٹری اور دوسری طرف ملازموں کے رہائشی کوارٹر ہیں۔

میں اس واقعہ کے بعد تعویذوں اور جن بھوتوں کا کسی حد تک قائل ہو گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مختار کا قد جلد ہی اس سے ڈیڑھ گنا ہو گیا جتنا کہ وہ بیماری کے دوران تھا وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکا تھا۔

پھر میں خود ایک حادثے سے دوچار ہوا جس میں مجھے بھی جن بھوت نظر آئے مگر وہ شاید حقیقی نہیں خیالی تھے۔ ان جن بھوتوں نے بہت عرصہ تک میرا سکون درہم برہم کئے رکھا۔ یہ واقعہ بہت پرانا ہے یعنی قیام پاکستان سے پہلے کا۔ میں اس وقت انڈین آرمی میں نیا نیا شامل ہوا تھا۔ دنیا میں بہت سے ممالک اس وقت جنگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ یہ دوسری جنگ عظیم تھی۔ میں 14 پنجاب رجمنٹل سینٹر فیروز پور چھاؤنی میں ٹریننگ میں تھا۔ مجھے ٹیکنیکل ٹریننگ کے لئے شاہجہان پور (یو پی) بھیج دیا گیا۔ شاہجہانپور میں انگریزوں کے زمانے میں بہت بڑی آرڈیننس فیکٹری اور انسپکشن ڈپو تھا جو آج بھی ہو گا۔ ہماری ٹریننگ آرڈیننس انسپکشن ڈپو میں تھی۔ رہائش فیکٹری سے دو تین میل دور ویرانے میں تھی۔ یہ فوجی بارکیں تھیں۔ وہاں ایک گورکھا کمپنی کا قیام تھا، گورکھا کمپنی کے جوان آرڈیننس فیکٹری میں گارد کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آنے والے ہم جیسے زیر تربیت افراد کی رہائش اور خوراک کا انتظام گورکھا کمپنی کے ساتھ تھا۔ فیکٹری سے فوجی بارکوں تک کا راستہ اجاڑ اور سنسان تھا۔ دن کے وقت بھی اس راستے سے گزرتے ہوئے خوف آتا تھا۔ رات کو تو کوئی اس علاقے سے گزرتا ہی نہیں تھا۔

اس راستہ کے درمیان صرف دو بنگلے تھے۔ ایک فیکٹری کے نزدیک نیا نیا بنا تھا جس کے ایک حصے میں مسٹر سنگھ رہتا تھا۔ اسے مسٹر اس لئے کہتے تھے کہ وہ سکھوں کی طرح داڑھی اور سر کے بال (کیس) نہیں رکھتا تھا اور سر پر پگڑی کی بجائے کیپ استعمال کرتا تھا۔ سگریٹ بھی اس کے ہونٹوں میں تقریباً ہر وقت ہی رہتا تھا جس طرح مسلمانوں کے لئے سور حرام ہے اسی طرح سکھوں کے لئے تمباکو نوشی حرام ہے۔ مسٹر سنگھ اُن زمانے میں مَیں فورمین اور بعدازاں انگریزوں

فیصلے اور فاصلے

جب آدمی اپنی غلطیوں کا خود وکیل ہو اور دوسروں کی کوتاہیوں کا خود جج ہو تو پھر فیصلے فاصلوں کو جنم دیتے ہیں۔

☆...... جویریہ شہزادی - لاہور

کے جانے کے بعد اس فیکٹری کا کنٹرولر بن گیا تھا۔ بنگلے کے دوسرے حصہ میں خان صاحب محمد شفیع بٹ رہائش پذیر تھے جن کا تعلق سیالکوٹ سے تھا۔ وہ وہاں سٹور ہولڈر تھے۔ قیام پاکستان کے بعد خان صاحب واہ آرڈیننس فیکٹری میں بہت اونچے مقام پر فائز رہے۔

دوسرا بنگلہ بالکل ہی بیابان میں تھا۔ اس کی بناوٹ سے پتہ چلتا تھا کہ اس کی تعمیر انگریزوں کے ہندوستان میں آنے کے وقت ہوئی ہو گی۔ اس بنگلے کی ویرانی پُراسرار تھی۔ شاید اس میں کوئی انگریز رہائش پذیر تھا مگر کبھی دیکھا نہیں گیا۔ اس بنگلے کے متعلق مشہور ہو گیا تھا کہ اس کے اردگرد بلند و بالا اور گھنے درختوں کی چوٹیوں پر رات کے وقت دیئے سے جلتے بجھتے رہتے ہیں۔ یہ بات ہم جیسے کم عمر اور ناپختہ ذہنوں کو ہراساں کرنے کے لئے کافی تھی۔ ہمارا وہاں سے گزر دن کے وقت اور اجتماعی صورت میں ہوتا تھا۔ اس لئے ہم نے رات کو درختوں پر روشنی ہونے کا کوئی زیادہ نوٹس نہ لیا۔

اس بنگلے کے قریب سے گزرنا ہماری مجبوری تھی۔ بارکوں کو جانے کے لئے کوئی متبادل راستہ نہیں تھا۔ بنگلے سے دو تین سو گز آگے سڑک پر بارش کے پانی کے نکاس کے لئے ایک پلی بنی ہوئی تھی جس کے متعلق یہ افواہ بھی ہمارے کانوں تک پہنچی کہ "پلی" پکی ہے۔ پکی سے مراد اس جگہ کو لیتے تھے جہاں جنات کا ڈیرہ ہو۔ پلی سے تھوڑا آگے تنگ سی سڑک تھی جس کے

دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ دن کے وقت بھی ان گھنے درختوں کی وجہ سے سڑک اندھیری سی رہتی تھی۔ پلی اور ہماری بارکوں کے تقریباً درمیان اسی سڑک اور گھنے درختوں کے نیچے چند ٹوٹی پھوٹی ویران سی قبریں تھیں جن کے متعلق اندازہ تھا کہ یہ سینکڑوں برس پرانی ہیں۔ قبروں کے قریب سے گزرنے کے بعد ہماری بارکیں آتی تھیں۔

اس سارے راستہ پر پُراسرار سی خاشی رہتی تھی اور ماحول خاصا وحشت ناک قسم کا لگتا تھا۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں سانپ کالے اور لمبے لمبے بچھو اور بندروں کی بہتات تھی جن سے اپنے آپ کو بچانا مشکل نظر آتا تھا۔

میں کبھی بھی اکیلا اس راستہ پر نہیں گیا تھا کہ دل میں انجانا سا خوف ابھر آتا تھا۔ یہ دن کی روشنی کے وقت کا حال تھا۔ رات کو تو اس علاقے سے گزرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر ایک رات میں اکیلا اس راستے میں پھنس گیا۔ ہوا یوں کہ سیالکوٹ کا ایک نوجوان نذیر ملک تعلیم سے فارغ ہو کر شاہجہان پور آرڈیننس فیکٹری میں ملازم ہو گیا۔ ملازمت خان صاحب محمد شفیع بٹ نے دلوائی تھی۔ نذیر ملک کی رہائش کا انتظام عارضی طور پر خان صاحب کے بنگلے پر ہی تھا۔ میں دن کے وقت اکثر اوقات نذیر ملک سے ملنے جایا کرتا تھا۔ عمر کے تقاضے اور کشمیر کی نسبت سے وطنیت کے احساس نے جلد ہی ہماری ملاقاتیں گہری دوستی میں تبدیل کر دیں۔

کچھ دنوں بعد فیکٹری کے تقریباً سامنے نذیر ملک کو کوارٹر مل گیا اور وہ اس میں شفٹ ہو گیا۔ یہاں میں نذیر ملک کا تھوڑا سا تعارف کرا دینا چاہتا ہوں۔ ملک صاحب واہ آرڈیننس فیکٹری سے ورکس منیجر کی پوسٹ سے ریٹائر ہو کر راولپنڈی میں مقیم ہوئے اور ان کا بڑا بیٹا شاہد ملک لندن میں بی بی سی سے منسلک ہو گیا تھا۔

میری شامیں اکثر نذیر ملک کے ساتھ اس کی رہائش گاہ پر گزرنے لگیں لیکن میں اس بات کا خاص خیال رکھتا کہ شام سے بہت پہلے اپنی بارکوں میں پہنچ جاتا۔ ایک دن مجھے وہاں بیٹھے خاصی دیر ہو گئی۔ سیاہ بادلوں نے میرا راستہ روک لیا تھا جو شاہجہانپور میں کبھی کبھار ہی آتے تھے۔ رات کی تاریکی نے سارے علاقے کو اندھیرے کے پردے میں ڈھک لیا۔ مجھے بالکل خیال نہ رہا کہ جس راستے پر سے مجھے گزرنا ہے وہ میرے لئے پل صراط سے کم نہیں۔

رات شروع ہوئے دو تین گھنٹے گزر چکے تھے اچانک خیال آیا کہ مجھے بارکوں میں پہنچنا ہے جہاں ہر شام فوجی ڈسپلن کے تحت حاضری ہوا کرتی تھی۔ میں نے نذیر ملک سے اجازت لی اور فیکٹری کے مین گیٹ کے سامنے سڑک پر آ گیا۔ پہلا موڑ مڑنے کے بعد بائیں طرف خان صاحب محمد شفیع بٹ کے بنگلے کی مدھم سی روشنیاں نظر آئیں اور پھر میں ویرانے کی اس واحد سڑک پر چلنے لگا جس کے اردگرد آبادی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ پھر مجھے بندروں کی چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ اس علاقہ میں تو سانپوں اور بچھوؤں کی بہتات ہے جو اندھیرے میں کسی وقت بھی ڈس سکتے ہیں۔ میں چلتا رہا۔

تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ مجھے ستاروں کی مدھم روشنی میں وہ بنگلہ نظر آ گیا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے درخت یا درختوں کی چوٹیوں پر دیئے جیسی روشنیاں نظر آتی ہیں۔ آسمان بادلوں سے صاف ہو گیا تھا۔ اس کی چمک اور کڑک بھی ختم ہو گئی لیکن میرا جسم پسینے سے شرابور ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بنگلے پر نظر پڑتے ہی میری رفتار کم اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے

محسوس کیا کہ چلتے چلتے رک گیا ہوں اور میری نظریں ان درختوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں جن پر روشنیاں نظر آنے کی افواہیں سن رکھی تھیں۔ میں کچھ زیادہ ہی ڈر گیا۔ جی میں آئی واپس چلنا بلکہ بھاگنا شروع کر دوں اور نذیر ملک کے کوارٹر میں پہنچ جاؤں مگر یہ خیال کچھ جچا نہیں۔ میں نے قدم قدم آگے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ جوں جوں میں بنگلے کے قریب پہنچتا رہا میری حالت غیر ہوتی گئی۔ پھر جی کڑا کر کے میں نے آگے کی طرف دوڑ لگا دی اور بنگلے کے قریب سے گزر کر بائیں طرف مڑ گیا جدھر مجھے جانا تھا۔ میں نے ہمت کر کے پیچھے اس خاموش بنگلے کی طرف دیکھا تو میرے تخیل نے مجھے احساس دلایا کہ واقعی ایک اونچے درخت کی چوٹی پر روشنی نظر آ رہی ہے۔

روشنی کا نظر آنا قیامت بن گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے آگے کی طرف دوڑنا شروع کر دیا لیکن ایک بار پھر میرے قدم رک گئے۔ میرے سامنے پکی پلی تھی جس کے متعلق مشہور تھا کہ یہاں جن بھوتوں کا بسیرا ہے۔ میں نے اندھیرے میں محسوس کیا کہ پلی کے درمیان سڑک پر کوئی پہاڑ سا کھڑا ہے جس کی وجہ سے آگے جانے کا راستہ مسدود ہے۔

میری پریشانی آخری حدود کو چھونے لگی۔ ایک بار پھر واپسی کے متعلق سوچا مگر ہمت جواب دے گئی کہ راستے میں روشن چوٹی والے درخت ہیں جو پرانی کوٹھی میں ایستادہ ہیں۔ کوٹھی میں پتہ نہیں کوئی انگریز رہتا ہے یا اس کی بدروح اس کے پاس سے گزرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے مگر آگے پکی پلی ہے جس پر کسی جن یا بھوت نے قبضہ کر کے راستہ بند کر رکھا ہے۔ اس وقت مجھے قرآن پاک کی جو جو آیات یاد تھیں ان کی تلاوت شروع کر دی لیکن میرا دھیان روشنیوں والے درختوں اور پکی پلی کے درمیان پھنس کر رہ گیا۔

قریب تھا کہ میں دہشت سے بیہوش ہو جاتا مگر قرآنی آیات نے سہارا دیا اور میں پھر قدم قدم پکی پلی کی طرف بڑھنے لگا مگر بہت آہستہ آہستہ میں پلی سے چند قدم دور ہی تھا کہ مجھے پلی کے درمیان کھڑا پہاڑ ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ میرے قدم پھر جم کر رہ گئے۔ اب میرے لئے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ تھا۔ واپس آنے اور آگے جانے کے راستے مسدود تھے۔ میرے سامنے دو راستے تھے، واپس نذیر ملک کے پاس یا بارکوں میں۔ میں وہاں کھڑا نہیں رہ سکتا تھا پھر میں پلی کے نزدیک ہوتا چلا گیا اور میں نے اندھیرے میں محسوس کیا کہ پہاڑ نے سڑک کے ایک طرف سرکنا شروع کر دیا ہے۔ خوف اتنا زیادہ ہو گیا جس کا بیان میرے قلم کی طاقت سے باہر ہے لیکن نوجوانی اور فوجی تربیت سے یہ احساس ابھی زندہ تھا کہ پہاڑ چلا نہیں کرتے۔

پہاڑ سڑک کے ایک طرف کھسک رہا تھا اور میں نے پلی کی طرف سرکنا شروع کر دیا۔ آنکھیں بند کر کے ایک بار پھر دوڑ لگا دی۔ مجھے خیال تھا کہ پلی عبور کرتے وقت کوئی جن مجھے اٹھا کر پلی کے نیچے خشک برساتی نالے میں پھینک دے گا یا پہاڑ واپس آ کر مجھے کچل دے گا مگر کچھ بھی نہ ہوا اور میں چند ہی سیکنڈ میں پلی کے اُس پار تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ چند سیکنڈ مجھے ہفتوں جیسے لمبے لگے۔

میرے تجسس نے مجھے پھر پیچھے پلی اور پہاڑ کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے چلتے چلتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جسے میں پہاڑ سمجھ رہا تھا وہ ایک آوارہ گھوڑی تھی جس کی ایک آنکھ خراب تھی۔ یہ گھوڑی ہر روز آتے جاتے ہمیں نظر آتی تھی۔ اسے ہم کانی گھوڑی کہا کرتے تھے۔ وہ سڑک کے درمیان اڑی کھڑی تھی اور جس طرف سے میں آ رہا تھا اس کی اس طرف کی

آنکھ خراب تھی۔ وہ مجھے دیکھ نہ سکی اور اطمینان سے کھڑی رہی۔ میرے قریب آنے پر اور میری آہٹ محسوس کر کے اس نے ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ اسے میں چلتا ہوا پہاڑ سمجھا۔

اسی لمحے میں نے پرانے بنگلے کی طرف دیکھا۔ اس کے کسی درخت کی شاخ پر مجھے کسی قسم کی روشنی نظر نہ آئی۔ میں نے چند لمحوں کے لئے اپنے ذہن میں اطمینان سا محسوس کیا مگر میں ٹھہرا نہیں۔ بارکوں کی طرف اس چھوٹی سی سڑک پر دوڑ لگا دی جو دن کے وقت بھی غریب کی قسمت کی طرح اندھیری رہتی تھی اور جس پر کئی سو سال پہلے کی چند ویران قبریں بھی تھیں۔ ان کے پاس سے گزرنا کم از کم اس وقت میرے بس میں نہیں تھا۔

میرے قدم ایک بار پھر رُکنے لگے اور میرے ذہن میں یہ خیال بل کھانے لگا کہ جانے ان قبروں کے مکین کون ہیں جو کئی سو سال سے یہاں دفن ہیں؟ ان کی روحیں یقیناً یہاں بھٹک رہی ہوں گی جو مجھے کچھ نہ کچھ نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ میں نے یہاں تک ہی سوچا تھا کہ مجھے قبروں سے سفید سے ہالے نکلتے ہوئے نظر آئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ قبروں سے روحیں یا بدروحیں نکل رہی ہیں اور یہ مجھے اٹھا کر اپنے ساتھ ان قبروں میں لے جائیں گی۔ اس منظر نے مجھے بالکل ہی پاگل کر دیا۔ شاید میرے منہ سے چیخ بھی نکلی تھی۔

میں بندروں، سانپوں، بچھوؤں، روشنیوں والے درختوں اور پکی پلی سے بچ کر یہاں تک آن پہنچا تھا جہاں سے میرا ٹھکانہ چند قدم کے فاصلہ پر تھا مگر میں پرانی قبروں اور روحوں کے درمیان پھنس کر رہ گیا تھا۔ ایک بار پھر میں نے قوتِ ارادی کو آواز دی اور جتنی تیز دوڑ سکتا تھا اس سے زیادہ رفتار سے بارکوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

مجھے معلوم نہیں کہ میں کس طرح بارک کے باہر میدان میں لگے اپنے بستر پر پہنچا۔ اس پر لگی مچھر دانی کا ایک پہلو اٹھایا اور مچھر دانی نے مجھے اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ میں بستر پر پڑا تھا جو میرے ساتھیوں نے سونے سے پہلے لگا دیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے نہ کپڑے بدلے تھے نہ بوٹ اتارے تھے۔ شاید آنکھیں بھی بند رکھی تھیں کہ آنکھیں کھولنے کے ساتھ ہی سارا منظر سامنے آ کر دہشت زدہ کر دیتا تھا۔ میں صبح تک لیٹا رہا۔ مجھے یاد نہیں کس وقت آنکھ لگی تھی، لگی بھی تھی یا نہیں، البتہ اتنا یاد ہے کہ صبح مجھے تیز بخار تھا اور میں بارکوں میں چھوٹے سے ہسپتال میں تھا جو عارضی طور پر وہاں قائم کیا گیا تھا۔

ان واقعات کو گزرے تقریباً آدھی صدی گزر چکی ہے لیکن میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ پرانے بنگلے کے درختوں سے نکلنے والی روشنیاں کیسے نظر آئی تھیں۔ قبروں پر سفید لباس والی روحیں کہاں سے آ گئی تھیں۔ کیا یہ سب میرا وہم تھا؟ کیا یہ میرے تخیل کی پیداوار تھی؟ اور یہ کہ لوگ کہتے ہیں کہ کسی قسم کے جن بھوتوں کا کوئی وجود نہیں۔ مگر میں جب چھ سالہ بچے مختار کو یاد کرتا ہوں تو کچھ ڈگمگا جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں وہ کون تھے جنہیں مولوی محمد صاحب نے بوتلوں میں بند کر کے پانی میں بہا دیا تھا۔ اگر مختار کو کوئی جسمانی بیماری تھی تو اس کا علاج ڈاکٹروں سے کیوں نہ ہو سکا اور مولوی محمد صاحب کے روحانی علاج کے بعد وہ تندرست کیسے ہو گیا؟ ہو سکتا ہے کسی قاری کے پاس اس کا جواب ہو۔

نوٹ: ہم اس سوال کا جواب محترم محمد افضل رحمانی صاحب پر چھوڑتے ہیں۔ وہ اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں وضاحت کریں کہ یہ سب کیا ہے؟ (ادارہ)

○◆○

عرب اسرائیل جنگیں

عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگیں

چھ روزہ جنگ 1967ء

☆ میاں محمد طاہر ابراہیم
0300-4154083

1956ء کی عرب اسرائیل جنگ اقوام متحدہ کی مداخلت سے ختم ہوئی تھی اور فریقین کو اپنی اپنی سرحدوں کے اندر واپس جانا پڑا تھا۔ 1967ء تک کے گیارہ سالہ دور میں فلسطین، شام، مصر، اردن اور اسرائیل اسلحہ جمع کرنے، فوجوں کی تربیت اور جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہے تھے۔ پہلے کی طرح اس بار بھی اسرائیل کو بڑی طاقتوں، امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی مدد حاصل رہی تھی۔ اسرائیل خود بھی جدید ترین اسلحہ اور دیگر جنگی ساز و سامان تیار کر رہا تھا اور بڑی طاقتوں سے بھی لے رہا تھا۔ اس نے خفیہ طور پر ایٹمی اسلحہ بھی تیار کر لیا تھا جبکہ عرب ملکوں کا زیادہ تر انحصار دوسرے ملکوں خصوصاً روس سے خریدے ہوئے اسلحے، گولہ بارود، توپوں، ٹینکوں اور جنگی طیاروں پر تھا۔ سب فریقین دانت تیز کئے بیٹھے تھے۔

جنگ کی فوری وجہ یہ بنی کہ صدر جمال عبدالناصر نے بروز پیر 22 مئی 1967ء کو صحرائے سینائی کے ایک ائرفیلڈ پر اپنے نوجوان پائلٹوں کے سامنے یہ اعلان کیا۔

"آج سے خلیج عقابہ سے کوئی اسرائیلی پرچم بردار بحری جہاز نہیں گزر سکے گا۔ گلف پر ہماری خود مختاری کو کوئی تنازع نہیں بنا سکتا۔ اگر اسرائیل ہمیں جنگ کی دھمکی دیتا ہے تو ہم اس کے لئے تیار ہیں"۔

خلیج عقابہ 1956ء سے اسرائیلی جہازوں کے لئے کھلی تھی۔ اب پابندی کا مطلب اسرائیلی بندرگاہ ایلات (Elat) کی ناکہ بندی تھا جو اسرائیل کی بیرونی تجارت کے لئے نہایت اہم بندرگاہ تھی۔

ناصر کے اعلان کے بعد اگلے ہی دن اسرائیلی

وزیراعظم اشکول اور اس کی کابینہ نے اپنی افواج کو تیاری کا حکم دے دیا۔ اسرائیل میں ہر نوجوان کے لئے 2½ سالہ فوجی تربیت لازمی تھی اور وہ 48 گھنٹے کے نوٹس پر اڑھائی لاکھ فوج کو میدان میں اتار سکتا تھا اور اس نے 1956ء کی جنگ کے بعد سے بہت زیادہ تیاری کر رکھی تھی۔

اسرائیلی پارلیمنٹ میں جنگ کے بارے میں ملا جلا ردِعمل پایا جا رہا تھا۔ بیشتر بزرگ سیاستدان جنگ کے خلاف تھے لیکن نوجوان فوجی افسروں میں اپنے وطن کی بقاء کی جنگ لڑنے کا جذبہ بام عروج پر تھا۔ اسرائیلی ریڈیو اپنی معمول کی نشریات جاری رکھے ہوئے تھا جس سے قطعی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ملک مہلک ترین جنگ میں کودنے جا رہا ہے۔ مقصد اپنے عوام کو پُرسکون رکھنا اور خوف و ہراس سے بچانا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں قاہرہ کا ریڈیو سٹیشن ''صوت العرب'' (Voice of Arab) جو عربی زبان اور عرب ملکوں میں سنا جانے والا مقبول ترین ریڈیو سٹیشن تھا، دن رات جنگی جنون کو ہوا دے رہا تھا، جنگی ترانے نشر کر رہا تھا اور صدر ناصر کی تقریر کو بار بار دہرا رہا تھا۔

1956ء میں امریکہ کا صدر، دوسری جنگ عظیم کا ہیرو، آئزن ہاور تھا جس نے اسرائیل کے فتح کئے ہوئے علاقے مصر کو واپس دلانے کے بدلے میں خلیج عقابہ کو اسرائیل کے لئے کھلا رکھنے کا ناصر سے وعدہ لیا تھا۔ 1967ء میں امریکہ کا صدر لندن بی جانسن (London B. Johnson) تھا (وہی صدر جانسن جس نے کراچی کے بشیر ساربان کو سرکاری خرچے پر امریکہ کی سیر کرائی تھی)۔ جانسن پہلے ہی ویتنام کی جنگ میں الجھا ہوا تھا اور مشرق وسطیٰ میں نئی جنگ کا مخالف تھا لیکن وہ اسرائیل سے ہمدردی رکھتا تھا اور اس کی بقاء کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے تمام فریقین سے درخواست کی کہ جنگ میں پہل نہ کریں اور صبر و تحمل سے کام لیں۔

مصری صدر جمال عبدالناصر نے 28 مئی کو عالمی میڈیا سے خطاب کیا جو قاہرہ ریڈیو ''صوت العرب'' نے پوری عرب دنیا میں براہ راست نشر کیا۔ اس خطاب میں اپنی پالیسیوں کی وضاحت کی۔ فلسطینیوں کے حقوق کی وکالت کی، اسرائیلی جارحیت کا تذکرہ کیا اور اسرائیلی وزیراعظم اشکول کو دھمکی دی۔

''تم 1956ء کی نام نہاد فتح کے غرور میں شام پر قبضہ کرنے وہاں سے عربوں کی حکومت ختم کرنے اور انہیں سبق سکھانے کی دھمکیاں دے رہے ہو۔ اگر ایسا ہوا تو تمہارا اگلا پچھلا سب حساب چکا دیا جائے گا۔''

اردن میں شاہ حسین نے بھی ناصر کی تقریر سنی اور اس نے محسوس کر لیا کہ اسرائیل سے اب جنگ ناگزیر ہو چکی ہے۔ اسے اس جنگ کے نتیجے میں یروشلم کے مشرقی حصے اور مغربی کنارے سے محروم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا جس پر اب تک اردن کا کنٹرول تھا، کیونکہ شاہ حسین کے امریکن دوستوں نے، جن کا تعلق انٹیلی جنس سے تھا، اسے پہلے سے بتا دیا تھا کہ جنگ کی صورت میں، اسرائیل نے ان علاقوں پر قبضہ کے لئے بے پناہ تیاری کر رکھی تھی۔

30 مئی کو علی الصبح شاہ حسین اپنا جہاز خود اڑا کر قاہرہ پہنچ گیا اور ناصر کے ساتھ دوستی، تعاون اور اتحاد کے ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ جب اردن کے عوام اور فلسطینیوں نے قاہرہ ریڈیو سے اس معاہدے کی خبر سنی تو انہوں نے بے پناہ خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔ معاہدے کے وقت مصری افواج کے کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل عبدالحکیم عامر نے کہا۔

''ہمیں آپ سے کچھ نہیں چاہئے۔ مصر صرف یہ چاہتا ہے کہ آپ خاموشی سے بیٹھ کر یہ دیکھیں کہ مصر ان (اسرائیلوں) کا کیا حشر کرنے والا ہے۔''

شاہ حسین نے قاہرہ سے واپس آ کر مغربی کنارے پر موجود اپنے فوجی دستوں کا معائنہ کیا اور ان کا حوصلہ بڑھایا کہ اپنے وطن کے دفاع کے لئے اپنی روایات کو زندہ رکھیں۔

اُدھر اسرائیلی وزیراعظم لیوی اشکول (Levi Eshkol) نے 28 مئی کی شام کو قوم سے خطاب کیا جو انتہائی بے ربط تھا جس نے اسرائیلی جرنیلوں کو اپنے سیاستدانوں کے خلاف انتہائی مشتعل کر دیا۔ ان کے خیال میں ہمہ قسم کی تیاریوں کے باوجود سیاستدان جنگ سے فرار حاصل کرنا چاہتے تھے اور جنگ کے نتائج کا سارا ملبہ جرنیلوں کے سر پر ڈالنا چاہتے تھے۔ اس وقت کا بریگیڈیئر جنرل ایریل شیرون (Ariel Sharon) (موجودہ اسرائیلی وزیراعظم) سب سے زیادہ غصے میں تھا۔

31 مئی کو وزیراعظم اسرائیل نے بریگیڈیئر جنرل گاوش کی جگہ یک چشم موشے دیان (Moshe Dayan) کو جنوبی کمانڈ کا کمانڈر بنا دیا۔ یہ وہ جنرل تھا جو اپنی ایک آنکھ پر سیاہ رنگ کا کھوپا چڑھائے رکھتا تھا۔ اس کی یہ آنکھ دوسری جنگ عظیم کے دوران 1941ء میں لبنان میں لڑتے ہوئے ضائع ہو گئی تھی۔ دیان کی اس نئی پوسٹنگ کے وقت عمر 52 سال تھی اور وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس وقت دیان کے دو ہی مشاغل تھے۔ عورتوں میں دلچسپی اور آثار قدیمہ کی چھان پھٹک۔ عوام کی نظر میں وہ جنگی ہیرو تھا، اسی لئے جنگ سر پر دیکھ کر اسرائیل کو اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ بعد میں اسے وزیر دفاع بنا دیا گیا تھا۔

1956ء میں فرانس اور برطانوی ائرفورس کے ہاتھوں مصری فضائیہ کی تباہی کے بعد مصر نے اپنی فضائی قوت اس اصول کے تحت منظم کی تھی کہ اگر پہلے حملہ کر کے دشمن کی فضائیہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے تو دشمن کو شکست دینا آسان ہو جاتا ہے۔ لہٰذا صدر ناصر کے سامنے مصری چیف آف سٹاف جنرل فوزی، ائرفورس کے سربراہ جنرل صدقی محمد اور فضائی دفاع کے ذمہ دار جنرل اسمٰعیل لابیب اور فیلڈ مارشل عبدالحکیم عامر اسرائیلی فضائیہ پر اچانک اور پہلے حملے کی وکالت کر رہے تھے۔ ناصر نے سب کو ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا کہ ''آپ چاہتے ہیں کہ ہم جنگ میں پہل کریں اور امریکہ اسرائیل کے ساتھ آن کھڑا ہو''۔ کیونکہ امریکن صدر جانسن نے ناصر کو پہل نہ کرنے کا مشورہ دے رکھا تھا۔

4 اور 5 جون کی رات کو جبکہ اسرائیلی دارالحکومت تل ابیب بالکل پُرسکون تھا، اس کی مسلح افواج خاموشی اور رازداری سے محاذ جنگ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اسرائیلی مزے کی نیند سو رہے تھے، انہیں اگلی حملے کی صبح تک بالکل بے خبر رکھا گیا تھا۔

رات 10:30 بجے مصری فوجی دستوں نے جو غزا کے علاقے میں متعین تھے، اسرائیل کی طرف غیر معمولی نقل و حرکت محسوس کی اور اپنے ہیڈ کوارٹر کو اسرائیل کے متوقع حملے سے آگاہ کیا لیکن انہیں ہیڈ کوارٹر سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

اسی رات کو شاہ حسین نے اپنے خفیہ ذرائع سے ملنے والی انٹیلی جنس کی بنیاد پر قاہرہ کو اہم پیغام بھجیا کہ ''5 جون کی صبح کو مصر پر ہوائی حملہ ہونے والا ہے''۔ اسے جواب ملا۔ ''ہمیں معلوم ہے اور ہم تیار ہیں''۔

جنگ کا آغاز 5 جون 1967ء

اسرائیل نے اس جنگ کا خفیہ نام ''آپریشن فوکس'' (Operation Focus) رکھا تھا۔ اسرائیلی ائرفیلڈز پر پائلٹوں کو حملے کے احکام 6 اور 6:30 بجے کے درمیان دیئے گئے۔ 7:30 بجے اسرائیلی فضائیہ کے

جہاز مصر کی 9 ائر فیلڈز پر پہلے حملے کے لئے محو پرواز تھے۔ قاہرہ ائربیس پر حملے کا وقت 8:45 بجے مقرر کیا گیا تھا کیونکہ اسرائیلیوں کو پتہ تھا کہ اس وقت فضائی نگرانی کرنے والے طیارے فیلڈ پر مزید ایندھن لینے کے لئے اتر چکے ہوتے ہیں۔ دیگر پائلٹ اور افسر ناشتے میں مصروف یا ائر فیلڈ کی طرف آتے ہوئے قاہرہ شہر کی بے ہنگم ٹریفک میں پھنسے ہوتے ہیں۔

قاہرہ کی ائر فیلڈ فیض پر حملہ آور ہونے والے اسرائیلی بمبار طیارے دریائے نیل اور نہر سویز کے ڈیلٹا سے نیچے پرواز کرتے ہوئے اپنے ہدف تک پہنچے تھے اور ریڈار میں ان کی نشاندہی ہو چکی تھی اور 4 مصری مگ 21 ان کا راستہ روکنے کے لئے ابھی ائر فیلڈ سے پرواز کرنے ہی نہ پائے تھے کہ اسرائیلیوں نے چار ہزار فٹ کی بلندی سے بم برسا دیئے اور فوراً ہی غوطہ لگا کر مشین گن کے فائر سے دو مصری طیاروں کو آگ کے شعلوں میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد اسرائیلی جہازوں کے پرے کے پرے آتے گئے اور بم اور گولیاں برسا کر مصری طیاروں کا شکار کرتے گئے۔ رن وے تباہ اور ائر فیلڈز پر کھڑی ہر چیز کو ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کرتے گئے۔

عین اس وقت جبکہ مصر کا ہر ائر فیلڈ اسرائیلی طیاروں کی بمباری کا نشانہ بن رہا تھا، مصری افواج کا کمانڈرانچیف فیلڈ مارشل عبدالحکیم عامر صحرائے سینائی کی ایک دور افتادہ ائر فیلڈ بیر تمادہ (Bir Tamada) پر سینائی کے کمانڈروں کے اجلاس میں صحرائے سینائی کے تمام کمانڈر، اپنے اپنے ہیڈ کواٹرز سے دور، فیلڈ مارشل سے مشاورت کے لئے جمع تھے، جن میں ایڈوانس کا منڈ سینٹر کے ذمہ جنرل مرتضائی، اس کے چیف آف سٹاف میجر جنرل احمد اسمٰعیل اور فیلڈ آرمی کے کمانڈر جنرل صلاح محسن شامل تھے۔ یعنی صحرائے سینائی کی سب کمانڈر پوسٹیں اپنے کمانڈروں سے خالی پڑی تھیں۔

یہ تسلی ہونے کے بعد کہ اب مصر کی طرف سے اس کی بری افواج پر فضائی حملے کا کوئی امکان نہیں، اسرائیلی فضائیہ نے غزا میں موجود مصری چوکیوں اور فلسطینی مورچوں پر بمباری شروع کر دی اور ساتھ ہی اپنی بری فوج، ٹینکوں اور توپ خانے سے غزاء (Gaza) کے علاقے پر طوفانی حملہ شروع کر دیا (غزاء کی پٹی اس وقت تک مصر کے دائرہ اختیار میں تھی) اور مصری فوجیوں اور فلسطینی لبریشن آرمی کے دستوں کو مار بھگایا۔ مصر پر حملہ تین محاذوں سے بیک وقت کیا گیا تھا۔ شمالی جانب سے بریگیڈیئر جنرل اسرائیل تال (Israel Tal) نے العارش کی جانب سے غزاء اور رفاح کے مصری بازو سے گزر کر نہر سویز کی طرف القنطارہ پر قابض ہونا تھا۔ تال کے ساتھ 300 ٹینک، 100 ٹرک اور 50 توپیں شامل تھیں۔ جنوب کی جانب سے بریگیڈیئر جنرل ایریل شیرون (موجودہ وزیراعظم اسرائیل) صحرائے سینائی کی طرف یلغار کرنا تھی اور ابوعغیلاح (Abu Ageilah) میں مصری دفاعی تنصیبات کو تباہ کرتے ہوئے درہ متلا (Mitla) اور غدی، جنہیں ناقابل عبور اور دشوار ترین درے سمجھا جاتا تھا، پر قبضہ کرتے ہوئے نہر سویز کی طرف بڑھنا تھا۔ اس کے پاس 200 ٹینک 100 ٹرک اور 100 توپیں تھیں۔

مصر پر حملہ آور تیسرے ڈویژن کی کمان بریگیڈیئر جنرل ابراہام یوفی (Avraham Yoffi) کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے پاس 200 ٹینک 100 ٹرک لیکن کوئی توپخانہ نہ تھا۔ اس کا بنیادی کام ریت کے ان ٹیلوں ٹبوں سے، جنہیں ناقابل عبور سمجھا جاتا تھا، مصریوں کو بھگا کر شیرون اور تال کے پہلوؤں کو محفوظ بنانا تھا۔

تال نے فلسطینی قصبے خان یونس (Khan Younis) کی طرف رفاح (Rafah) کی طرف بڑھنا شروع کیا تو وہاں معین مصری فوج اور فلسطینی

رضاکاروں کے ہاتھوں بے پناہ نقصان اٹھانا پڑا۔ رفاح کے راستے میں بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ تال کی اپنی کمانڈو جیپ تک بارودی سرنگ سے ٹکرا کر تباہ ہو گئی لیکن وہ جیپ سے چھلانگ لگا کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تاہم اس کا ڈرائیور مارا گیا۔ اسی طرح اس کے کئی ٹینک گاڑیاں اور پیدل دستے مصری توپخانے کا نشانہ بنتے گئے لیکن انہوں نے ایڈوانس جاری رکھا آخر ائرفورس کی مدد سے مصری توپخانے کو خاموش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس جگہ اسرائیل ائرفورس نے اقوام متحدہ کے امن قائم رکھنے والے دستوں کو، جو بھارتی فوج پر مشتمل تھے، بھی بمباری کا نشانہ بنا ڈالا اور یو این کے 8 انڈین فوجیوں کو ہلاک اور درجنوں کو زخمی کر دیا، جس پر اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل یوتھانٹ (U. Thant) نے اسرائیلی وزیراعظم سے شدید احتجاج کیا لیکن اسرائیل اور بھارت نے اقوام متحدہ کی کب پروا کی ہے۔

جنگ کے پہلے روز مصری ائرفورس کی تباہی کے بعد اسرائیلی افواج ہر محاذ پر آگے بڑھتی چلی آ رہی تھیں لیکن قارئین ریڈیو صوت العرب یہ اعلان نشر کر رہا تھا کہ اسرائیلی حملہ آور جہاز بہت بڑی تعداد میں مار گرائے گئے ہیں اور مصری فضائیہ، اسرائیلی فوجی اڈوں، چھاؤنی اور حملہ آور افواج پر قہر خداوندی بن کر آگ برسا رہی ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسرائیلی ریڈیو بالکل معمول کے پروگرام نشر کر رہا تھا۔ اسرائیلی فضاؤں میں کوئی غیر ملکی طیارہ نظر نہیں آ رہا تھا اور شہری زندگی معمول کے مطابق جاری تھی۔ کوئی خطرے کے سائرن بھی نہیں بج رہے تھے۔

اسرائیلی فوج کی خبر دنیا بھر میں پھیل چکی تھی۔ بڑی طاقتوں نے باہمی طور پر طے کر لیا تھا کہ سلامتی کونسل کا اجلاس وقت تک نہیں بلایا جائے گا جب تک فریقین میں سے کوئی اس کی درخواست نہیں کرے گا۔ پھر جنگ بندی کی قرارداد اس وقت منظور نہیں کی جائے گی جب اسرائیل اپنے عربوں کے زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ نہیں کر لے گا اور قرارداد میں مفتوحہ علاقوں سے قابض فوجوں کی واپسی کا کوئی ذکر نہیں ہوگا۔

10:20 بجے صبح کی خبروں میں ریڈیو قاہرہ، "صوت العرب" نے اعلان کیا۔ "23 اسرائیلی حملہ آور طیارے مار گرائے گئے ہیں"۔

یہ خبر سنتے ہی قاہرہ کے لوگ نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں، گلیوں اور بازاروں میں نکل آئے۔ خطرے کے سائرن بج رہے تھے۔ اسرائیلی جہاز ابھی تک قاہرہ کے اہم فوجی ٹھکانوں پر بمباری کر رہے تھے لیکن لوگوں کو اب کسی خطرے کی پروا نہ تھی۔ ان کا ریڈیو انہیں دشمن پر فتح کی خوشخبریاں سنا رہا تھا۔ اتنے میں ایک اسرائیلی جہاز شہر کے اوپر اینٹی ائرگن کا شکار بن گیا۔ پائلٹ پیراشوٹ سے کود گیا۔ شہری فضا میں اسرائیلی جہاز کو جلتے ہوئے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گئے اور اپنے ریڈیو کی ہر خبر کو سچا سمجھنے لگے۔ ایک دوسرا اسرائیلی جہاز نہر سویز پر بم برساتے ہوئے اینٹی ائرگن کا نشانہ بنا لیکن اس کا پائلٹ اپنے کاک پٹ میں جل کر کوئلہ بن گیا۔

11:10 بجے محکمہ تعلقات عامہ کے انچارج کمال بکر نے غیر ملکی اخباری نمائندوں کو بتایا کہ اسرائیل کے مار گرائے جانے والے طیاروں کی تعداد 23 سے بڑھ کر اب 42 ہو گئی ہے۔

ائر مارشل صدقی محمود جو فیلڈ مارشل، آرمی چیف عبدالحکیم عامر کے ساتھ صحرائے سینائی کی میٹنگ سے لوٹا تھا اور جنہیں اپنا طیارہ کسی ملٹری ائربیس پر اتارنے کا موقع نہیں مل سکا تھا کیونکہ تمام ائربیس اور ان کی تنصیبات اور رن وے اسرائیلی بمباری سے تباہ و برباد ہو چکے تھے اور وہ اپنا جہاز قاہرہ کے سول انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اتارنے میں کامیاب ہو کر دوپہر 12 بجے اپنے اپنے ہیڈ

کوارٹر پہنچے تھے۔ اس وقت انہیں حقیقی صورت حال کا علم ہوا۔ صدقی نے اسی وقت صدر جمال عبدالناصر کو اپنی ائرفورس کی تباہی سے آگاہ کیا۔ ناصر بھی اب تک قاہرہ ریڈیو کی فتح کی ''خوشخبریوں'' پر ہی انحصار کئے ہوئے تھا۔ اس کا پہلا تاثر یہ تھا۔

''ہم جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ہار گئے ہیں''۔

ناصر کے بعد مصر کا صدر بننے والا انور السادات اس وقت پارلیمنٹ کا سپیکر تھا۔ وہ جب آرمی چیف فیلڈ مارشل عبدالحکیم عامر سے ملنے دوپہر کے وقت جی ایچ کیو (GHQ) پہنچا تو عامر انتہائی پریشانی کے عالم میں اپنے دفتر، جو زیر زمین تھا، کے درمیان کھڑا تھا۔ جب سادات نے اسے السلام علیکم کہا تو جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔ جب انور السادات نے دوبارہ السلام علیکم کہا تو بھی عامر نے جواب دینے میں کافی توقف کیا۔ دوسرے افسروں نے سادات کو بتایا کہ ''ائرفورس مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہے۔'' اتنے میں ایک کمرے سے صدر ناصر بھی باہر نکل آیا تو عامر نے امریکہ پر الزام دھر دیا کہ اس نے ہم پر حملہ کیا ہے۔ ناصر نے غصے سے کہا۔ ''میں کبھی اس بات پر اپنا بیان جاری نہیں کرسکتا، تاوقتیکہ تم میرے سامنے مار گرایا گیا کوئی ایسا طیارہ پیش نہ کردو جس پر امریکی ائرفورس کا نشان بنا ہو''۔ اور یہ کہتے ہوئے ناصر باہر نکل گیا۔

دوپہر تک مصر کے تمام بھاری اور ہلکے بمبار اور لڑاکا جہاز تباہ ہو چکے تھے اور صدر جمال عبدالناصر کو اپنے ذرائع سے 2 بجے تک اس کا علم ہو چکا تھا۔

صحرائے سینائی میں ابو آغیلہ (Abu Agheila) کا علاقہ اسرائیل کی سرحد سے 30 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع جو مرکزی صحرا سے گزرنے والی سڑکوں کا جنکشن تھا اور یہاں مصر کی مضبوط قلعہ بندیاں تھیں کیونکہ صحرا میں پٹرول، اسلحہ، خوراک اور پانی کی سپلائی یہاں سے گزرنے والی سڑکوں سے ہوتی تھی۔ 1956ء کی جنگ میں اسرائیل اس پر قبضے کی بہت کوشش کی تھی لیکن بھاری نقصان اٹھانے کے باوجود ناکام رہا تھا لیکن پھر جب مصری افواج اسے خالی کر کے نہر سویز کی طرف پسپا ہو گئی تھیں تو اسرائیلیوں نے یہاں قبضہ جما لیا تھا اور 1956ء کی جنگ بندی کے بعد جب اسرائیلیوں کو یہ علاقہ خالی کرنا پڑا تھا تو اس کی مضبوط قلعہ بندیوں کی تصویریں اور نقشے تیار کر کے ساتھ لے گئے تھے۔ اس کی مضبوطی کا راز اس پہاڑی سلسلے میں تھا جن کی بلندیوں پر مصری افواج نے مورچے بنا رکھے تھے۔ 1967ء میں یہاں 300 گز میں بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ تین متوازی مورچوں کی قطار میں سکینڈ انفینٹری ڈویژن کے 16 ہزار افسر و جوان تعینات تھے۔ مورچوں کی یہ قطار تین میل تک پھیلی ہوئی تھی اور ام کتیف (Um Katef) کے پہاڑی سلسلے میں 90 ٹینک، سیلف پروپیلڈ گنیں، بھاری آرٹلری کی چھ رجمنٹیں مورچہ بند تھیں۔

بریگیڈیئر جنرل ایریل شیرون، جس کے دماغ میں ہمیشہ ہی مسلمانوں خصوصاً عربوں اور فلسطینیوں کے خلاف جنگی جنون سوار رہتا ہے، اپنی ہائی کمان کے حکم کے باوجود کہ حملے کے لئے صبح تک انتظار کیا جائے تاکہ آگے بڑھنے میں فضائیہ کی مدد حاصل ہو جائے، اس نے رات کے 10 بجے، اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ابو آغیلہ پر حملے کا آغاز کر دیا۔ تمام رات اسرائیل کا بھاری توپخانہ ابو آغیلہ پر آگ برساتا رہا۔ اسرائیل کے دو بریگیڈ کی 2200 گنیں ام کتیف اور ابو آغیلہ پر آگ اگل رہی تھیں۔ صرف 20 منٹ میں 6000 گولے داغے گئے۔ مصری آرٹلری کو مصروف کرنے کے لئے ہیلی کاپٹر کے ذریعے مغرب کی طرف پیراٹروپر اتار دیئے گئے لیکن انہیں بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ تمام رات ٹینکوں کا معرکہ جاری رہا۔ مصری اس وقت بے بس نظر آنے لگے جب

مغرب کی جانب ''العارش'' کی طرف سے اسرائیلی میکنائزڈ انفینٹری نے حملہ کر دیا۔

''العارش'' پر اسرائیلیوں نے ٹینکوں کی مدد سے شام 5 بجے حملہ کیا تھا لیکن یہاں انہیں بارودی سرنگوں اور مصری اینٹی ٹینک گنوں سے بے پناہ نقصان اٹھانا پڑتا تھا لیکن انہوں نے اپنے جلتے ہوئے ٹینکوں، مرتے ہوئے جوانوں کے باوجود ایڈوانس جاری رکھا۔ یہاں گھمسان کی جنگ میں اسرائیلیوں کو بٹالین کمانڈر، تین کمپنی کمانڈروں اور اپنے آپریشن آفیسر کی قربانی دینی پڑی تھی۔ آخر شدید دست بدست لڑائی کے بعد اسرائیلی، مصریوں کو بے بس کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اب مغرب سے ایڈوانس کرتے ہوئے شیرون کی مدد کو پہنچ گئے جبکہ مصری دستوں کو کسی طرف سے کمک اور مدد نہیں پہنچ رہی تھی۔ صبح آٹھ بجے تک اسرائیلی ام کتیف اور ابو آغیلہ پر قابض ہو چکے تھے اور مصری افواج کے اگلے مضبوط مرکز جبل لبنی (Jebel Libni) پر یلغار کی تیاری کر رہے تھے۔

1967ء کی چھ روزہ جنگ کی الناک کہانی کافی طویل اور تکلیف دہ ہے۔ اسرائیل نے اس جنگ میں عربوں، خصوصاً مصر، شام اور اردن کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ مصر سے غزاء کی پٹی، صحرائے سینا، شرم الشیخ اور نہر سویز چھین لی۔ اس کی فضائیہ بالکل تباہ کر دی۔ اس جنگ میں مصر کے 10 ہزار جوان اور 1500 افسر مارے گئے۔ اتنے ہی صحرا میں بھٹکتے ہوئے زخموں، بھوک اور پیاس سے لقمہ اجل بنے۔ 80 فیصد اسلحہ و گولہ بارود یا تو تباہ ہو گیا یا دشمن کے ہتھے چڑھ گیا۔ 10 ہزار ٹرک، 400 فیلڈ گنیں، 50 سیلف پروپیلڈ گنیں 30، 155 ایم ایم گنیں اور 700 ٹینک تباہ و برباد ہو گئے یا دشمن کے قابو آ گئے۔

اردن مشرقی یروشلم، مسجد اقصیٰ اور اپنے زیر کنٹرول دریائے اردن کا مغربی کنارہ کھو بیٹھا۔ اگرچہ اردنی افواج نے قدم قدم پر یہودی افواج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اردن کی ننھی منی ائرفورس نے اسرائیلی فضائیہ کے کئی جہاز مار گرائے کیونکہ اردنی فضائیہ کے پائلٹوں کی اعلیٰ ٹریننگ برطانوی فضائیہ نے کر رکھی تھی اور اردنی افواج کی کمان خود شاہ حسین کے ہاتھ میں تھی، جو خود بھی بہترین پائلٹ تھے۔

مصر اور شام سلامتی کونسل کی جنگ بندی کی قرارداد 8 تاریخ کو ہی قبول کر چکے تھے لیکن شام پر حملہ جاری رہا اور اس وقت فائر بندی قبول نہیں کی جب گولان ہائٹ پر قابض نہیں ہو گیا۔ شام کی فضائیہ بھی اسرائیلیوں کے ہاتھوں تباہ ہو چکی تھی اور وہ دمشق کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ جو گولان ہائٹ سے صرف 40 میل دور تھا اور شامی فوجیں علاقہ خالی کر کے دمشق کی جانب پسپا ہو چکی تھیں کہ جنگ کے چھٹے روز روس کی طرف سے شام کی حمایت میں فوجی مداخلت کی دھمکی اور امریکی دباؤ کے تحت 10 جون کو شام 6:30 (اسرائیلی وقت) فائر بندی پر راضی ہونا پڑا۔ یو این او کی قرارداد میں اسرائیلی فوج کے زیر قبضہ علاقوں سے واپسی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ لہٰذا اسرائیل آج تک 1967ء میں فتح کئے ہوئے شام اور اردن اور غزاء پر قابض ہے اور امریکہ کی اسے مکمل حمایت اور پشت پناہی حاصل ہے۔

28 جون 1967ء کو اسرائیل نے اردن کے زیر کنٹرول مشرقی یروشلم کے 6 مربع کلومیٹر کے شہری علاقے کو بلکہ مغربی کنارے کے 65 مربع کلومیٹر رقبے کو، جو کبھی بھی یروشلم شہر کا حصہ نہیں رہا تھا، اسرائیل میں شامل کر لیا اور یروشلم کی شہری حدود کو مغربی کنارے تک توسیع دے دی۔ مقصد وہاں یہودیوں کی نئی بستیاں آباد کرنا تھا جو اب قائم ہو چکی ہیں اور فلسطینی وہاں کے اپنے جدی پشتی علاقوں سے بے دخل کئے جا چکے ہیں۔

O

کوارٹر پہنچے تھے۔ اس وقت انہیں حقیقی صورتِ حال کا علم ہوا۔ صدقی نے اسی وقت صدر جمال عبدالناصر کو اپنی ائرفورس کی تباہی سے آگاہ کیا۔ ناصر بھی اب تک قاہرہ ریڈیو کی فتح کی ''خوشخبریوں'' پر ہی انحصار کئے ہوئے تھا۔ اس کا پہلا تاثر یہ تھا۔

''ہم جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ہار گئے ہیں''۔

ناصر کے بعد مصر کا صدر بننے والا انور السادات اس وقت پارلیمنٹ کا سپیکر تھا۔ وہ جب آرمی چیف فیلڈ مارشل عبدالحکیم عامر سے ملنے دوپہر کے وقت جی ایچ کیو (GHQ) پہنچا تو عامر انتہائی پریشانی کے عالم میں اپنے دفتر، جو زیرزمین تھا، کے درمیان کھڑا تھا۔ جب سادات نے اسے السلام علیکم کہا تو جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔ جب انور السادات نے دوبارہ السلام علیکم کہا تو بھی عامر نے جواب دینے میں کافی توقف کیا۔ دوسرے افسروں نے سادات کو بتایا کہ ''ائرفورس مکمل طور پر تباہ ہو چکی ہے۔'' اتنے میں ایک کمرے سے صدر ناصر بھی باہر نکل آیا تو عامر نے امریکہ پر الزام دھر دیا کہ اس نے ہم پر حملہ کیا ہے۔ ناصر نے غصے سے کہا۔ ''میں کبھی اس بات پر اپنا بیان جاری نہیں کرسکتا، تاوقتیکہ تم میرے سامنے مار گرایا گیا کوئی ایسا طیارہ پیش نہ کردو جس پر امریکی ائرفورس کا نشان بنا ہو''۔ اور یہ کہتے ہوئے ناصر باہر نکل گیا۔

دوپہر تک مصر کے تمام بھاری اور ہلکے بمبار اور لڑاکا جہاز تباہ ہو چکے تھے اور صدر جمال عبدالناصر کو اپنے ذرائع سے 2 بجے تک اس کا علم ہو چکا تھا۔

صحرائے سینائی میں ابو آغیلہ (Abu Agheila) کا علاقہ اسرائیل کی سرحد سے 30 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع جو مرکزی صحرا سے گزرنے والی سڑکوں کا جنکشن تھا اور یہاں مصر کی مضبوط قلعہ بندیاں تھیں کیونکہ صحرا میں پٹرول، اسلحہ، خوراک اور پانی کی سپلائی یہاں سے گزرنے والی سڑکوں سے ہوتی تھی۔ 1956ء کی جنگ میں اسرائیل اس پر قبضے کی بہت کوشش کی تھی لیکن بھاری نقصان اٹھانے کے باوجود ناکام رہا تھا لیکن پھر جب مصری افواج اسے خالی کر کے نہر سویز کی طرف پسپا ہو گئی تھیں تو اسرائیلیوں نے یہاں قبضہ جما لیا تھا اور 1956ء کی جنگ بندی کے بعد جب اسرائیلیوں کو یہ علاقہ خالی کرنا پڑا تھا تو اس کی مضبوط قلعہ بندیوں کی تصویریں اور نقشے تیار کر کے ساتھ لے گئے تھے۔ اس کی مضبوطی کا راز اس پہاڑی سلسلے میں تھا جن کی بلندیوں پر مصری افواج نے مورچے بنا رکھے تھے۔ 1967ء میں یہاں 300 گز میں بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ تین متوازی مورچوں کی قطار میں سیکنڈ انفینٹری ڈویژن کے 16 ہزار افسر و جوان تعینات تھے۔ مورچوں کی یہ قطار تین میل تک پھیلی ہوئی تھی اور ام کتیف (Um Katef) کے پہاڑی سلسلے میں 90 ٹینک، سیلف پروپیلڈ گنیں، بھاری آرٹلری کی چھ رجمنٹیں مورچہ بند تھیں۔

بریگیڈیئر جنرل ایریل شیرون، جس کے دماغ میں ہمیشہ ہی مسلمانوں خصوصاً عربوں اور فلسطینیوں کے خلاف جنگی جنون سوار رہتا ہے، اپنی ہائی کمان کے حکم کے باوجود کہ حملے کے لئے صبح تک انتظار کیا جائے تاکہ آگے بڑھنے میں فضائیہ کی مدد حاصل ہو جائے، اس نے رات کے 10 بجے، اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ابو آغیلہ پر حملے کا آغاز کر دیا۔ تمام رات اسرائیل کا بھاری توپخانہ ابو آغیلہ پر آگ برساتا رہا۔ اسرائیل کے دو بریگیڈ کی 2200 گنیں ام کتیف اور ابو آغیلہ پر آگ اگل رہی تھیں۔ صرف 20 منٹ میں 6000 گولے داغے گئے۔ مصری آرٹلری کو مصروف کرنے کے لئے ہیلی کاپٹر کے ذریعے مغرب کی طرف پیراٹروپر اتار دیئے گئے لیکن انہیں بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ تمام رات ٹینکوں کا معرکہ جاری رہا۔ مصری اس وقت بے بس نظر آنے لگے جب

مغرب کی جانب ''العارش'' کی طرف سے اسرائیلی میکنائزڈ انفینٹری نے حملہ کر دیا۔

''العارش'' پر اسرائیلیوں نے ٹینکوں کی مدد سے شام 5 بجے حملہ کیا تھا لیکن یہاں انہیں بارودی سرنگوں اور مصری اینٹی ٹینک گنوں سے بے پناہ نقصان اٹھانا پڑتا تھا لیکن انہوں نے اپنے جلتے ہوئے ٹینکوں، مرتے ہوئے جوانوں کے باوجود ایڈوانس جاری رکھا۔ یہاں گھمسان کی جنگ میں اسرائیلیوں کو بٹالین کمانڈر، تین کمپنی کمانڈروں اور اپنے آپریشن آفیسر کی قربانی دینی پڑی تھی۔ آخر شدید دست بدست لڑائی کے بعد اسرائیلی، مصریوں کو بے بس کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اب مغرب سے ایڈوانس کرتے ہوئے شیرون کی مدد کو پہنچ گئے جبکہ مصری دستوں کو کسی طرف سے کمک اور مدد نہیں پہنچ رہی تھی۔ صبح آٹھ بجے تک اسرائیلی ام کتیف اور ابو آغیلہ پر قابض ہو چکے تھے اور مصری افواج کے اگلے مضبوط مرکز جبل لبنی (Jebel Libni) پر یلغار کی تیاری کر رہے تھے۔

1967ء کی چھ روزہ جنگ کی الم ناک کہانی کافی طویل اور تکلیف دہ ہے۔ اسرائیل نے اس جنگ میں عربوں، خصوصاً مصر، شام اور اردن کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ مصر سے غزاء کی پٹی، صحرائے سینا، شرم الشیخ اور نہر سویز چھین لی۔ اس کی فضائیہ بالکل تباہ کر دی۔ اس جنگ میں مصر کے 10 ہزار جوان اور 1500 افسر مارے گئے۔ اتنے ہی صحرا میں بھٹکتے ہوئے زخموں، بھوک اور پیاس سے لقمہ اجل بنے۔ 80 فیصد اسلحہ و گولہ بارود یا تو تباہ ہو گیا یا دشمن کے ہتھے چڑھ گیا۔ 10 ہزار ٹرک، 400 فیلڈ گنیں، 50 سیلف پروپیلڈ گنیں 30، 155 ایم ایم گنیں اور 700 ٹینک تباہ و برباد ہو گئے یا دشمن کے قابو آ گئے۔

اردن مشرقی یروشلم، مسجد اقصیٰ اور اپنے زیر کنٹرول دریائے اردن کا مغربی کنارہ کھو بیٹھا۔ اگرچہ اردنی افواج نے قدم قدم پر یہودی افواج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اردن کی ننھی منی ائرفورس نے اسرائیلی فضائیہ کے کئی جہاز مار گرائے کیونکہ اردنی فضائیہ کے پائلٹوں کی اعلیٰ ٹریننگ برطانوی فضائیہ نے کر رکھی تھی اور اردنی افواج کی کمان خود شاہ حسین کے ہاتھ میں تھی، جو خود بھی بہترین پائلٹ تھے۔

مصر اور شام سلامتی کونسل کی جنگ بندی کی قرارداد 8 تاریخ کو ہی قبول کر چکے تھے لیکن شام پر حملہ جاری رہا اور اس وقت فائر بندی قبول نہیں کی جب گولان ہائٹ پر قابض نہیں ہو گیا۔ شام کی فضائیہ بھی اسرائیلیوں کے ہاتھوں تباہ ہو چکی تھی اور وہ دمشق کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ جو گولان ہائٹ سے صرف 40 میل دور تھا اور شامی فوجیں علاقہ خالی کر کے دمشق کی جانب پسپا ہو چکی تھیں کہ جنگ کے چھٹے روز روس کی طرف سے شام کی حمایت میں فوجی مداخلت کی دھمکی اور امریکی دباؤ کے تحت 10 جون کو شام 6:30 (اسرائیلی وقت) فائر بندی پر راضی ہونا پڑا۔ یو این او کی قرارداد میں اسرائیلی فوج کے زیر قبضہ علاقوں سے واپسی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ لہٰذا اسرائیل آج تک 1967ء میں فتح کئے ہوئے شام اور اردن اور غزاء پر قابض ہے اور امریکہ کی اسے مکمل حمایت اور پشت پناہی حاصل ہے۔

28 جون 1967ء کو اسرائیل نے اردن کے زیر کنٹرول مشرقی یروشلم کے 6 مربع کلومیٹر کے شہری علاقے کو بلکہ مغربی کنارے کے 65 مربع کلومیٹر رقبے کو، جو کبھی بھی یروشلم شہر کا حصہ نہیں رہا تھا، اسرائیل میں شامل کر لیا اور یروشلم کی شہری حدود کو مغربی کنارے تک توسیع دے دی۔ مقصد وہاں یہودیوں کی نئی بستیاں آباد کرنا تھا جو اب قائم ہو چکی ہیں اور فلسطینی وہاں کے اپنے جدی پشتی علاقوں سے بے دخل کئے جا چکے ہیں۔

O

محبوب عالم، صابر حسین راجپوت اور میم الف کی شہرۂ آفاق کتب

کار، شلوار اور دوپٹہ -/
ایک پاکستانی ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر کی حیران کن سراغرسانی کی روئیداد (احمد یار خان)

بال ایک چڑیل کے -/
جرم اور سراغرسانی کی حیران کن روئیداد (احمد یار خان)

روح کے رشتے اور مقتول کی بدروح -/
جرم اور سراغرسانی کی دو طویل اور سچی کہانیاں (احمد یار خان)

جب مجھے اغوا کیا گیا -/
جرم اور سراغرسانی کی تین خونچکاں داستانیں (احمد یار خان)

ایک رات کی شادی -/
جرم اور سراغرسانی کی پانچ سچی کہانیاں (احمد یار خان)

لاش، لڑکی اور گف کے گنہگار -/
جرم وسزا اور سراغرسانی کی ایک انوکھی اور سچی کہانی (احمد یار خان)

دام میں صیاد آگیا -/
جرم وسزا اور سراغ رسانی کی سچی کہانیاں (احمد یار خان)

واردات اُس رات کی۔
جرم وسزا اور سراغرسانی کی ایک لرزہ خیز واردات (احمد یار خان)

قاضی کی کوٹھڑی اور کنواری بیٹی۔
جرم وسزا اور سراغرسانی کی بے مثال چار سچی کہانیاں (احمد یار خان)

جب بہن کی چوڑیاں ٹوٹیں۔
دشمنی کے کچھ جب انسان کے جذبات کو مسخ کر دیتے ہیں تو انسان حیوان بن جاتا ہے (احمد یار خان)

آشرم سے اُس بازار تک -/
تفتیش اور سراغرسانی کی پانچ حقیقی کہانیاں (احمد یار خان)

لائن پر لاش۔
جرم وسزا کی چار حقیقی، جذباتی اور سنسنی خیز کہانیاں (محبوب عالم)

رتن کمار کی روپا -/
جرم وسزا اور سراغرسانی کی حقیقی، جذباتی پانچ سنسنی خیز کہانیاں (احمد یار خان)

جائیداد کا وارث -/
جرم اور سراغرسانی کی دو طویل سچی تفتیشی کہانیاں (احمد یار خان)

بھیڑیا، بدروح اور بیوی -/
انسانوں اور کتوں کے شکار کی سچی اور سنسنی خیز کہانیاں (صابر حسین راجپوت)

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ -/
شکاریات کے موضوع پر آٹھ ہنگامہ خیز سچی کہانیاں (صابر حسین راجپوت)

قبر کا بھید -/
شکار کے موضوع پر سات ایسی کہانیاں جو آپ کے جذبات میں زلزلے پیدا کر دیں گی (صابر حسین راجپوت)

ایک لڑکی دو منگیتر -/
جذبات میں زلزلے برپا کر دینے والی شکار اور سماج کی ہنگامہ خیز نو سچی کہانیاں (صابر حسین راجپوت)

سانپ سادھو اور نوجے کی کہانی۔
معاشرت کی نو ہنگامہ خیز سچی کہانیاں (صابر حسین راجپوت)

مایوسی کیوں؟ -/
نفسیاتی، جسمانی اور روحانی توانائی ضائع نہیں ہوتی (میم الف)

مقناطیسی شخصیت (مکمل سیٹ) -/
نفسیاتی، جسمانی توانائی اور مقناطیسی قوت کا سرچشمہ (میم الف)

داستان ایک داماد کی -/
جرم وسزا کی پانچ سچی کہانیاں (احمد یار خان)

مقناطیسی شخصیت (مکمل سیٹ) -/
نفسیاتی، جسمانی توانائی اور مقناطیسی قوت کا سرچشمہ (میم الف)

لائن پر لاش -/
جرم وسزا کی چار حقیقی، جذباتی اور سنسنی خیز کہانیاں (محبوب عالم)

پیار کا پاپی -/
جرم وسزا اور سراغرسانی کی چار سچی کہانیاں (محبوب عالم)

چادر اور چوڑیاں -/
جرم اور سراغرسانی کی سچی اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ (محبوب عالم)

حوالات میں طلاق -/
جرم وسراغرسانی اور جذبات کو ہلا دینے والی دو طویل سچی کہانیاں (محبوب عالم)

بن بیاہی ماں -/
جرم وسراغرسانی کی سچی کہانیاں (محبوب عالم)

1857ء کی داستانِ خونچکاں
جنگ آزادی کی روئیداد، قتل وغارت اور محبت کی چند کہانیاں (محبوب عالم)

پیار کا پل صراط -/
جرم اور سراغ رسانی کی پانچ سچی اور سنسنی خیز کہانیاں (احمد یار خان)

جنات کے دربار میں۔
جرم اور سراغ رسانی کی چار سچی کہانیاں (احمد یار خان)

دلیر یا بیوقوف -/
جرم وسزا اور سراغرسانی کی سچی کہانیاں (احمد یار خان)

دوسری بیوی -/
جرم وسزا اور سراغرسانی کی چار سچی کہانیاں (احمد یار خان)

WWW.AIOURDUBOOKS.NET